شیریں لہجہ دلی کثافتوں کو باہمی احترام میں بدل دیتا ہے ۰۹

مارچ ۲۰۱۸ء

اُردو ڈائجسٹ

نامور آل راؤنڈر معین علی

پاکستانی نژاد جس نے گوروں کو اپنا گرویدہ بنالیا ۴۶

عدلیہ کی حمایت میں عوام سڑکوں پر! ۲۱

رومانیہ میں کرپٹ سیاست دانوں کے گرد گھیرا تنگ

ہم میں سے پاگل کون ہے؟ ۳۰

معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کی افسوسناک حقیقت

کیمیکل دودھ قاتل بن گیا ۵۷

گھر بیٹھے زہریلے دودھ کی شناخت کیجیے

غصہ پیاروں سے دور کردینے والا مرض ۱۱۳

سعودی عرب کے ہمسائے یمن کا دلچسپ سفرنامہ ۴۳

چھوٹے سے مالدیپ میں جاری بڑے کھیل کی کہانی ۱۶۷

www.urdugem.com

”آپ کی زکوٰۃ نے بدل دیا مقدر“

کاروان علم فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے کم وسیلہ، یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء وطالبات اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں
اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہو رہے ہیں

5,786 طلباء وطالبات کو -/139,683,855 روپے کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں

986
یتیم طلباء وطالبات کو پیشہ وارانہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مالی اعانت فراہم کی گئی۔

355
نابینا، پولیو زدہ اور حادثے کی وجہ سے معذور طلباء کو مالی اعانت فراہم کی گئی

سکالرشپ حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کی تعداد اور شعبہ جات

ایم بی بی ایس	1377	ایم اے	140	بی کام آنرز	161	ایل ایل بی	15	ایف ایس سی	529
بی ڈی ایس	52	ایم کام	41	بی ایس آنرز	777	بی اے آنرز	48	ایف اے	95
فزیوتھراپی	49	ایم بی اے	58	بی بی اے	64	بی اے	74	آئی کام	56
ڈی وی ایم	123	ایم پی اے	05	اے سی سی اے	19	سی ایس ایس	01	ڈی کام	05
ڈی فارمیسی	108	ایم فل	20	سی اے	04	بی ٹیک	24	آئی سی ایس	17
ایم ایس سی	144	بی ایس سی انجینئرنگ	1443	بی ایس ایڈ/بی ایڈ	42	ڈپلومہ ایسوسی ایٹ انجینئرنگ	164	میٹرک	131

زیرِ کفالت اور زیرِ غور طلباء کی مالی اعانت کے لئے 3 کروڑ روپے درکار ہیں

زکوٰۃ وعطیات دیجیے علم و ہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

کاروان علم فاؤنڈیشن

Meezan Bank
The Premier Islamic Bank

BOP
THE BANK OF PUNJAB

میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان — اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859
بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان — اکاؤنٹ نمبر 0110 002 000424 0003
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان — اکاؤنٹ نمبر 0247 002 000827 0003

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ
لاہور: مہدی رضا
0305-4133173
اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری
0321-5587250

معلومات و راہنمائی کے لئے رابطہ کیجیے

67- کشمیر بلاک حفیظ تائب روڈ نزد رحیم سٹور علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔
فون: 0321-8461122, 0345-8461122, 0333-8461122

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

تم فرماؤ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتا دوں پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ستھری بیبیاں اور اللہ کی خوشنودی اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔ (آلِ عمران: ۱۵)

ان کے لیے بسنے کے باغ ہیں ان کے نیچے ندیاں بہیں وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز کپڑے کریب اور قنادیز کے پہنیں گے وہاں تختوں پر تکیہ لگائے کیا ہی اچھا ثواب اور جنّت کیا ہی اچھی آرام کی جگہ۔ (الکھف: ۳۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان

حضرت ابوسعید وابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ پکارنے والا پکار کر کہے گا کہ (اے جنت والو) تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، تم زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے۔ تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے اور تم آرام سے رہو گے کبھی محنت ومشقت نہ اٹھاؤ گے۔

(مسلم، مشکوۃ)

حضرت بُریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی اور ان میں سے اسی (۸۰) صفیں اس امت کی ہوں گی اور چالیس صفیں دوسری امتوں کی۔ (ترمذی، دارمی، مشکوۃ)

www.urdugem.com

اُردو ڈائجسٹ
مارچ 2018ء
جمادی الثانی 1439ھ
جلد نمبر 58 شمارہ نمبر 03
urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سیّد عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ
ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
اشتہارات
advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
لاہور: ندیم حامد 0300-4242620
سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ
subscription@urdudigest.pk خریداری کے لیے رابطہ
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس
اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk
قیمت: 100 روپے
طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر حسن آباد لاہور سے شائع کیا

’’وہ صبح ہمیں سے آئے گی‘‘

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

کچھ حلقوں کے خیال میں ہمارا موجودہ نظام ڈول رہا ہے۔ یقیناً یہ صورتحال بہت سے لوگوں کے لیے تباہ کن ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بظاہر نظر آنے والی اس کشمکش اور تصادم میں عوام اور پاکستان کے لیے خوش خبریاں اور بہتر مستقبل کی نوید پوشیدہ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان نے ’’اصلاح‘‘ کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اب ہم دائرے کے اندر سفر کرنے کے بجائے احتساب اور اصلاح کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر طرف یہ احساس اُجاگر ہوا ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ بلاشبہ یہ سفر ان حلقوں اور لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہے جو موجودہ نظام میں برسوں سے فائدہ اُٹھا رہے تھے اور انھیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ سفر پاکستان کو اس کی صحیح منزل پر گامزن کرنے تک جاری رہنا چاہیے۔

۷۰ سال تک ہم شخصیات کو پوجتے رہے اور وہ عوام کو جھوٹے خواب بیچتے رہے۔ کسی فردِ واحد یا گروہ کی انا یا مفاد خاطر میں لائے بغیر فیصلہ سازوں کو لاکھوں لوگوں کی قربانیوں سے حاصل کیے گئے وطن کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے سخت فیصلے کرنا ہوں گے۔

ہم سب نے ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے لیکن پاکستان نے انشاءاللہ تاقیامت رہنا ہے۔ ملکی مفاد تمام شخصیات سے بلند ہے۔ عوام کو پہلی بار یہ احساس ہونے لگا کہ طاقتور افراد بھی قانون کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ چاہے ان کا تعلق بیوروکریسی سے ہو یا سیاست سے، فوج سے ہو یا کاروبار سے۔ عدلیہ سے وابستہ ارکان بھی جواب دہ ہیں۔

خوش آئند بات یہ بھی کہ اس سارے عمل کے پیچھے کسی بھی قوت کا مقصد اقتدار حاصل کرنا نہیں، جو ماضی میں اکثر ہوتا رہا۔

شاید ’’اصلاح‘‘ کے عمل میں وقتی طور پر حالات کو قابو میں رکھنے اور متاثرین کی طرف سے مزاحمت کے پیشِ نظر آئین میں رہتے ہوئے کچھ اقدامات کرنا ضروری ہوں جس سے بظاہر جمہوریت کے دعوے داروں کو مروڑ اُٹھیں لیکن ملکی مفاد میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

وہ وقت قریب ہے جب تمام شعبوں کے محبِ وطن ماہرین کو یکجا ہو کر عوام کی امنگوں اور ملک کے مفاد میں ۷۳ء کے آئین میں کی گئی تمام ترامیم کا ازِ سرِ نو جائزہ لے کر مستقبل کے لیے تجاویز بحث کے لیے قوم کے باشعور طبقوں کے سامنے رکھنا ہوں گی اور اس کے نتیجے میں ۷۳ء کے آئین و دستور میں ترامیم لا کر ملک کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنا ہوگا۔ ہماری اطلاعات کے مطابق اس پر بھی کام شروع ہو چکا۔

اس وقت پاکستان کو دنیا میں سفارتی سطح پر تنہائی، معیشت کی زبوں حالی، انسانی بنیادی حقوق کی عدم فراہمی اور معاشرتی و اخلاقی گراوٹ جیسے سنگین چیلنجز کا سامنا ہے۔ موجودہ سیاسی و آئینی نظام میں سکت ہی نہیں کہ ان کا سامنا کر سکے اور وطنِ عزیز سی پیک جیسے تاریخی موقع سے فائدہ اُٹھا سکے۔

تمام اداروں کو ارتقا (Evolution) کے عمل سے گزار کر ہی موجودہ چیلنجز کا سامنا کرنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ سیاسی و مذہبی جماعتوں کو حقائق کا ادراک کرنا بھی ضروری ہے۔ سیاسی جماعتوں کے ہاں غریب اور متوسط طبقے کے اہل اور دیانتدار افراد کو کلیدی عہدے دینے کی روایت کیوں موجود نہیں؟ کسی تنظیم میں جگہ بنانا اور انتخابات میں حصہ لینا کروڑوں روپے کا کاروبار کیوں بن چکا؟ دینی جماعتیں عوام کی اخلاقی تربیت اور نوجوانوں کے ابہام اور سوالات کے جواب دے کر ان کی تشفی کرنے کے بجائے کن مسائل میں اُلجھی ہوئی ہیں...؟

ساحر لدھیانوی کی یہ نظم موجودہ حالات پر بخوبی روشنی ڈالتی اور ہمیں نویدِ نو دیتی محسوس ہوتی ہے۔

مانا کہ ابھی تیرے میرے ارمانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
مٹی کا بھی ہے کچھ مول مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
انسانوں کی عزت جب جھوٹے سکّوں میں نہ تولی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
چاہت کو نہ کچلا جائے گا غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب یہ دنیا شرمائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی
منحوس سماجی ڈھانچوں میں جب ظلم نہ پالے جائیں گے
جب ہاتھ نہ کاٹے جائیں، جب سر نہ اُچھالے جائیں گے
جیلوں کے بِنا جب دنیا میں سرکار چلائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی
سنسار کے سارے محنت کش، کھیتوں سے ملوں سے نکلیں گے
بے گھر، بے در، بے بس انساں
تاریک بلوں سے نکلیں گے
دنیا امن اور خوشحالی کے پھولوں سے سجائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

www.urdugem.com

فہرست

کچھ اپنی زبان میں

لہجہ تو شائستہ ہونا چاہیے... دشنام طرازی اور گالم گلوچ سے مسائل حل نہیں ہوتے — الطاف حسن قریشی — ۰۹

ہم کہاں کھڑے ہیں

ریاست کی طرف بڑھتے ہوئے اختلاف... عدلیہ اور پارلیمان میں بڑھتی تشویشناک خلیج — الطاف حسن قریشی — ۱۱

عالم تمام

عدلیہ کی حمایت میں عوام سڑکوں پر... اہلِ پاکستان کو سبق دیتی داستان — ابوصارم — ۲۱

تبصرۂ کتاب

جنگ ستمبر کی یادیں... مدیر اعلیٰ اردو ڈائجسٹ کی یادگار تحریروں کا گلدستہ — سیّد عاصم محمود — ۲۴

نفسیات کی دنیا

فاؤنٹین ہاؤس کی کتھا... دنیا جنہیں ''دیوانہ'' کہتی ہے وہ ہم میں سے ہی ہیں — عافیہ مقبول جہانگیر — ۳۰

انسان اچھا ہے یا بُرا؟... سائنسی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ایک تجزیہ — ارم ناز — ۱۶۱

شخصیات

معین علی... پاکستانی نژاد برطانوی کرکٹر کی مثالی داستانِ حیات — سیّد عاصم محمود — ۴۶

اسلامی زندگی

حاکم کو بے عیب ہونا چاہیے... حکایاتِ سعدی سے سبق آموز واقعات — طالب ہاشمی — ۸۲

عالم تمام

عدلیہ کی حمایت میں عوام سڑکوں پر... اہلِ پاکستان کو سبق دیتی داستان — ابوصارم — ۶۴

افسانے/کہانیاں

کالی زبان... جزا یا سزا کے فیصلے کرنے والی ذات پاک صرف اللہ کی ہے — سارہ شیخ — ۶۵

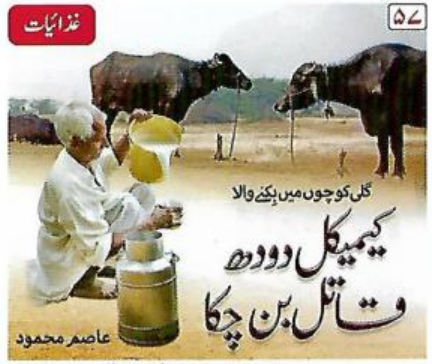

شیشے کی دیواریں... ایک بہو جب ساس بنی تو اُس کا ماضی اسے ڈرانے لگا — عشا پتافی — ۸۷

سیاہ و سفید... ایک استاد کے رویے نے جب ہیرے جیسا شاگرد کھو دیا — علی اکمل تصور — ۱۰۹

پردے کے پیچھے کی عورت... اردو ادبی نفسیات کی بوالعجبی دکھاتا دلچسپ ماجرا — شکیلہ رفیق — ۱۳۶

چاندی دلہن... معصوم بچیوں میں کیڑے نکالنے والی عورتوں کے لیے تازیانہ — ایس اے نقوی — ۱۴۵

گھر کا بھیدی... جب بھی اُسے قوتِ گویائی ملی تب نجانے کس کس کا پول کھلے گا — حمزہ کامران — ۱۶۴

مردم گزیدہ... ایک ایسے گھرانے کی کہانی جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی — زرقا فاطمہ — ۲۲۸

بے غرض رشتے... حقیقی رشتوں کی خاطر اپنا دل مار دینے والے نوجوان کی کہانی — افشاں کرن — ۱۷۰

بھولا ہوا سبق... بیٹے نے باپ کو اس کا فراموش کردہ فرض یاد دلا دیا — صداقت حسین ساجد — ۲۰۶

حالاتِ حاضرہ

مالدیپ میں گریٹ گیم... جیو پالیٹکس کے بطن سے جنم لینے والے ڈرامے کی رُوداد — ابوصارم — ۱۶۷

عالمی ادب

یہ ہے سبق سکھانے کا صحیح طریقہ... باپ سے ایک بار جھوٹ بول کر وہ تمام عمر پچھتایا — احمد فواد — ۷۱

اپنا کندھا اپنی لاش... ایک متوحش آدمی کی کہانی جو اپنا کفن دفن خریدے بیٹھا تھا — دلیپ سنگھ — ۹۵

تیسری چوری... انھیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا مگر وہ ہو گیا جو گماں بھی نہ تھا — شاکر لطیف — ۱۰۲

بازگشت... ایک بدصورت مرد کا دل چھو لینے والا قصہ، جسے محبت راس نہ آتی تھی — صادق ہدایت — ۱۵۰

جادوئی ٹوپی... قدم قدم پر حادثوں اور واقعات کو جنم دیتی دلچسپ تحریر — راجپوت اقبال احمد — ۱۷۷

آخری کامیابی... مجرموں تک پہنچنے کے لیے وہ دلیر مرد کچھ بھی کر سکتا تھا — فرزانہ ناز — ۱۹۸

شہر و ممالک

یمن، ملکہ سبا کا دیس... سرزمینِ عرب کے ملک یمن کے سفر کی دلچسپ رُوداد — عبدالعظیم سمیع — ۷۳

منتخب کالم

جو بادہ کش تھے پرانے... غیر معمولی کارنامے دکھلانے والی مرحوم شخصیات — الطاف حسن قریشی — ۹۹

www.urdugem.com

طنز و مزاح

اسپیشلسٹ زندہ باد۔۔۔ماہرینِ طب کا مریضوں کی خیر سگالی پر دلچسپ فکاہیہ — ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی — ۱۲۷

ہائے سویرا ہو گیا۔۔شوہر کا شوخی بھرا ماجرا جو بیگم کے طعنے جنت میں بھی یاد کرتا رہا — ابوالفرح ہمایوں — ۱۴۱

دلچسپ و عجیب

سات ڈگریاں رکھنے والا ۹۳ سالہ صدر۔۔زمبابوے کے سابق صدر موگابے کا عروج و زوال — ہاجرہ رضا — ۱۲۹

گیدڑ کالونی سے لالو کھیت تک۔۔۔شہرِ قائد کے عجیب و غریب نام والے علاقے — سلیم احمد — ۲۱۱

مُردے جلانے والی فیکٹریاں۔۔۔لاشیں جلانے کا بڑھتا رجحان کیا دن دکھائے گا — امجد محمود چشتی — ۲۳۹

لمحہ فکریہ

میری پہلی محبت۔۔۔کتاب کے ایک عاشق صادق کی سنہری یادیں — محمد فاروق عزمی — ۱۳۲

ملاوٹ کی بیماری۔۔۔یہ بدخصلت بیرونِ ملک بھی ہماری پہچان بن چکی — مفتی محمد کریم اختر — ۲۲۵

اُف یہ بے خبری۔۔۔علم و ادب سے دوری نئی نسل کو عملی طور پر بانجھ بنا رہی ہے — افتخار مجاز — ۱۷۳

آپ بیتی

خوابوں کا محل۔۔۔جو ایک نو آموز سرکاری افسر نے بنایا تھا مگر۔۔۔ — سعد فاروقی — ۱۳۹

اس سادگی پر۔۔۔بھولے پن کے وہ واقعات جو ضعیف الاعتقادی کہلاتے ہیں — حبیب اشرف صبوحی — ۱۸۹

تعمیر شخصیت

دماغی کارکردگی کم کرنے والی دس عادات۔۔۔زندگی کو مثالی بنانے والے تیر بہدف مشورے — مہوش طالب — ۱۴۷

کمپیوٹر سائنس

ڈاکٹر اسمارٹ فون۔۔۔تندرستی کی بیش بہا دولت عطا کرنے والے سافٹ وئیر — راؤ محمد شاہد اقبال — ۱۹۳

مستقل سلسلے

شاعری۔۔۔۱۸۵۔۔۔تبصرۂ کتب۔۔۔۲۱۴۔۔۔چمن خیال۔۔۔۲۱۸

خاکہ — ۹۲

مسلم ہندوستان کی تاریخ — ۱۱۸

لہجہ تو شائستہ ہونا چاہیے

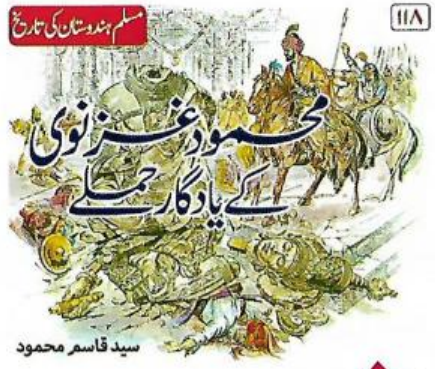

زندہ معاشروں میں طرح طرح کے اختلافات بھی ہوتے ہیں اور نوع بہ نوع تنازعات بھی سر اٹھاتے ہیں، مگر وہ پیہم رواں دواں زندگی میں بہت زیادہ خلل انداز نہیں ہوتے۔ قوم کے زیرک اور بااختیار افراد اور ادارے اختلافات اور تنازعات کا ہر وقت جائزہ لیتے اور حل تلاش کرتے رہتے ہیں جس کی بدولت تصادم اور خون خرابے کی نوبت نہیں آتی۔ تعلیم و تربیت کے ذریعے عوام کی ذہن سازی کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ اختلاف بھی شائستگی سے کرتے ہیں اور اسے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ سمجھدار حکمران تنقید پر آپے سے باہر ہونے کے بجائے اُسے اہمیت دیتے اور اختلاف کرنے والوں سے مذاکرات کرتے اور درمیانی راستہ نکالتے ہیں۔ احتجاج میں بھی ایک وقار اور ایک نظم پایا جاتا ہے جبکہ اہل دانش انتہائی سخت بات بھی ایک قرینے سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ آگے بڑھتا ہے، اس میں فکری لہریں اٹھتی رہتی ہیں، افکار تازہ کے پھول کھلتے اور وسعت قلبی کی خوشبو مہکتی رہتی ہے۔

ہمارا عزیز وطن جو مختلف اسباب سے انتہائی پیچیدہ مسائل میں گھرا ہوا ہے، ان میں نفسیاتی، سماجی اور معاشی دباؤ کے باعث ہماری طبیعتوں اور مزاجوں میں اعتدال اور بردباری کے بجائے اشتعال، انتقام اور تصادم کے اجزا طاقت ور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری تحریروں، تقریروں اور فیصلوں میں غصہ جھلکتا اور حریف کو نیچا دکھانے کی خواہش جوش مارتی رہتی ہے۔ سیاسی لیڈر ایک دوسرے پر جس بدتمیزی اور سفاکی سے حملہ آور ہوتے، جلسوں میں جس طرح گلا پھاڑتے ہیں، وہ بدترین اخلاقی گراوٹ کے بدترین

www.urdugem.com

مظاہرے کے زمرے میں آتا ہے۔ ٹی وی چینلز پر بھی سخت اور بے ہودہ جملوں کا تبادلہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں میں بات بات پر آپے سے باہر ہو جانے اور طیش میں آ کر اپنے مخالف کو قتل کرنے کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ بے احتیاطی کا یہ عالم ہے کہ عدالت عظمیٰ کے گزشتہ چھ ماہ کے دو فیصلے شدید دل آزاری کا باعث بنے ہیں۔ ان حالات میں دینی، سیاسی، سماجی اور علمی قائدین اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ شیریں اور ملائم لہجہ اختیار کریں اور نرم گفتاری کی ثقافت کو فروغ دیں۔ دشنام طرازی اور گالم گلوچ سے مسائل حل نہیں ہوتے، ان میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرہ تقسیم اور اخلاقی اور ذہنی طور پر کمزور ہوتا جاتا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر شیریں اور شائستہ لہجہ اختیار کرنے کا عہد کریں اور اپنے معاشرے میں قوت برداشت پیدا کریں۔ اس طرح ہیجان میں کمی واقع ہوگی اور باہمی اعتماد کے رشتے مستحکم ہوں گے۔

الطاف حسن قریشی

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔''

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھایئے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

''ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔'' (ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

ادارتی آفس 325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

ریاست کی طرف بڑھتے ہوئے خطرات

ہماری قومی قیادت کے مطالعے اور تحقیق سے ٹوٹتے ہوئے رشتوں
اور ہمارے اداروں کی باہمی آویزش کے باعث
ہمارا وطن گمبھیر مسائل میں جکڑا ہوا ہے

حالات سے عہدہ برآ ہونے کے آپشنز

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پاکستان کی نظریاتی اساس ریاست مدینہ کے اعلیٰ تصورات پر رکھی گئی جن میں حاکمیت اعلیٰ کا مالک رب ذوالجلال ہے اور اس کے بندے اس کے خلیفہ کی حیثیت سے اس کی طے شدہ حدود میں اقتدار و اختیار استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ ریاست مدینہ میں اخوت، مساوات اور انصاف کے تاریخ ساز مظاہرے دیکھنے میں آئے اور یہودیوں اور نصرانیوں کے بنیادی حقوق پوری طرح محفوظ تھے۔ متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کی غالب اکثریت جب مسلمانوں کا دینی اور تہذیبی تشخص مٹانے اور اُن کے سیاسی اور معاشی وجود ختم کرنے کے درپے ہوگئی، تو قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بے مثال قیادت میں اسلامیان ہند نے اپنے لیے ایک آزاد وطن کا مطالبہ کیا اور وہ فقط سات سال کی عہد ساز جدوجہد کے ذریعے پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بانیان پاکستان نے پہلی دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد منظور کی جو اسلام کے آفاقی تصورات اور جمہوریت کے جدید تجربات کا ایک حسین مرقع تھی۔ ۱۹۷۳ء کا متفقہ دستور اسی قرارداد کے مندرجات کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ جس میں انسانی حقوق، بنیادی انسانی آزادیوں، قانون کے سامنے برابری اور اختیارات کی تقسیم کی ضمانت فراہم کی گئی ہے۔ ریاستی اداروں کے اختیارات اور دائرہ کار کا واضح تعین کیا گیا ہے اور اس امر کا اہتمام ہوا

www.urdugem.com

ہے کہ ریاست شہریوں کے جان، مال اور آبرو کا تحفظ کرے گی اور انہیں زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کرے گی، تعلیم کو فروغ دے گی اور اقلیتوں کے جملہ حقوق کا پورا پورا خیال رکھے گی۔ بدقسمتی سے ملک میں وقفے وقفے سے مارشل لا نافذ ہوتے رہے جس کے باعث اداروں کے مابین توازن بگڑتا گیا۔

خوش قسمتی سے رواں عشرے میں پُرامن انتقال اقتدار کے دو تجربات کامیاب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ قومی اسمبلی نے ایک بار اپنی پانچ سالہ آئینی مدت پوری کی اور دوسری بار مدت پوری ہونے والی ہے، مگر اس بار کچھ ایسے واقعات ظہور پزیر ہوئے جن سے ریاست پاکستان کے لیے اندرونی اور بیرونی خطرات میں گوناگوں اضافہ ہوتا گیا۔ داخلی طور پر مسلم لیگ (ن) جس نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں وفاق اور پنجاب میں حکومت بنائی اور تحریک انصاف نے خیبر پختونخواہ میں اقتدار حاصل کیا، ان دونوں جماعتوں کے درمیان ایک ایسی کشمکش کا آغاز ہوا جس نے ریاست کو شدید مشکلات سے دوچار کردیا۔ تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خاں نوجوانوں میں اپنی مقبولیت کے پیش نظر یہ تعین کر بیٹھے تھے کہ وہ پاکستان کے وزیراعظم بنیں گے۔ جب انتخابی نتائج اُن کی خواہشات کے برعکس نکلے تو انہوں نے انتخابات میں منظم دھاندلی کا الزام لگایا اور چار ماہ سے زائد اسلام آباد کا گھیراؤ کیے رکھا۔ اس دوران پورا نظام مملکت درہم برہم رہا۔ دھرنے کے موقع پر تحریک انصاف کے مرکزی صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے انکشاف کیا کہ عمران خان نے مجھے بتایا ہے کہ ایمپائر کی انگلی اٹھنے والی ہے اور جونئے چیف جسٹس حلف اٹھانے والے ہیں، وہ نواز شریف کی حکومت ختم کر کے اقتدار ہمیں سونپ دیں گے۔ خوش قسمتی سے اس آزمائش کے وقت تمام سیاسی جماعتیں پارلیمان کی پشت پر کھڑی رہیں اور عمران خان اور علامہ طاہر القادری کا گھیراؤ ناکام ہوگیا تھا، لیکن ریاست کی رٹ بہت کمزور ہوچکی تھی۔ اس عرصے میں چند کور کمانڈر وزیراعظم نواز شریف پر دباؤ بڑھاتے اور ڈی جی آئی ایس آئی ان سے استعفا دینے کا مطالبہ کرتے رہے۔ اُن کی طرف سے آخری مطالبہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کا تھا۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ توسیع دینے کی صورت میں ڈان لیکس کا معاملہ بھی بہ حسن و خوبی طے پاجائے گا اور ہر نوع کے دھرنے بھی ختم ہوجائیں گے، لیکن وزیراعظم نے ان لیڈروں کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا تھا۔

باخبر حلقوں میں یہ خفیہ باتیں گردش کرتی رہیں اور عوام کے اندر یہ تاثر پھیلتا گیا کہ ریاستی ادارے سیاسی معاملات میں دراندازی کے رجحانات کے اسیر ہیں۔ واقعات اور شواہد بھی اس تاثر کی تصدیق کرتے جارہے تھے۔ ۲۰۱۶ء میں عمران خان نے سپریم کورٹ میں وزیراعظم نواز شریف کو پانامہ

اسکینڈل میں نااہل قرار دینے کے لیے رٹ دائر کی جو رجسٹرار نے نامعقول قرار دے کر مسترد کردی، لیکن جب عمران خان نے ۲ نومبر کو اسلام آباد کے لاک ڈاؤن کا اعلان کیا، تو فاضل چیف جسٹس جمالی نے مسترد شدہ رٹ پٹیشن سماعت کے لیے منظور کرلی۔ اس کے بعد عجیب وغریب واقعات رونما ہوئے اور عدالت عظمیٰ کے پانچ رکنی بینچ نے پانامہ کے بجائے اقامہ کی بنیاد پر وزیراعظم کو نااہل قرار دے دیا۔ اس فیصلے کو جناب ایس ایم ظفر، محترمہ عاصمہ جہانگیر (مرحومہ) اور جناب عابد حسن منٹو نے 'کمزور' فیصلے سے موسوم کیا جبکہ بین الاقوامی اخبارات نے اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد عمران خان بھی اسے 'کمزور فیصلہ' قرار دینے پر مجبور ہوگئے۔ وزیراعظم نواز شریف عدالتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے مستعفی ہوگئے، مگر اس کے ساتھ برملا اختلاف کیا اور اسے عوام کی عدالت میں لے گئے۔ وہ جہاں گئے لوگ کشاں کشاں اتنی بڑی تعداد میں آئے کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ سیاسی تجزیہ نگاروں کا اس نکتے پر بڑی حد تک اتفاق پایا جاتا ہے کہ جناب نواز شریف کا بیانیہ ذہنوں میں اُترتا اور دل میں بیٹھتا جارہا ہے۔

لودھراں میں ضمنی انتخاب نے یہ واضح پیغام دیا ہے کہ میاں نواز شریف کی عوامی حمایت میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ یہ حلقہ تحریک انصاف کی طاقت کا گڑھ سمجھا جاتا تھا جس میں ۲۰۱۵ء کے ضمنی انتخابات میں جہانگیر ترین کے مقابلے میں نون لیگ کے امیدوار نے چالیس ہزار سے کم ووٹ حاصل کیے تھے۔ نااہلی کے بعد جناب نواز شریف کی جماعت نے تین ضمنی انتخابات بھاری اکثریت سے جیتے ہیں اور سیا نے اسے عوامی 'اُبھار' سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

اس عوامی 'اُبھار' نے جناب نواز شریف اور اُن کی صاحبزادی مریم نواز کے لہجے میں جارحانہ پن پیدا کردیا ہے اور وہ عام جلسوں میں عدلیہ کے فیصلوں پر کڑی تنقید کررہے ہیں اور حاضرین پر زور دے رہے ہیں کہ وہ آنے والے انتخابات میں انہیں اتنی عظیم اکثریت سے ووٹ دیں جس کی طاقت سے فیصلے تبدیل کیے جاسکیں۔ جلسوں میں عوام برملا کہہ رہے ہیں کہ انہیں وزیراعظم کو نااہل قرار دینے کا عدالتی فیصلہ 'نامنظور' ہے۔ جناب نواز شریف کی نااہلی کے بعد اکتوبر ۲۰۱۷ء میں پارلیمان نے جو انتخابی قوانین منظور کیے اُن میں یہ گنجائش پیدا کی گئی کہ نااہل شخص بھی پارٹی کا صدر منتخب کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس گنجائش کی رو سے جناب نواز شریف مسلم لیگ کی صدارت کے منصب پر پہلے کی طرح فائز رہے، البتہ پارلیمانی پارٹی نے اُن کی جگہ جناب شاہد خاقان عباسی کو وزیراعظم چُن لیا جسے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل تھی۔ وزیراعظم شاہد خاقان عباسی امور مملکت حسن وخوبی سے چلا رہے ہیں، مگر وہ برسرعام

www.urdugem.com

اعلان کرتے ہیں کہ میرے لیڈر اور میرے وزیراعظم نواز شریف ہیں۔ وہ پارلیمان کو بھی وقت دیتے ہیں اور کابینہ کے اجلاس بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں اور کابینہ کی سکیورٹی کمیٹی میں بھی بڑے فعال ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ سینیٹ کے انتخابات بھی وقت پر ہو جائیں اور قومی اسمبلی اپنی آئینی مدت بھی پوری کرے۔ عمران خان صاحب نے قبل از وقت انتخابات کا غلغلہ بلند کیا تھا، لیکن لاہور میں علامہ طاہر القادری نے اپوزیشن جماعتوں کے اجتماع کا جو ڈرامہ رچایا تھا، اس کی ناکامی نے عمران خان کے غبارے میں سے ہوا نکال دی اور اس کے بعد وہ قبل از وقت انتخابات کے مطالبے سے عملاً دست بردار ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

عام تاثر یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کی طرف سے وزیراعظم نواز شریف کو نااہل قرار دینے کے فیصلے پر جو چاروں طرف سے لے دے ہوئی، تو فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار نے عوامی مفاد میں مختلف معاملات میں کثرت سے ازخود نوٹس لینا شروع کر دیا۔ انتظامیہ سے باز پُرس کی کہ شہریوں کو صاف پانی کیوں فراہم نہیں کیا جا رہا۔ اسی طرح ہسپتالوں میں جانا اور مریضوں کی ناگفتہ بہ صورت حال پر ذمے داروں کا احتساب شروع کر دیا۔ کھانے پینے کی اشیا کا معیار پرکھنے کا ایک میکانزم قائم کیا۔ بعض اہم مناصب پر فائز افراد کی تعلیمی قابلیت کا جائزہ لیا اور برطرفی کے احکام جاری کیے۔ مقدمات کی سماعت کے دوران سخت ریمارکس دیے۔ اعلیٰ افسروں کو عدالت میں اس طور طلب کیا کہ اُن کی تذلیل کا پہلو غالب آ گیا۔ بعض میڈیا اینکرز نے اس تاثر کو ہوا دی کہ جج صاحبان نے سیاسی قائدین کے بارے میں گاڈ فادر، سیسلین مافیا اور ڈاکو اور چور کے الفاظ استعمال کیے جن سے سیاسی حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ پے در پے ایسی ہدایات جاری کی گئیں جو انتظامی امور میں عدلیہ کی بے جا مداخلت کا تاثر دیتی تھیں۔ اس طرزِ عمل پر سابق وزیراعظم نواز شریف نے کھلے بندوں یہ بیانیہ اختیار کیا کہ عدالت عظمیٰ کی مسلسل مداخلت سے انتظامیہ اور وزیراعظم کا منصب یکسر مفلوج ہو گئے ہیں۔ وزیراعظم شاہد خاقان عباسی نے قومی اسمبلی میں دھواں دار تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ عدلیہ کی جارحانہ پالیسی کے باعث اب کوئی افسر کام کرنے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ اب وہ اسی میں اپنی سلامتی سمجھتا ہے کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ یہ بھی کہا کہ پارلیمان کو قانون سازی سے بھی روکا جا رہا ہے۔ یہ سوال اٹھایا کہ کیا قانون منظور کرنے سے پہلے ہمیں کسی دوسرے ادارے سے اجازت لینا پڑے گی؟ ان کی خواہش تھی کہ پارلیمان کو اپنے اور اپنے وزیراعظم کے تحفظ کی خاطر قرارداد کے علاوہ قانون سازی بھی کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں دو چار پُرجوش تقریریں بھی ہوئیں، قائد حزب اختلاف سید خورشید شاہ صاحب نے بھی اس شرط پر تعاون کا یقین دلایا کہ قانون سازی کسی فردِ واحد کے تحفظ کے لیے نہیں ہونی چاہیے مگر ۲۰ فروری کی دوپہر تک قومی اسمبلی کی فضا بڑی حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ کوئی قرارداد منظور ہوئی نہ کوئی بل پیش کیا گیا، البتہ یہ تاثر گہرا ہوا کہ ریاست کے دو اہم ادارے پارلیمان اور عدلیہ کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں جو ریاست کی خودمختاری پر کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔

اراکین پارلیمان کے تحفظ کا اہتمام آئین کے اندر موجود ہے۔ ایوان میں کی جانے والی تقریر کے خلاف عدالتی چارہ جوئی نہیں ہو سکتی اور کسی رکن اسمبلی کو اسپیکر یا چیئرمین کی اجازت کے بغیر گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح دستور نے اپنے شہریوں کو فوج اور عدلیہ کے خلاف نازیبا تنقید اور تنقیص کی اجازت نہیں دی ہے۔ دراصل ہر ادارہ اپنا احترام اپنے حسنِ عمل سے کراتا ہے۔ پارلیمان کی بے توقیری کے ذمے دار زیادہ تر سیاسی قائدین اور وزرائے کرام ہیں جو ریاست کے سب سے بالاتر ادارے کو نظرانداز اور بے توقیر کرتے رہے جو عوام کی حاکمیت کا سرچشمہ ہے۔ انہوں نے مباحث میں حصہ لیا نہ قانون سازی میں دلچسپی لی۔ کورم کی کمی کے باعث اجلاس بار بار ملتوی کیے جاتے رہے اور بیشتر اراکین اسمبلی اپنے وزیراعظم سے ملنے کو ترستے رہے۔ گزشتہ پونے پانچ برس میں کوئی ایسی قانون سازی نہیں ہوئی جس کا حوالہ دیا یا اس پر فخر کیا جا سکے۔ اکتوبر ۲۰۱۷ء میں جو انتخابی ایکٹ منظور ہوا اور پارلیمان کے امیدوار کے لیے جو انیس شرائط پہلے موجود تھیں وہ حذف کر دی گئیں۔ اس قانون میں نااہل شخص کے لیے بھی پارٹی کا صدر منتخب کیے جانے کی گنجائش پیدا کی گئی۔ سپریم کورٹ نے عدالتی جائزے کا آئینی اختیار استعمال کرتے ہوئے اس جملے کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ جس کی رو سے جناب نواز شریف اپنی جماعت کے صدارتی منصب پر نااہلی کے بعد بھی فائز چلے آ رہے تھے۔ فاضل بینچ نے صدر نواز شریف کے تمام فیصلے، احکامات اور ہدایات بھی کالعدم قرار دے دی ہیں جس سے غیر معمولی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوں گی اور اداروں کے درمیان تصادم اور محاذ آرائی کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ اس فیصلے نے آئین کی تشریح کے بارے میں بنیادی سوالات اُٹھا دیے ہیں اور بعض ناقدین کے اس تاثر کو گہرا کر دیا ہے کہ فاضل عدالت عظمیٰ نے شہریوں کے بنیادی حقوق کے منافی فیصلہ دیا ہے۔

☆☆☆

اس امر میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ ایک آزاد، غیر جانب دار اور مستحکم عدلیہ ایک مہذب اور جمہوری معاشرے کے لیے حد درجہ ناگزیر ہے۔ وہی عوام کو انصاف فراہم کرتی، بنیادی حقوق کے تحفظ

www.urdugem.com

کا احساس دلاتی اور افراد اور اداروں کے مابین تنازعات نمٹاتی ہے۔ عدالتیں ٹھیک طور پر کام کرتی رہیں تو سوسائٹی بدامنی، انتشار اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رہتی ہے۔ برطانیہ پر جب جرمنی کی طرف سے شدید بمباری شروع ہوئی تو وزیراعظم چرچل نے اپنے وزیروں سے پوچھا تھا کیا ہماری عدالتیں پوری طرح کام کر رہی ہیں۔ ہاں میں جواب ملنے پر انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا کہ پھر ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکے گا اور ہمارا معاشرہ شکست وریخت سے محفوظ رہے گا۔ اسی تناظر میں ہمیں اپنی عدلیہ کو بہت اونچا مقام دینا چاہیے۔ خدانخواستہ وہ کمزور پڑ گئی، تو ریاست کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور دشمن کے لیے ہم پر غلبہ حاصل کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عدلیہ اور پارلیمان کے درمیان جو ایک خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے، اس پر سنجیدہ حلقوں میں شدید تشویش پائی جاتی ہے۔ فاضل چیف جسٹس نے بہت درست ریمارکس دیے ہیں کہ آئین سپریم ہے اور تمام ادارے اسی کے تحت کام کرتے ہیں۔ دستور نے عدلیہ کو انتظامیہ کے عمل اور بنیادی حقوق دیکھتے رہنے کا اختیار دیا ہے۔ ہم دیانت داری سے اپنے اختیار کا بھرپور استعمال کریں گے۔ ان ریمارکس میں جناب وزیراعظم کی اس تقریر کا جواب مضمر تھا جس میں کہا گیا تھا کہ پارلیمان سپریم ہے اور اسے آئین اور قانون سازی کا اختیار حاصل ہے۔

وہ قومی حلقے جو عدلیہ کو زیادہ سے زیادہ آزاد، غیر جانب دار اور مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں، یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ جوڈیشل ایکٹیوازم نے مسائل بھی پیدا کیے ہیں اور عدلیہ کی ساکھ بھی متاثر کی ہے۔ ہمارے فاضل جج صاحبان کو اس امر کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ عدلیہ کی تاریخ میں سیاہ ابواب بھی شامل ہیں۔ ماضی میں پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والے فیصلے بھی عدالتوں سے صادر ہوئے ہیں۔ میں اس عمومی رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ فوجی بغاوت کے وقت عدلیہ کو اپنے حلف کا پاس کرتے ہوئے آمر کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے تھا۔ ہم نے دیکھا کہ جب جمہوریت پر شبخون مارا گیا، تو سیاسی جماعتیں بھی سرنگوں ہو گئیں اور سول سوسائٹی نے بھی کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں کی۔ ایسے میں جج صاحبان سے یہ توقع کرنا کہ وہ مجاہدانہ کردار ادا کرتے، کسی حد تک بے انصافی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی جائزہ لینا ہوگا کہ جن بے باک اور باہمت جج صاحبان نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کیا، اُن کے ساتھ قوم نے کیا سلوک روا رکھا۔ جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالا اور ایک سال بعد پی سی او جاری کیا، تو پاکستان کے عظیم المرتبت چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اُن کا ساتھ دینے والے دو درجن سے زائد جج صاحبان بھی تھے، مگر سول

سوسائٹی انہیں "سپر ہیرو" کا درجہ دینے کے لیے سرگرم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عدالتی سطح پر مزاحمت کی شاندار اور درخشندہ روایت صحیح رُخ پر فروغ نہیں پا سکی۔

بلاشبہ چیف جسٹس افتخار چودھری کے ایشو پر تحریک مزاحمت اُٹھی اور پورے عدالتی عمل کو ایک نئی جہت دے گئی۔ اس کے برعکس چیف جسٹس محمد منیر نے ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۸ء میں جو فیصلے دیے، اُن میں اقتدار سے ملی بھگت اور اس کے آگے سرنگوں ہونے کا گہرا تاثر قائم ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ ڈالی۔ اس اقدام کے خلاف اسپیکر دستور ساز اسمبلی مولوی تمیز الدین خان برقع پہن کر چیف کورٹ سندھ گئے۔ جس کے پانچ رکنی بینچ نے گورنر جنرل کے حکم کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے دستور ساز اسمبلی بحال کر دی۔ اس فیصلے کے خلاف پاکستان فیڈرل کورٹ میں اپیل کی گئی جس کے سربراہ چیف جسٹس محمد منیر تھے۔ انہوں نے ٹیکنیکل گراؤنڈ پر گورنر جنرل کے اقدام کو درست قرار دیا جس کے بعد سول اور ملٹری بیوروکریسی جمہوریت کی جڑیں کاٹتی رہی۔ چیف جسٹس صاحب نے جس ٹیکنیکل گراؤنڈ پر سندھ چیف کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دیا تھا، وہ یہ تھا کہ جس آئینی ترمیم کے تحت اعلیٰ عدالتوں کو رٹ جاری کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، اس پر گورنر جنرل کے دستخط نہیں تھے، اس لیے اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے یہ قرار دیا تھا کہ چونکہ دستور ساز اسمبلی ایک خودمختار ادارہ ہے، اس لیے منظور شدہ آئینی اور قانونی بل پر اس کے اسپیکر کے دستخط کافی ہوں گے اور ایکٹ کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ چیف جسٹس محمد منیر اس تباہ کن فیصلے کے سائے ہماری عدالتی تاریخ پر گاہے گاہے لہراتے رہے ہیں۔ وزیراعظم نواز شریف کو بھی ٹیکنیکل گراؤنڈ پر نااہل کیا گیا ہے، اس لیے عوام کے اندر اس کے خلاف شدید مزاحمت پرورش پا رہی ہے جو پاکستان کے طول وعرض میں پھیلتی جا رہی ہے۔

ان حالات میں عدالت عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان کو بڑی احتیاط سے صورت حال سے عہدہ برآ ہونا ہوگا۔ عوام کے اندر یہ احساس جاگزیں ہوتا جا رہا ہے کہ مختلف ادارے ان کے ووٹ کے تقدس کو اہمیت نہیں دے رہے اور اُن کے منتخب شدہ وزیراعظم کو ذلیل وخوار کرتے رہتے ہیں۔ اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے فاضل عدالت کی طرف سے ایسے اقدامات کیے جانے چاہییں جن سے عوام کے اندر اپنی عدلیہ کے لیے حقیقی احترام پیدا ہو۔ پہلا قدم یہ اٹھایا جانا چاہیے کہ سیاسی قائدین کے خلاف نازیبا الفاظ کا استعمال بند کیا جائے۔ وزیراعظم نواز شریف کے خلاف جب عدالت عظمیٰ میں پانامہ مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی، تو میڈیا میں فاضل جج صاحبان کی طرف یہ منسوب کیا جاتا رہا کہ انھوں

www.urdugem.com

نے سیاست دانوں کے لیے گاڈ فادر، سیسلین مافیا کے الفاظ استعمال کیے۔ ان القابات پر کالم بھی لکھے گئے۔ ایک سال ہونے کو آیا ہے کہ عدلیہ اور سیاستدانوں کے مابین بدگمانیاں پھیلتی رہیں۔ اب فروری کے آخر میں عدالت عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان کی طرف سے یہ وضاحت آئی ہے کہ ہم نے سیاستدانوں کے لیے یہ بُرے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار نے بھی غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ ہم تمام سیاسی قائدین کا احترام کرتے ہیں۔ یہ بیانات کشیدگی کی فضا تحلیل کرنے میں یقیناً مددگار ثابت ہوں گے دوسرا اقدام یہ ہوسکتا ہے کہ ازخود نوٹس کا دائرہ محدود کر دیا جائے۔ ازخود نوٹس کے مقدمات میں چونکہ اپیل کا حق دستیاب نہیں، اس لیے اسلامی تعلیمات کی رو سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ جناب عطاء الحق قاسمی اور جناب صدیق الفاروق کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ دونوں حضرات اپنی تعلیمی قابلیت، اچھی کارکردگی اور بیش بہا تجربات کی بدولت ایک معروف حیثیت کے مالک ہیں۔ جناب صدیق الفاروق نے دن رات ایک کر کے متروکہ املاک ٹرسٹ کو ٹھگوں سے نجات دلائی اور غیر مسلم یاتریوں کے ساتھ ثقافتی رشتے مضبوط کیے جس سے پاکستان کا امیج بیرونی دنیا میں بہت بہتر ہوا، مگر عدلیہ نے اُن کے خلاف تکلیف دہ اقدامات کیے ہیں۔ ہر معاملے میں ازخود نوٹس لینے اور فوری احکام صادر کرنے کا ایک ناخوشگوار نتیجہ راؤ انوار کے حوالے سے برآمد ہوا ہے کہ فاضل چیف جسٹس کی ہدایات کے باوجود اسے گرفتار نہیں کیا جا سکا اور نہ وہ عدالتی تحفظ مل جانے کے باوجود عدالت میں پیش ہوا۔ فاضل عدالت عظمیٰ کو پارلیمان کے ساتھ الجھنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کہ اس سے اداروں کے درمیان تصادم کی فضا ابھرتی ہے جو ریاست کے استحکام پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ رویوں میں کشادگی اور وضعداری ریاست کے استحکام کے لیے ازبس ضروری ہے۔ فاضل چیف جسٹس نے سینیٹ کے اکابرین سے تبادلہ خیال کی جو روایت قائم کی ہے، اسے آگے بڑھانا اور مشاورت سے قومی اور ملکی معاملات کو بہتر بنانا چاہیے۔ فوجی کمان کی تبدیلی کے بعد سول ملٹری تعلقات میں بہتری آئی ہے۔ جنرل قمر جاوید باجوہ ایک عملیت پسند اور بیدار مغز سپہ سالار ہیں۔ وہ کھلے ظرف کے آدمی ہیں اور سویلین بالادستی پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ پڑوسی ممالک سے تعلقات کو فروغ دینے کے لیے حکومت کے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہے ہیں حالانکہ ہمارا ملک بُری طرح دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارا دفتر خارجہ تخلیقی صلاحیتوں اور دوراندیشی کے جواہر سے محروم ہوتا جا رہا ہے، جبکہ ہمارے سیاستدان اپنا قیمتی وقت ایک دوسرے کی گردن ناپنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اس کے باعث غیر یقینی اور تصادم کی فضا پروان چڑھ رہی ہے، حالانکہ امکان کا ایک

جہاں ہمارا منتظر ہے۔

☆☆☆

بیرونی خطرات جس انداز سے منڈلا رہے ہیں، وہ ہمیں فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں اور عالمی تناظر میں دانش مندی سے ان کے سدباب کی منصوبہ بندی کی جائے۔ پیرس میں امریکا پچھلے دنوں پاکستان کو واچ لسٹ میں شامل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا اور کسی نہ کسی صورت یہ تلوار لٹکتی رہے گی۔ حافظ سعید کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے 'را' اور 'موساد' نے ۲۰۰۸ء میں جو کوششیں کیں، ان کے بارے میں حیرت انگیز واقعات پر مشتمل کتاب حال ہی میں منظرعام پر آئی ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی طاقتیں اپنے اسٹریٹیجک مفادات کو آگے بڑھانے میں کس قدر سفاک واقع ہوئی ہیں اور کتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ کتاب الیاس ڈیوڈسن (EliasDavidsson) نے لکھی ہے اور اس کا نام The Betrayal of India ہے۔ مصنف نے ٹھوس حقائق اور شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء کا ممبئی حملہ دراصل ایک بہت بڑا ڈرامہ تھا جسے امریکا اور برطانیہ نے بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' اور اسرائیلی خفیہ ایجنسی 'موساد' نے رچایا تھا۔ کتاب واقعات کی ترتیب اور بھارتی اور عالمی راہنماؤں کے بدلتے ردعمل اور موقف سے شروع ہوتی ہے۔ آغاز بھارتی پولیس کے اس اعلان سے ہوتا ہے کہ ہم نے نو دہشت گرد زندہ پکڑ لیے ہیں اور اختتام اس بات پر ہوا ہے کہ ان میں سے ایک پاکستانی لڑکے کے سوا اور کوئی زندہ نہیں بچا۔ اس کے بعد بھارت کے ذمے دار عہدے داروں کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس حملے کی پشت پر حافظ سعید کا گروہ ہے۔ فوری طور پر ہنری کنجر بیان دیتا ہے کہ ممبئی حملے میں پاکستان ملوث ہے۔ حیرت کی بات یہ کہ حملے سے تین دن قبل ہنری کنجر اسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ کتاب میں ممبئی دہشت گردی کے مقدمے کی روداد تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جو انتہائی بے ربط ہے اور تمام تر شہادتیں اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ پورے واقعے کا کوئی سرا نہیں ملتا۔ ہوٹل تاج محل کے کیفے میں موجود سو کے قریب گواہوں نے کسی کو قتل ہوتے نہیں دیکھا۔ مصنف نے ان تمام جملہ ممالک کے ان مفادات کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اس حملے کے بعد بھارت سے اُٹھائے ہیں۔

امریکی وزیر خارجہ کونڈالیزا رائس نے ۵ دسمبر کو بیان دیا کہ اس حملے کی منصوبہ بندی پاکستان میں ہوئی ہے۔ افغانستان کے تناظر میں پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے سلسلے میں امریکا کے ہاتھ میں ایک مؤثر ہتھیار آ گیا جو بڑی ہنرمندی سے استعمال ہوتا رہا۔ ایران افغانستان میں اپنا کردار چاہتا تھا جو اسے بھارت کے ذریعے حاصل ہو گیا کہ وہ امریکی پابندیوں کے باوجود ایران سے تیل خریدتا رہا تھا۔ اس

www.urdugem.com

حملے کے بعد بھارت کی سکیورٹی خطے کی سکیورٹی قرار دے دی گئی اور اسے افغانستان میں ایران کے راستے قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج چاہ بہار پر بھارت کی اجارہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی اخبارات نے اس حملے کا ذمے دار پاکستان کو ٹھہرایا تھا۔ روس کی فیڈرل نارکوٹکس سروس نے ۱۸ دسمبر کو بیان دیا کہ ممبئی حملوں میں داؤد ابراہیم ملوث ہے۔ اوباما انتظامیہ نے اس حملے کے بعد بھارت، روس اور ایران سے معاہدہ کیا کہ وہ افغانستان میں اتحادی فوج کی مدد کریں گے۔ اس حملے میں آسٹریلیا کے بھی چند باشندے ہلاک ہوئے تھے۔ آسٹریلوی وزیر تجارت سائمن کرین (Simon Crean) نے پارلیمنٹ میں کہا کہ بھارت اور آسٹریلیا دہشت گردوں کی جنگ میں ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کے بعد بھارت اور آسٹریلیا کے مابین کاروباری اور فوجی معاہدوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ستمبر ۲۰۱۳ء میں نریندر مودی نے آسٹریلیا کے وزیراعظم کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت آسٹریلیا بھارت کو یورینیم فراہم کرے گا۔ اس کتاب کے حقائق عالمی رائے عامہ کو تبدیل کر سکتے ہیں اس لیے پاکستان کو اس کتاب اور اس کے مصنف کو بڑے پیمانے پر متعارف کروانے کا منصوبہ تشکیل دینا چاہیے۔ اسی طرح ہمارے لیے یہ خبر بھی حد درجہ تشویش ناک ہے کہ ۱۲ فروری ۲۰۱۸ء کو بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے سلطنت عمان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں جس کے تحت بھارتی افواج کو تیزی سے تکمیل پانے والی بندرگاہ دقم تک رسائی مل گئی ہے اور اسے فوری طور پر استعمال کرنے کی سہولت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ نریندر مودی نے عمان کے دورے کے دوران آٹھ معاہدوں پر دستخط کیے ہیں جن سے عمان میں بھارت کا اثر و نفوذ بہت بڑھ جائے گا۔ بدقسمتی سے گوادر کے دونوں جانب کی بندرگاہیں بھارت کے زیر اثر چلی گئی ہیں۔ عمان کی بندرگاہ دقم جو علاقے کی بہت بڑی بندرگاہ بننے والی ہے، اس کے بارے میں گزشتہ سال پائنا کے تحت منعقد ہونے والے سیمینار میں جناب جاوید نواز نے تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا اور حکومت سے استدعا کی تھی کہ اس بندرگاہ کا نظم و نسق چلانے کے لیے سلطنت عمان سے مذاکرات کیے جائیں۔ اس مذاکرے میں وزیر منصوبہ بندی جناب احسن اقبال مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا دفتر خارجہ تخلیقی ذہن اور دور اندیشی کی مہارت سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے حکمران اور سیاست دان قوم کے عظیم مفادات سے غافل ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں ریاست پاکستان کو بیرونی دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لیے سفارتی سرگرمیوں کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور قومی اداروں کے مابین ہم آہنگی کو فروغ دینا ہوگا۔ ◆◆◆

عالم تمام

ابو صارم

قانون کی حکمرانی اور
عدلیہ کی حمایت میں عوام سڑکوں پر!

رومانیہ میں کرپٹ سیاست داں جب کرپشن سے نبرد آزما قوتوں پر حملہ آور ہوئے تو عام لوگ اُن کے خلاف زبردست احتجاج کرنے لگے...

اہل پاکستان کو سبق دیتی داستان

مشہور ہے کہ ایک یورپی ملک کی عدالت میں ایک مفلوک الحال ملزم پیش ہوا۔ ملزم پر الزام تھا کہ اس نے ایک ہوٹل سے دو روٹیاں چُرائی ہیں۔ جج نے اس سے پوچھا کہ روٹیاں چُرانے کا مقصد کیا تھا؟ بوڑھے ملزم نے بتایا کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ جب بھوک ناقابل برداشت ہو گئی، تو اُسے روٹیاں چُرانی پڑیں۔

جج نے ملزم پر ۱۰ ڈالر جرمانہ کر دیا۔ پھر کہنے لگا ''مجھے علم ہے کہ تم یہ جرمانہ نہیں دے سکتے، اس لیے میں اپنی جیب سے ادا کرتا ہوں۔'' یہ کہہ جج نے جیب سے دس ڈالر نکالے اور اپنے معاون کو یہ کہہ کر دیے کہ سرکاری خزانے میں جمع کروا دو۔

اب مقدمے کا ڈرامائی موڑ آیا۔ جج کہنے لگا: ''اس عدالت میں جتنے بھی حاضرین موجود ہیں، میں ان پر بھی دس

www.urdugem.com

دس ڈالر جرمانہ کرتا ہوں۔ وجہ یہ کہ اصل مجرم یہ معاشرہ ہے جو ایک بھوکے کو دو روٹیاں نہیں دے سکا اور وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گیا۔" حاضرین کی جانب سے چار سو ڈالر بطور جرمانہ جمع ہوئے جو جج نے مفلس بوڑھے کو دے دیے۔ بوڑھا بہت شکر گزار ہوا اور اُسے دعائیں دینے لگا۔

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ عدلیہ میں کتنی ہی خامیاں ہوں، جج بہر حال ہر مقدمے میں انصاف کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف ہی ایک خوشحال اور ترقی یافتہ معاشرہ تشکیل پانے کی ضمانت ہے۔

مغربی ممالک کی ترقی کا ایک اہم راز یہ بھی ہے کہ وہاں ایسے معاشرے تشکیل پا گئے جہاں قانون کی حکمرانی ہے اور عام آدمی کو باآسانی انصاف مل جاتا ہے۔ اسی لیے جب کسی مغربی ملک میں عدلیہ کی آزادی خطرے میں پڑے، تو وہاں عوام پُرزور طریقے سے احتجاج کرنے لگتی ہے۔ آج کل اسی قسم کی صورت حال رومانیہ میں درپیش ہے۔

جنوب مشرقی یورپ میں واقع مملکت رومانیہ میں دو کروڑ افراد بستے ہیں۔ یہ علاقہ قرون وسطی میں عثمانی سلطنت کا حصہ رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی، تو جدید رومانیہ وجود میں آیا۔ تاہم جاگیرداروں اور امرا پر مشتمل اشرافیہ نے ملکی وسائل پر قبضہ کر لیا اور ان سے مستفید ہونے لگے۔ عوام کی حالت زیادہ نہ بدل سکی۔

ماضی میں کمیونسٹ حکومت کرتے رہے۔ ۱۹۸۹ء میں عوامی انقلاب آیا جو آمر، چاؤشسکو کو نیست و نابود کر گیا۔ تب سے رومانیہ میں جمہوریت رائج ہے۔ مگر پاکستان کی طرح رومانیہ میں بھی امرا اور اثر و رسوخ والوں نے سیاسی جماعتوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ طاقتور سیاست داں کھل کر کرپشن کرتے اور متوسط و نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں کو میدان سیاست میں داخل نہیں ہونے دیتے۔

سوشل ڈیموکریٹک پارٹی رومانیہ کی مشہور سیاسی جماعت ہے۔ یہ "سوشل ڈیموکریسی" پر یقین رکھتی ہے مگر اس کی تقریباً ساری قیادت ارب پتی اور کروڑ پتی سیاست دانوں پر مشتمل ہے۔ یہ سیاست داں حکومت سنبھال کر مختلف طریقوں سے کرپشن کرتے اور اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ یہی پارٹی جدید رومانیہ کے بیشتر ادوار میں حکومت کرتی رہی ہے۔

۲۰۰۸ء میں ایک عوامی انقلاب آیا جب نو وارد سیاسی جماعت، ڈیموکریٹک بدل پارٹی الیکشن جیتنے میں کامیاب رہی۔ اس جماعت نے برسر اقتدار آ کر کرپشن کی روک تھام کے لیے ایک سرکاری ادارہ بنا دیا اور اُسے کافی طاقتیں بھی دیں تاکہ وہ کرپٹ شہریوں کو پکڑ سکے۔ مزید برآں عدلیہ کو بھی مضبوط بنایا کہ وہ بااثر مگر کرپٹ سیاست دانوں کو کڑی سزائیں دینے لگے۔

سرکاری ادارے، اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ نے کرپٹ سیاست دانوں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ اس حملے نے طبقہ اشرافیہ میں کھلبلی مچا دی۔ اُسے ملک پر اپنا اثر کمزور ہوتا محسوس ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر امرا نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے اور اپنے حلقے میں وسیع پیمانے پر عوامی فلاح و بہبود کے کام کروانے لگے۔ یہ دراصل ووٹروں کو اپنے دام میں پھنسانے کا حربہ تھا۔ پاکستان کی طرح رومانیہ میں بھی عوام کی اکثریت معصوم ہے۔ چنانچہ رومانوی عوام شاطر سیاست دانوں کے بچھائے جال میں پھنس گئے۔ آٹھ سال بعد الیکشن ۲۰۱۶ء میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے پارلیمنٹ کی زیادہ تر نشستیں جیت لیں۔ وہ پھر ہم خیال سیاسی جماعت کے ساتھ حکومت بنانے میں کامیاب رہی۔ مگر آٹھ سال

کے عرصے میں اینٹی کرپشن ادارے اور عدلیہ نے بھی قوت پکڑ لی تھی۔ وہ اب رومانیہ کو کرپشن سے نجات دلانے کا تہیہ کر چکے تھے تاکہ ملک ترقی و خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

الیکشن کے فوراً بعد اینٹی کرپشن ادارے نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور یو یوڈرگنیا اور اس کی بیگم پر مقدمہ قائم کر دیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے ماضی میں سرکاری منصوبے من پسند کمپنیوں کو دیتے ہوئے رشوت لی تھی۔

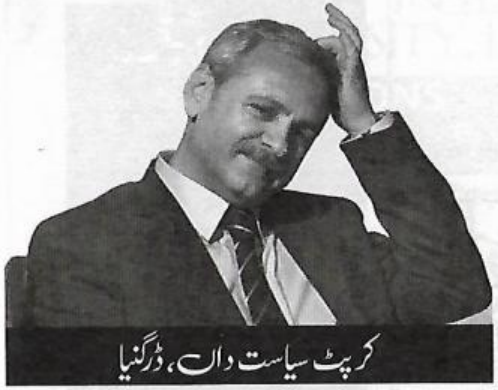

کرپٹ سیاست داں، ڈرگنیا

یو یوڈرگنیا سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا سربراہ اور رومانیہ میں کرپٹ سیاست دانوں کا سرخیل سمجھا جاتا ہے۔ موصوف کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ایک مشہور پاکستانی سیاست داں اور سربراہ پارٹی کے مانند "فرنٹ مین" یا دست راستوں کے ذریعے کرپشن کرتا ہے۔ یہ ماضی میں کئی بار وزیر رہا۔ اس نے کئی کمپنیاں بنائیں، انھیں اپنے فرنٹ مینوں کے سپرد کیا اور ان کو سرکاری ٹھیکے دیتا رہا۔ ان کمپنیوں کی وساطت سے ڈرگنیا نے کروڑوں روپے کمائے اور کرپشن کی رقم اپنے بیرون ممالک واقع اکاؤنٹس میں بھر لی۔

اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ نے اُسے مقدمے میں ملوث کیا تو ڈرگنیا کی سٹی گم ہو گئی۔ دراصل الیکشن جیت کر وہ وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر مقدمے میں ملوث ہونے کے بعد از روئے قانون وہ وزیر اعظم نہ بن سکا اور اس کی ساری تمنائیں دم توڑ گئیں۔

عدلیہ پر شب خون

اب یو یوڈرگنیا چوٹ کھایا ہوا زخمی سانپ بن گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی کے ارکان کی کثرت سے فائدہ اٹھا کر ایسی قانون سازی کرے کہ اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ اور عدلیہ، دونوں کی طاقتیں کم ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے وزیروں، مشیروں کی مدد سے مجوزہ قوانین تیار کرنے لگا۔

۲۰۱۷ء کے اواخر میں یہ قوانین تیار ہو گئے۔ حکومت قومی اسمبلی کی کل ۳۲۹ میں سے ۱۶۷ نشستیں رکھتی ہے۔ ۱۵۲ تو اس کی اپنی تھیں جبکہ ہم خیال سیاسی جماعتیں ۵۳ نشستیں رکھتی تھیں۔ چنانچہ ڈرگنیا نے وہ قوانین قومی اسمبلی سے منظور کرا لیے۔ ان نئے قوانین کے ذریعے عدلیہ اور اینٹی کرپشن ادارے کے پر قینچ کر دینا مقصود تھا۔ کچھ اہم تبدیلیاں درج ذیل ہیں:

☆ اب کوئی شہری کسی سرکاری افسر یا سیاست داں کی کرپشن اینٹی کرپشن ادارے کو رپورٹ کرے گا، تو ادارہ پہلے سرکاری افسر یا سیاست داں کو مطلع کرے گا کہ اس کے خلاف شکایت آئی ہے۔

یہ اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ کی طاقت کم کرنے والی سب سے اہم قانونی تبدیلی ہے۔ اب تک وتیرہ یہ ہے کہ جب اُسے کسی سیاست داں یا سرکاری افسر کے خلاف

(بقیہ صفحہ نمبر ۹۰ پر)

www.urdugem.com

تبصرہ کتاب

سیّد عاصم محمود

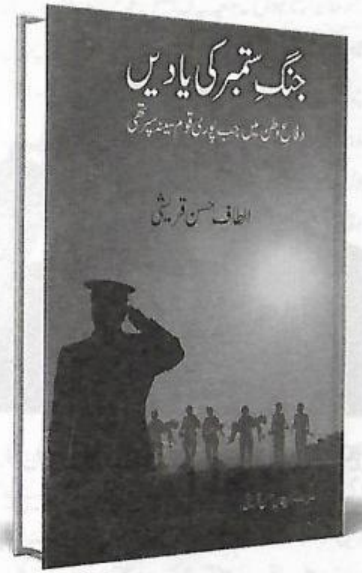

جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا، تو تبھی ارباب بصیرت وحکومت کو احساس تھا کہ بھارت پر قابض برہمنی حکمران طبقہ نوزائیدہ مملکت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بھارتی فوج نے ریاست جموں وکشمیر پر قبضہ کیا تو خدشے نے عملی جامہ پہن لیا۔ یہ غاصبانہ قبضہ تب سے پاکستان اور بھارت کے مابین وجہ نزاع بن چکا۔

اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں وادیٔ کشمیر کے باعث ہی دوسری پاک بھارت جنگ ہوئی۔ گو افواج پاکستان مثل جنت وادی کو پنجہ استبداد سے رہا نہ کرواسکی مگر اس نے محاذ جنگ پر کہیں زیادہ طاقتور دشمن کو ناکوں ناک چنے ضرور چبوا دیے۔ خاص طور پر میدان کارزار لاہور میں پاک افواج نے ایسی بے مثال شجاعت ودلیری کے مظاہرے دکھائے کہ بزدل بھارتی فوجی دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب ہمارے جری ودلیر جوان میدان جنگ میں دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنے کھڑے تھے، تو اہل قلم نے اپنی ولولہ انگیز اور روح پرور نثری وشعری تخلیقات سے ان کا حوصلہ شاداب وتوانا رکھا۔ اسی قافلہ اہل دل میں مدیر اعلیٰ اُردو ڈائجسٹ، الطاف حسین قریشی بھی شامل تھے۔ انھوں نے اس زمانے میں جذبات واحساسات سے مملو پُراثر مضامین لکھے اور اپنے قلم کو تلوار بنا کر دفاع وطن میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی خاصیت یہ ہے کہ ان سترہ دن میں قومی یکجہتی، ایثار وتعاون، ہمدردی اور محبت کے لازوال مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ یہ یادگار تاریخی واقعات زیر تبصرہ کتاب کے ورق ورق میں اپنی مہک سے دل ودماغ معطر کرتے ہیں۔ ان دل نشیں دنوں کا مشکبار تذکرہ آج بھی قاری کو جذبہ حب الوطنی سے سرشار کر ڈالتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں فاضل مصنف نے بہ عنوان ’’تصادم کے بنیادی محرکات‘‘ ایک مربوط ومبسوط مقالہ لکھا ہے۔ اس میں ان اہم عوامل کا گیرائی وگہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے جن کی وجہ سے پاکستان اور بھارت مدمقابل ہوئے۔ خصوصاً نئی نسل کے لیے اس مقالے کا مطالعہ نہایت سودمند رہے گا جسے بھارتیوں سے دوستی کی پینگیں بڑھانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔

مقالہ خصوصی کے بعد اکیس تحریروں میں اہم معرکوں کی داستان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہ معرکے اکھنور، چھمب جوڑیاں، واہگہ، باٹاپور، کھیم کھرن، چونڈہ، دوارکا اور سرگودھا وغیرہ میں انجام پائے۔ اکثر ہماری جنگی تاریخ کا سنہرا باب بن چکے اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بھی! ان مضامین کی کھوج اور انتخاب میں مدیر اعلیٰ

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۷۱ پر)

RIPHAH INTERNATIONAL UNIVERSITY, LAHORE

ADMISSIONS SPRING 2018
Undergraduate & Graduate Courses
(Morning, Evening & Weekend Programmes)

RIPHAH COLLEGE OF REHABILITATION SCIENCES
- Doctor of Physical Therapy (DPT, 5 Year)
  Clinical Collaboration
  - Ittefaq Hospital, Lahore
  - The Rising Sun, Lahore
- MS Speech Language Pathology (2 Year)
- MS Orthopedic Manual Physical Therapy (2 Year)
- MS Neuro Muscular Physical Therapy (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF CLINICAL & PROFESSIONAL PSYCHOLOGY
- BS Applied Psychology (4 Year)
- MS Clinical Psychology (2 Year)
- MS Top-Up in Clinical Psychology (1 Year)
- Advanced Diploma in Clinical Psychology (1 Year)
- MS Industrial and Organizational Psychology (2 Year)
- M.Phil Applied Psychology (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF LANGUAGE & LITERATURE
- BS English (Literature & Linguistics) (4 Year)
- MA English (Literature & Linguistics) (2 Year)
- M.Phil English (Literature & Linguistics) (2 Year)

RIPHAH INSTITUTE OF PHARMACEUTICAL SCIENCES
- M.Phil Pharmaceutics (2 Year)
- M.Phil Pharmacology (2 Year)

100% fully funded seats available through Shahbaz Sharif Merit Scholarship for Masters, M.Phil & MS Programmes
Punjab Educational Endowment Fund

RIPHAH INSTITUTE OF COMPUTING AND APPLIED SCIENCES
- BS Computer Science (4 Year)
- BS Software Engineering (4 Year)
- BS Physics (4 Year)
- BS Mathematics (4 Year)
- MSc Physics (2 Year)
- MSc Mathematics (2 Year)
- M.Phil Physics (2 Year)
- M.Phil Mathematics (2 Year)
- MS Computer Science (2 Year)

RIPHAH SCHOOL OF BUSINESS AND MANAGEMENT
- BBA (4 Year)
- MBA (1.5, 2.5 Year)
- MBA Executive (2 Year)
- MS Management Sciences (1.5, 2.5 Year)
- MS Engineering Management (1.5 Year)
- MS Project Management (1.5 Year)

Weekend/Evening Classes | Graduate Prospects | Pick & Drop | WiFi Enable Campus | Hostels

Government of Pakistan | Higher Education Commission | Pharmacy Council of Pakistan | Pakistan Engineering Council | Registered ISO 9001:2008

HOW TO APPLY
- Apply Online @ admissions.riphah.edu.pk
- Submit application processing fee of Rs. 1,000 in cash at any of our Admission Offices or courier the bank draft (of any bank) of Rs. 1060/- in the name of Islamic International Medical College Trust (IIMCT)

UAN: 042-111-RIPHAH (747-424)
www.lahore.riphah.edu.pk
admissions.lahore@riphah.edu.pk
/riphah.lhr

Township Campus: 13-14-C, Civic Center, Near Hamdard Chowk, Township, Lahore.
Raiwind Road Campus: 13 Km, Raiwind Road, Lahore.
Quaid-e-Azam Campus: 28-M, Quaid-e-Azam Industrial Estate, Kot Lakhpat, Lahore.

www.urdugem.com

نکاح کرنا میری سنت ہے (فرمان رسول ﷺ)

زنا ایک قرض ہے، اگر تم نے لے لیا تو ادا گھر والوں کو کرنا پڑے گا۔ (قول جناب امام حسنؓ)
اسلامی نظام زندگی۔۔۔ مکمل ضابطہ حیات اور خوشحالی کا ضامن ہے

نکاح آسان تحریک پاکستان

نکاح آسان تحریک پاکستان

۱۵ سالہ مثالی خدمات

قابل اعتماد، پائیدار اور معیاری اسلامی رشتوں کا مرکز | اب والدین اچھے رشتوں کے لیے پریشان نہ ہوں!

شعبہ جات:

۱۔ ہم سفر (Marriage Bureau): ہر برادری، زبان، مسلک اور ہر قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں رشتوں پر مشتمل ملکی اور غیر ملکی اسلامی رشتہ سینٹر (شیخ القرآن و الحدیث، مفتی، عالم دین، حافظ قرآن، جج، پروفیسر، لیکچرار، آرمی آفیسر، سرجن، ڈاکٹر، BDS، انجینئر، وکیل، صحافی، بزنس مین، زمیندار، صنعتکار، CA، ACCA، MBA، MSc.، M.A، M.Com، M.Phil، PhD، ڈپلوما ہولڈر اور مختلف شعبہ زندگی کے رشتے موجود ہیں)

۲۔ کتب (Library): شادی و بیاہ، رشتہ و رسومات، دینی و فقہی مسائل، معلوماتِ عامہ، معاشرتی و نفسیاتی، سماجی و معاشی، عائلی قوانین اور دیگر عصر حاضر کے پیچیدہ موضوعات پر مشتمل ایک لاکھ کتب پر مبنی وسیع و عریض لائبریری اور اسلامک بک سینٹر کا قیام

۳۔ تحقیق و نفسیات (Research & Psychology): 30 اہم ترین سنہری اصول جو کامیاب شادی کی بنیاد ہیں، جن کی روشنی میں رشتے کروائے جاتے ہیں۔

۴۔ تصانیف و تالیف (Publishing): طبی، قانونی، خاندانی، معاشرتی، نفسیاتی، روحانی، سیاسی مسائل اور نت نئے موضوعات پر پیغامات، مضامین، کتابچے اور کتب کا اجراء، مثلاً: صحیح استخارہ، تین طلاقیں، حلالہ، وٹہ سٹہ، تھیلسیمیا ٹیسٹ، لیٹ میرج، چار شادیاں، کزن میرج، جہیز، ٹیسٹ ٹیوب بے بی وغیرہ
صحیح استخارہ پر مشتمل کتابچہ اور 30 سنہری اصول مفت حاصل کرنے نیز خود مختار، لیٹ میرج، سیکنڈ میرج، بیوہ، رنڈوا، مطلقہ، خلع یافتہ، غرباء، مساکین، معذور، گونگے بہرے، نابینا، بے سہارا، مجبور، ضرورت مند، مستحق احباب بھی رابطہ کریں۔

مشاورتی بورڈ

زیر سرپرستی	بانی چیئرمین	قانونی مشیران	نکاح خواں
پروفیسر ابوالحسنین عبدالحمید محمد قرنی	عبداللہ ابوبکر صدیق حسنی	عطاء اللہ عاطف خانزادہ ایڈووکیٹ	مفتی حافظ محمد ایوب صابر
ڈاکٹر فرید احمد پراچہ	سیکرٹری جنرل	نصراللہ خان اولکھ ایڈووکیٹ	مولانا محمد طیب خاں میئو
پروفیسر سید وقار علی کاری	بیگم فرزانہ پروین	محمد رفیق نظامی ایڈووکیٹ	محمد سلیم قریشی المعصومی
چودھری محمد اعجاز آرائیں	باجی قیصر سلطانہ	حافظ فیصل ذیشان ایڈووکیٹ	قاری عامر رشید ہمدانی
خورشید احمد خان	راؤ محمد سلیم خان		

مشورہ، معلومات اور رجسٹریشن

خط و کتابت: پاکستان ہاؤس، سرور حیات کالونی، ریلوے روڈ نزد تبلیغی مرکز، رائیونڈ، لاہور

نیٹ ورک: پاکستان ہاؤس، بحریہ آرچرڈ، گیٹ نمبر 2، رائیونڈ روڈ، لاہور
سید مودودیؒ مارکیٹ، منصورہ ڈگری کالج، وحدت روڈ، ملتان چونگی، لاہور
کراچی، اسلام آباد، فیصل آباد، ملتان، گوجرانوالہ، حیدرآباد، سکھر، کوئٹہ، پشاور، مردان جہلم، گلگت، چترال، سوات، مظفر آباد، میرپور، وادئ نیلم، گجرات، رحیم یار خان

ufone 0333-2661312
wand 0321-2661312
(سروس 24/7/365)
WhatsApp
nikahatpakistan2002@gmail.com
icpp313pakistan@gmail.com
nikahatpakistan2002

alBaraka البركة Bank
Title: Abdullah Abubaker Siddique
A/C # :0103397721401
Branch Code: 0321 Raiwind

قارئین اردو ڈائجسٹ کے لیے انتہائی خوشخبری شادی بیاہ کے لیے تسلی بخش آن لائن مسنون استخارہ بھی کیا جاتا ہے۔

www.urdugem.com

www.urdugem.com

نفسیاتی مریضوں کی واحد جائے پناہ

فاؤنٹین ہاؤس

معاشرے کے اُن جیتے جاگتے کرداروں کی تلخ و افسوسناک حقیقت جنہیں دنیا "دیوانہ" کہتی ہے

عافیہ مقبول جہانگیر

وہ دراز قد ادھیڑ عمر عورت ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی لیکن بلا کی چست و پھرتیلی۔ کبھی اُس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت نظر آتی اور کبھی بے پناہ گہرائی۔ وہ زیادہ تر سر ہلاتے چلتی رہتی۔ چلتی بھی کیا تھی تیز تیز چکر کاٹتی۔ اُس نے چلنے کے لیے اپنا علاقہ مخصوص کر رکھا تھا۔ سمن آباد کی مشہور و معروف ترین سڑک ندیم شہید روڈ پر ایک سڑک چوک سے دائیں ہاتھ مڑتی دور تک جاتی اور آگے جا کر مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن کے پچھلے حصے میں جا نکلتی ہے۔ وہ عورت روز اس سڑک پر اپنا "ٹریک" مختص کر لیتی اور پھر سارا دن بغیر رُکے اُس کی "واک" جاری رہتی۔

معاشرے میں بڑھتے ہوئے ذہنی انتشار و خلفشار ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق یہ ہر انسان میں کسی نہ کسی صورت موجود ہوتے ہیں اور اگر ان کا ادراک یا آگہی نہ ہو تو ان سے انسان مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قارئین کے لیے اس ماہ اُردو ڈائجسٹ نے خصوصی مضمون کا اہتمام کیا ہے۔ صحت مند معاشرہ ہی صحت مند قوم و ملک کی تشکیل دیتا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر خود احتسابی کے عمل سے گزریں۔

میں اکثر وہاں سے گزرتے ہوئے نان حلیم لینے رُکا کرتی تھی۔ نان بائی جتنی دیر میں نان لگاتا میں اُس عورت کو دیکھتی رہتی۔ شروع میں مجھے لگا کہ شاید وہ بھکاری ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اُس نے میری یہ غلط فہمی دور کر دی۔ وہ فقیرنی نہیں تھی۔ کبھی مجھے لگتا کہ جس جارحانہ انداز میں وہ چلتی ہے، شاید وہ میرے قریب آ کر گاڑی کے شیشے پر کچھ دے مارے گی مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ وہ بے ضرر تھی اور شاید "بے قصور" بھی۔

وہ کسی کی طرف نہ تو دیکھتی نہ بولتی۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا موی لفافہ ہوتا جس میں کوئی بالوں کا کلپ، کبھی کنگھی تو کبھی کچھ دھاگے ہوتے۔ اُس کا "ٹریک" چند دکانوں تک مشتمل تھا۔ ہر روز ایک دکان کے آگے سے شروع اور اگلی چند دکانوں تک تیز تیز چلنا اور پھر اپنے "اسٹاپ" سے واپس پلٹ جانا۔ یوں وہ نہ جانے اُس ایک فرلانگ کے کتنے سو چکر کاٹا کرتی۔ رفتہ رفتہ میں اُس کے وجود کی عادی ہو گئی۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجھے وہ نظر نہ آتی۔ میری نظریں اُسے کھوجتیں تو وہ اسی سڑک پر کسی اور جگہ چکر لگا رہی ہوتی۔ ایک بار میری اُس سے نظریں ملیں اور میں اندر تک کانپ کر رہ گئی۔ کیا نہیں تھا اُن آنکھوں میں؟ بے پناہ ذہانت، گہرائی، بہت سے اسرار لیے بولتی، کھوجتی اور جائزہ لیتی تمسخرانہ آنکھیں۔ گویا کہہ رہی ہوں اُڑا لو آج جتنا مرضی، انجامِ زندگی یہی ہے۔ بے وقعت اور بے نام و نشاں۔

چیلنج کرتی نظریں کہ کتنی دیر خوش رہ لوگی اس بے رحم دنیا میں؟

جانے اُس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا مجھے کبھی اُس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک مضبوط قلعہ نما حصار اس نے اپنے اردگرد بنا رکھا تھا۔ وہ پاگل نہیں "محتاط" تھی۔ ہاں وہ ہم نارمل انسانوں سے زیادہ ذہین تھی۔ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ کس کو کتنے فاصلے پر رکھنا ہے۔ کس کی طرف دیکھنا اور کسے نظر انداز کرنا ہے۔ دنیا جنہیں "پاگل"، "مخبوط الحواس"، "بیمار" اور ذہنی مریض سمجھتی ہے، وہ دنیا کے بہترین عقلمند اور غیر معمولی انسان ہوتے ہیں۔ وہ کس طرح... آیئے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

ذہنی عوارض اور نفسیاتی الجھنیں

انسان قدرتِ الٰہی کی اعلیٰ ترین، نادر اور بیش قیمت تخلیق ہے جسے اشرف

www.urdugem.com

مخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ ہر انسان میں بے پناہ الگ الگ اہمیت کی حامل ذہنی و فکری قوتیں ہوتی ہیں۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ ان خوبیوں اور قوتوں سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے ان کے بہترین استعمال پر قادر ہو جائے یا بے خبری، بے عملی اور غیر مناسب حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کے بغیر فکری انتشار کا شکار ہو کر ان کو بروئے کار نہ لا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ کامیاب اور کچھ لوگ زندگی کو سمجھنے اور برتنے میں بُری طرح ناکام ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروقت استعمال نہیں کرتے یا کر نہیں پاتے۔ انسان کی عادتیں اور اس کی قابلیت ہی کبھی اسے معاشرے میں ممتاز بنا دیتی ہیں تو کبھی پستی اور ناکامی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہیں۔

نفسیاتی مسائل اور معاشرے کا کردار

ان سب عوامل کے پیچھے صرف ایک شخص کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لوگوں کا اس انسان کے ساتھ برتاؤ اور رویہ اسے اس پستی سے نکال بھی سکتا ہے اور گمنامی میں دھکیل بھی سکتا ہے جہاں پھر صرف وہ ایک جیتی جاگتی لاش یا محض سانس لیتا زندہ وجود بن کر رہ جاتے ہیں اور اُن کی اپنی شناخت کہیں کھو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ صرف اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنے کے فن سے قدرتی طور پر آشنا ہوتے اور کچھ تعلیم و ماحول کے ساتھ پروان چڑھتے، خود کو اس قابل بنا لیتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے بھی ہیں جو وقتی ناکامی سے گھبرا کر، مناسب ماحول یا معاشرے کی بے رحمی کا شکار ہو کر اپنے وجود سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ دنیا انھیں پاگل، احمق، کہتی ہے لیکن انھیں پھر نہ تو ہوش رہتا ہے نہ فکر۔ یہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی، اس کے سوا ان کی کوئی دنیاوی و جسمانی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

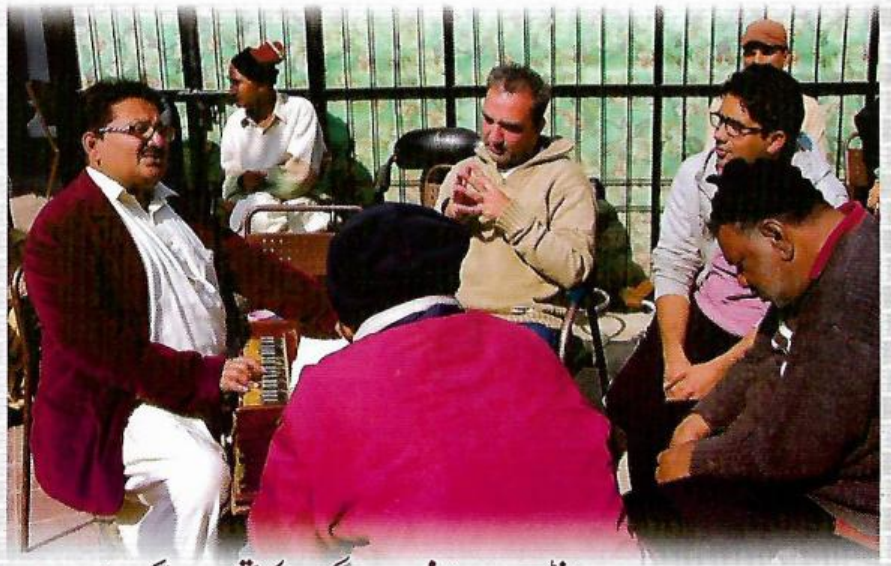

فاؤنٹین ہاؤس میں ممبرز کی میوزک تھراپی کرتے ہوئے

نفسیاتی مرض کیا ہے اور یہ کیوں ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے بنائے نظامِ قدرت کے طفیل ہر انسان کی زندگی محدود ہے اور اسی حساب سے اس کے کام کرنے کی ذہنی و جسمانی صلاحیت بھی محدود ہوتی ہے۔ جس طرح جسم کو صحت مند رہنے اور امورِ زندگی انجام دینے کے لیے مناسب غذا، آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اُسی طرح انسانی ذہن کو بھی حفاظت، مثبت تخلیقی مصروفیت اور دیکھ بھال کی ضرورت رہتی ہے۔ انسانی ذہن کی اہم ترین کارکردگی اس کا تخیل اور فکر و احساس ہے۔ بعض اوقات ذہن کی کارکردگی ماند پڑ جاتی ہے اور اس میں ٹوٹ پھوٹ ہونے لگتی ہے۔ بروقت اس ٹوٹ پھوٹ کا علاج اور اس پر قابو پا لیا جائے تو مزید خرابی سے بچا جا سکتا ہے۔

> اسلام میں گھر کے مرد کو امام کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ نہ امام کے ساتھ رکوع میں جا رہے ہیں، نہ سجدے نہ اقامت میں۔ ہر جگہ بدنظمی اور بے ترتیبی پھیل رہی ہے۔ گھروں کے اندر رہنے والی یہی بدنظمی پھر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا اس قسم کی ذہنی تبدیلی کو بیماری سمجھا ہی نہیں جاتا۔ نتیجتاً یہ دماغ میں اپنی جڑیں پھیلانے اور زور پکڑنے لگتی ہے۔ مریض اور گھر والوں کو تب احساس ہوتا ہے جب یہ مکمل طور پر انسان کو اپنے شکنجے میں جکڑ چکی ہوتی ہے۔ صرف معاشرے ہی کو کیا مورد الزام ٹھہرائیں اکثر والدین بھی اپنی کم علمی، غلط تربیت، معاشی و معاشرتی مجبوریوں، غیر صحت مند گھریلو ماحول اور خود ساختہ مصروفیت کے باعث بچوں پر توجہ نہیں دیتے۔ محرومی کا شکار بچہ اپنے اندر کتنی خامیاں اور کمزوریاں لے کر بڑا ہوتا ہے اس کا اندازہ تب والدین کو نہیں ہوتا۔ یہی بچے بڑے ہو کر خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں۔

مثلاً اگر ایک بچے کو اس کے بچپن میں بلاوجہ ہر وقت مار پڑتی رہی ہو، ماں باپ یا دوسرے بڑے، بہن بھائیوں نے اُسے اپنے غصے کا نشانہ بنایا ہو، کبھی اُس کی بات نہ سنی ہو یا اسے اپنی مرضی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں بھی نہ کرنے دی جائے تو ایسا بچہ بڑا ہو کر یقیناً تشدد پسند بنتا ہے۔ بہت کم ہی ایسا اتفاق ہوا ہو کہ وہ بچہ اپنے اُوپر ہونے والے مظالم کی وجہ سے حساس اور دردمند بنا ہو۔ ورنہ عموماً ایسے لوگ اپنی محرومیوں کا بدلہ اپنے شریکِ حیات، دفتری ساتھی، حتیٰ کہ اپنی اولاد تک سے لیتے ہیں۔ ان کے فیصلے اور رویے بے لچک اور زیادہ تر بے رحمانہ ہوا کرتے ہیں۔ کوئی سمجھ نہیں پاتا کہ وہ آخر ایسے کیوں ہیں؟ یہ بچپن کا ہی شاخسانہ ہوتا ہے۔ اس کی دوسری قسم پیدائشی یا موروثی ہے۔

حالیہ حقائق کے مطابق اس وقت انسانی آبادی چھ ارب نفوس سے تجاوز کرتی نظر آتی ہے۔ اسی حساب سے انسانوں میں روزمرّہ کے مسائل، کشمکش، چھینا جھپٹی، مقابلے بازی، غیر متوقع نتائج کی وجہ سے مایوسی، انتشار، بے چینی اور نفسانفسی کی کیفیات بھی تیزی سے بڑھ رہیں۔ تحفظ کا احساس ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے لیکن موجودہ دور میں شاید سب سے زیادہ فقدان اسی کا ہے جس کے نتیجے میں انسانی ذہن منتشر اور خوفزدہ ہو چکا۔

ذہنی کارکردگی کی اہمیت

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ چونکہ ذہن کا ٹھکانہ دماغ ہوتا ہے جو جسم کے اہم ترین اعضا میں سے ہے۔ جب

www.urdugem.com

مختلف عوامل قدرت کے اس خودکار نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں تو یہ نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور پھر مختلف قسم کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اگر یہ تنزلی اسی طرح جاری رہے تو آخر کار انسان ذہنی طور پر معذور ہوجاتا ہے۔ ذہن کا مرجانا ہی موت ہے۔ ذہن صحیح کام نہ کرے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ کیونکہ زندگی کو قائم رکھنے، اعضائے جسمانی کے صحیح کام کرنے، اندرونی و بیرونی دخل اندازی اور ضرر رسانی کو روکنے اور بیماریوں کی مدافعت کا فریضہ قدرت نے ذہن کے سپرد کر رکھا ہے۔

جب جسمانی نظام میں کسی خلل یا کارکردگی میں نقص کی اطلاع ذہن کو ملتی ہے تو وہ جسم کے اندر موجود قوتوں کو متحرک کر کے صحت کے قدرتی معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ذہن کی اس فطری کوشش کو اور زیادہ فعال بنانے کے لیے طب کا علم وجود میں آیا، دوائیں ایجاد ہوئیں اور مختلف بیماریوں کا علاج ممکن ہونے لگا۔

ماہرین نفسیات کا کردار اور اہمیت

انسان کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ طب کی دنیا میں ماہرین نفسیات نے بہت تیزی سے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ جنہوں نے ذہن کی کارکردگی جانچنے اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا جائزہ اور مطالعہ کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور وہ راز دریافت کیے جو انسان کے دماغ کو شعوری و لاشعوری طور پر مفلوج کرتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ اگر خامی کا بروقت پتا چل جائے تو پھر علاج کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات متاثرہ انسان کو کسی لمبے چوڑے علاج کی بھی ضرورت نہیں پڑتی وہ محض محبت اور توجہ کے دو جملوں سے ہی خود کو بہت بہتری کی طرف جاتا محسوس کرتا ہے۔

وطنِ عزیز میں ذہنی صحت کی صورتحال

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں ذہنی عارضوں میں مبتلا افراد کی تعداد ۲۵ تا ۳۰ فیصد سے تجاوز کر رہی ہے جو بے حد تشویشناک ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ حیرت انگیز طور پر خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ مسئلہ اتنی سنجیدہ نوعیت کا ہے کہ اس میں مبتلا مریض عارضہ قلب، فالج، کینسر یا ذیابیطس کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔ عموماً دس فیصد سے زائد لوگ خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر دیکھا جائے تو ۲۰ ہزار مریضوں کے لیے ایک ماہر نفسیات ہوتا ہے جبکہ پاکستان میں افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ ۲۰ لاکھ آبادی کے لیے صرف ایک ماہر نفسیات دان دستیاب ہوتا ہے۔

وطنِ عزیز میں ذہنی عوارض کا ایک بڑا سبب تعلیم یا پھر تربیت کا فقدان بھی ہے۔ اس کے علاوہ پُرسکون اور کامیاب زندگی گزارنے کا فن سکھانے والا بھی کوئی موجود نہیں ہوتا۔ والدین عام طور پر ناخواندہ ہونے کی وجہ سے اولاد کے بیشتر حقوق سے ناواقف ہوتے ہیں، نیز تعلیمی اداروں میں بھی نفسیاتی راہنمائی کا کوئی انتظام نہیں۔ ایسے حالات میں بہت ضروری ہے کہ عام انسان کی روزمرہ زندگی میں علمِ نفسیات کو عام کیا جائے۔ لوگوں میں آگاہی اُجاگر کی جائے کہ وہ کس طرح اپنی سوچ، طرزِ زندگی اور عمل میں خوشگوار تبدیلی لاسکتے ہیں۔ لیکن کیسے...؟

میں بہت سے سوالات کے جوابات کھوجنا چاہتی تھی۔ معاشرے کی ذہنی الجھنیں میرے ذہن و دل کا گھیراؤ کر رہی تھیں۔ اندرونی انتشار اور بیرونی ماحول میں انسان خود کو کیسے نارمل رکھے؟ ایک جگہ ہے، جہاں مجھے ان سب سوالوں کا نہ صرف جواب مل سکتا تھا بلکہ جینے کی اور خود کو تلاش کرنے کی نئی راہیں بھی مل سکتی تھیں۔ میں نے فون اُٹھایا اور ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ سے، جو فاؤنٹین ہاؤس کے ایم ایس اور اس ادارے کے ساتھ گزشتہ چودہ سال سے وابستہ ہیں، اُن کے قیمتی وقت میں سے کچھ عنایت کرنے کی درخواست کی۔ مجھے لگا وہ بہت مشکل

سے راضی ہوں گے یا "بڑے لوگوں" کی طرح بے نیازی سے گفتگو کرتے ہوئے شاید ٹال دیں یا کچھ بھی... مگر مجھے خوشگوار حیرت نے آن گھیرا جب انھوں نے مجھ سے انتہائی مشفق اور پُرخلوص انداز میں یوں بات کی جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔ ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے وہاں آنے کی دعوت دی اور وقتِ ملاقات بھی میری سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھ پر چھوڑ دیا۔

پاکستان کا واحد مستند ادارہ فاؤنٹین ہاؤس اسی خدمت خلق اور انسانیت کی تو بلند وارفع مثال ہے۔ اب مجھے اُس دن کا انتظار تھا جب مجھے نہ صرف میرے بلکہ تمام معاشرے کے اُلجھے ہوئے سوالوں کے سُلجھے ہوئے جوابات ملیں گے۔ آپ قارئین کی سہولت اور دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے انٹرویو کے بجائے مربوط مضمون کی شکل میں ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ کے ساتھ ہوئی یہ گفتگو ہزارہا مسائل سمجھنے اور اُن سے نبرد آزما ہونے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

فاؤنٹین ہاؤس کا پس منظر اور شروعات

۳۷ لوئر مال پر واقع یہ وسیع عریض عمارت پاکستان کے اُن اداروں میں سے ایک ہے جس پر بلاشبہ انسانیت کی خدمت کے حوالے سے بحیثیت پاکستانی فخر کیا جاسکتا ہے۔ جہاں نفسیاتی مریضوں کا نہ صرف علاج کیا جاتا ہے بلکہ اُن کی شخصیت کی نئے سرے سے تعمیر کی جاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ صرف اسپتال ہی نہیں ری ہیبلیٹیشن سینٹر (Rehablitation center) بھی ہے۔

اس ادارے کا خواب ڈاکٹر رشید چودھری نے دیکھا اور پاکستان میں فاؤنٹین ہاؤس جیسے ادارے کی بنیاد اور اسے کامیابی سے آگے بڑھانے کا سہرا اُنہی کے سر ہے۔ پاکستان میں ایسے ادارے کے قیام کا خیال اُن کے دل میں نیویارک کے ایک چھوٹے سے ہاسپٹل کو دیکھ کر آیا تھا۔ جو دراصل ایسی این جی اوز تھی جو وہاں کے چند ذہنی

ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ

ایم ایس فاؤنٹین ہاؤس

یہ میرے لوگ ہیں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں DOW میڈیکل کالج سندھ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وطنِ عزیز میں نشے کی بیماری نئی نئی پھیل رہی تھی۔ کالج کے گیٹ کے پاس کئی نوجوان بیٹھ کر نشہ کیا کرتے تھے۔ میں اور میرا گروپ انھیں دیکھ کر بہت حیران ہوتے اور سوچتے یہ کون لوگ ہیں اور ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ہمیں منع کیا جاتا کہ ان کے پاس نہیں جانا وہ بہت خراب لوگ ہیں۔ ایک دن میں نے اُن کے پاس کھڑے ہوکر ان سے بات چیت کی تو اندازہ ہوا کہ وہ سب تو بہت اچھے کھاتے پیتے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ جب مجھے منع کیا گیا تب میں نے فیصلہ کیا کہ "یہ میرے لوگ ہیں"۔ جب میں ڈاکٹر بنا تو جس پہلے اسپتال میں میری ڈیوٹی تھی، اتفاق سے وہ ایک ڈرگ ایڈکشن سینٹر تھا۔ میرے گھر والوں نے مجھے کہا کہ آپ کو دنیا میں اور کوئی اسپتال نہیں ملا؟ میں نے اُن سے بھی کہا "یہ میرے لوگ ہیں۔" اس بات کو ۲۳ سال گزر چکے اور آج بھی "یہ میرے لوگ ہیں"۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

امراض میں مبتلا مریضوں نے بنائی تھی۔ اس کا نام (We Are Not Alone) یعنی ''ہم تنہا نہیں ہیں'' تھا۔ یہ این جی او WANA کے نام سے جانی جاتی ہے۔

ڈاکٹر رشید چودھری نے عملی جدوجہد کا آغاز ۱۹۶۲ء میں لاہور مینٹل ایسوسی ایشن سے کیا اور پھر ۱۹۷۱ء میں انھوں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر اس کی بنیاد ایمپریس روڈ پر کرائے کی ایک کشادہ عمارت ''ہاف وے ہاؤس'' کے ایک حصے میں رکھی۔ کچھ عرصے بعد اسے موجودہ عمارت، ۳۷ لوئر مال منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمارت پہلے ہندو وڈوہوم تھی۔ ڈاکٹر رشید احمد چودھری کی شب و روز کی انتھک محنت سے ایک مکمل مربوط ادارہ چند ہی سالوں میں قائم ہو گیا۔ پروفیسر رشید چودھری کے بعد اُن کے بیٹے پروفیسر ہارون رشید نے اس ادارے کو سنبھالا اور دس سال نہایت جانفشانی، لگن اور محبت سے چلایا۔ اُن کی وفات کے بعد ڈاکٹر امجد ثاقب اس ادارے کے چیئرمین اور محترمہ ناصرہ جاوید اقبال صاحبہ چیئر پرسن ہیں۔ پوری دنیا میں ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۳۳۰ فاؤنٹین ہاؤس موجود ہیں لیکن پاکستان میں قائم شدہ یہ ایشیا کا پہلا ایسا سینٹر ہے جو اب تناور درخت کی شکل میں پاکستان کے مختلف بڑے شہروں میں اپنی شاخیں پھیلا رہا ہے۔

فاؤنٹین ہاؤس بیرونی اداروں سے مختلف ہے

پاکستان میں قائم اس سینٹر اور دوسرے ممالک کے ری ہیبلی ٹیشن سینٹرز میں واضح فرق کلچر یعنی ثقافت کا ہے۔ پاکستان میں طریقۂ علاج اور ماحول بیرونِ ممالک سے یکسر مختلف ہے۔ وجہ یہ کہ وہاں فیملی سسٹم نہیں اور یہاں ہے۔ بیرونِ ممالک میں مریض صبح کے وقت سینٹر آتے اور ادویہ لے کر چلے جاتے ہیں۔ اُن کی بحالیٔ صحت کے لیے سائیکو تھراپسٹ اور سوشل ورکرز زیادہ کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں سائیکوتھراپی تو ہوتی ہے مگر ڈاکٹر کا صرف دورانِ علاج ہی مریض کے ساتھ جذباتی

پروفیسر ڈاکٹر ہارون رشید چودھری (مرحوم)
سابق ایگزیکٹو ڈائریکٹر (فاؤنٹین ہاؤس)

تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے۔ ڈاکٹر، سائیکوتھراپسٹ اور سوشل ورکر، ان تین لوگوں پر مشتمل ایک ٹیم ہی ایک مریض کو صحت یاب کرتی ہے۔ جبکہ پاکستان میں اس شعبے میں ڈاکٹروں کا فقدان ہے۔

نفسیاتی بیماریوں کی شرح میں اضافہ اور آگاہی

ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ تشویشناک اور فکرمند ہیں کہ پوری دنیا میں نفسیاتی بیماریوں کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ لوگوں میں آگاہی بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ برس فاؤنٹین ہاؤس او پی ڈی میں تقریباً ۳۵ ہزار مریضوں کا چیک اپ کیا گیا جو چار یا پانچ سال پہلے محض چھ ہزار تھے۔

اُن کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ آگاہی ہے۔ نفسیاتی بیماریاں پہلے بھی انسانوں میں موجود ہوتی تھیں مگر ان کا ادراک اتنا نہیں تھا جتنا اب ہے۔ ادراک اور آگاہی کی

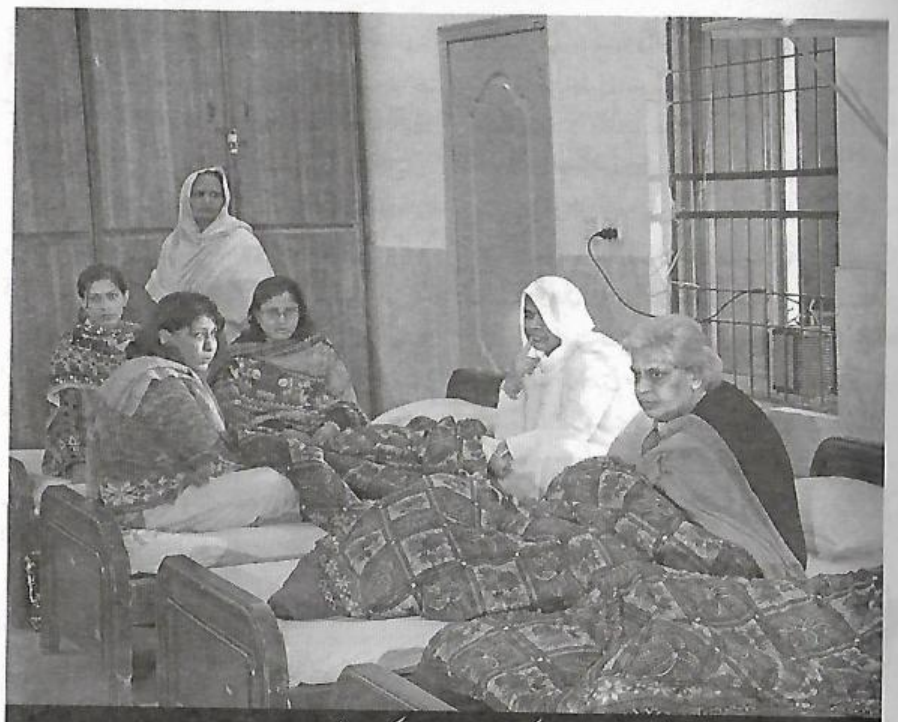

خواتین وارڈ جہاں کی ممبرز اپنوں کی راہ تک رہی ہیں۔

وجہ سے یہ مرض کُھل کر اب سامنے آنا شروع ہو گیا ہے۔

پاکستان میں خواتین مریضوں کے مسائل

وطنِ عزیز میں خواتین کو اپنے کسی مسئلے کا کھل کر اظہار آج بھی نہیں کرنے دیا جاتا۔ ویسے تو ہم جدت پسند اور ترقی یافتہ قوم کہلوانا چاہتے ہیں جو عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے اور اسے آزادی دینے کی متمنی ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آج بھی پاکستان کے بیشتر گھروں میں ایک عورت یہ بات ظاہر نہیں کر سکتی کہ اسے کوئی نفسیاتی بیماری یا پریشانی ہے۔

خواتین کے انہی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اب فاؤنٹین ہاؤس، فاروق آباد میں بھی اپنا ادارہ قائم کرنے کی تیاریوں کے آخری مراحل میں ہے۔ جہاں بطورِ خاص خواتین کا علاج کیا جائے گا۔ تقریباً ڈیڑھ سو بیڈز پر مشتمل یہ سینٹر لاکھوں نہیں تو ہزاروں خواتین کو دوبارہ جینے کے قابل ضرور ہی بنا دے گا۔

نفسیاتی مسائل کی بنیادی وجوہ اور اقسام

آج سے چودہ سو سال پہلے جب ہمارے رسول کریم ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے لڑکی کی پیدائش کو باعثِ رحمت قرار دیا۔ آپ ﷺ نے ہمیں جن جن باتوں سے منع فرمایا، وہ سب ہمارے معاشرے میں آج بھی ہو رہی ہیں۔ جو سلوک اُس زمانے میں عورت کے ساتھ ہوتا تھا وہ اب بھی ہو رہا ہے۔ بہت سے گھرانے ایسے ہیں

www.urdugem.com

جہاں لڑکی کے پیدا ہونے پر کوئی خوشی نہیں منائی جاتی۔ انھیں دوسرے تیسرے درجے کی شہری سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض علاقوں میں جان سے بھی مار دیا جاتا ہے۔ آج بھی لڑکے کو لڑکی پر فوقیت دیتے ہوئے اُسے انڈہ نہیں کھلایا جاتا۔ اُسے اچھی غذا سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کے مسائل حل کرنا تو درکنار انھیں قابلِ توجہ سمجھا ہی نہیں جاتا۔

فاؤنٹین ہاؤس کے قرب و جوار میں موجود کئی بستیاں ایسی ہیں جہاں نفسیاتی الجھنوں کے متاثرہ بچے اور بچیوں کو صندوقوں میں بند کر کے رکھا جاتا ہے یا کمرے کے کسی کونے میں بیڑیوں زنجیروں سے باندھ کر ایک کونے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

ایسے مریضوں کے علاج اور والدین کو ان کے مرض سے آگاہی کے لیے فاؤنٹین ہاؤس کی ٹیم ان کے گھروں میں جا کر والدین کی تربیت کرتی اور متاثرہ کا علاج معالجہ کروانے پر انھیں رضامند کرتی ہے۔

دوسرے نمبر پر خاندانی اور موروثی جینز ہیں۔ جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ اس کے پھیلنے کا سبب آپس میں شادیاں یعنی کزن میرج ہے۔ لوگ آج بھی خاندان برادری سے باہر رشتہ جوڑنا نہیں چاہتے۔ برادری کے اس نظریے نے بہت سی بیماریوں کو جنم اور بڑھاوا دیا ہے۔

تیسرے نمبر پر حالات و واقعات ہیں۔ یہ سب سے فکر انگیز بات ہے۔ ایک انسان جو پہلے ہی نفسیاتی یا ذہنی کمزوری کا شکار ہو اور ارد گرد کے حالات و ماحول اس کے لیے موافق نہ ہوں، تو یہ بیماریاں اندر سے باہر آجاتی ہیں۔ جیسے لاوا پک کر اُبلنا شروع کر دے اور پھر پھٹ کر باہر آجائے۔ بالکل ویسے ہی نفسیاتی بیماری کے لیے غیر موافق حالات کھاد کا کام کرتے ہیں۔

نفسیاتی مسائل کا حل شادی نہیں

ایک ذہنی طور پر پریشان یا نفسیاتی مریض لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے یا شادی شدہ ہو تو طلاق دے دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ بیماری دوگنی ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں سب سے خراب چیز یہی ہے کہ دماغی طور پر نااہل انسان کا حتمی اور صحیح علاج شادی سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ شادی تو بذاتِ خود ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ شادی کی وجہ سے ایک صحتمند لڑکی کو پہلے ہی بہت زیادہ سمجھ بوجھ اور اضافی ذمہ داریوں کے ساتھ نئے حالات، لوگوں اور ماحول کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندازہ کریں کہ پھر ایک نفسیاتی طور پر کمزور لڑکی کیسے ان کا سامنا کرتی ہوگی اور اس کے دماغ پر کیا کیا منفی اثرات پڑتے ہوں گے۔ اس کی اذیت اور تکلیف کی شدت کا اندازہ لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ اگر ایک انسان کی ٹانگ ٹوٹی ہو اور ہم اس پر دگنا وزن ڈال دیں۔

ہمارے معاشرے میں برداشت کم ہوتی جا رہی ہے۔ کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں، لیکن عمل ہمارا اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ غیبت، جھوٹ اور حسد جیسے مادے ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ یہ وہ روحانی بیماریاں اور عوامل ہیں جو نفسیاتی بیماری کو بڑھاتی ہیں۔

اس کے علاوہ شادیوں اور طلاقوں کی شرح میں اضافہ بھی عورت کو ذہنی بیمار کر رہی ہے۔ دو دو تین تین شادیاں اور طلاقیں ہمارے معاشرے میں عام بات ہو چکی۔ فاؤنٹین ہاؤس کی عمارت کے بالکل ساتھ سیشن کورٹ کی عمارت ہے۔ ڈاکٹر عمران نے بہت افسوس کے ساتھ مجھے بتایا کہ اس کورٹ میں ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کی تاریخ کی سب سے زیادہ طلاقیں ہوتی ہیں۔

چوتھی اہم وجہ یہ ہے کہ ہم جسمانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ روحانی بیماریوں میں بھی مبتلا ہیں۔ ہمارے معاشرے میں برداشت کم ہوتی جا رہی ہے۔ کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں، لیکن عمل ہمارا اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ غیبت، جھوٹ اور حسد جیسے مادے ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ یہ وہ روحانی بیماریاں اور عوامل ہیں جو نفسیاتی بیماری کو بڑھاتی ہیں۔

کمزور عقیدے اور پیروں فقیروں پر اندھا اعتقاد

ہمارے ایمان کا یہ حال ہے کہ بلی راستہ کاٹ جائے تو ہم وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کی پڑھائی میں دلچسپی نہ ہو یا لڑکے کو نوکری نہ مل رہی ہو تو ضرور کسی کی نظر لگی ہے۔ تعویز گنڈے کروانے باباؤں عاملوں کے پاس بھاگتے ہیں۔ پھر لڑکیوں پر ''جن'' آجانے کی بھی اپنی ہی کہانی ہے۔ جس لڑکی کی مناسب وقت پر شادی نہیں ہو رہی۔ اس کی جسمانی اور دیگر جذباتی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں اور وہ تنہائی کا شکار ہے، تو اس پر جن آجاتا ہے۔ یعنی جنوں کے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ وہ صرف لڑکیوں پر ہی آتے رہیں۔

ہسٹیریا کی مریض ایک لڑکی جب اپنے اندر کا غبار اور فرسٹریشن نکالنے کے لیے عجیب و غریب حرکات و سکنات کرتی ہے یا اندرونی غصے کو باہر نکالنے کے لیے چیختی چلاتی ہے تو اس پر بھی ''جن'' کا اثر ہوتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہو گئی کہ جیسے ہم اپنے اندر کی ہر برائی، جھوٹ، کرپشن کا سارا الزام حکومت پر ڈال کر خود بڑی الزمہ ہو جائیں۔ کوئی کام ہم ٹھیک سے نہیں کرتے اور پھر کہتے ہیں کہ یہ ملک ہی ٹھیک نہیں۔ ٹھیک اسی طرح لڑکیوں کی ذمہ داری بھی جن پر ڈال دی جاتی ہے۔ اس طرح مرض بڑھتا جاتا ہے۔

شیزوفرینیا اور بائی پولر (Bipolar Diorder)

یہ دونوں بیماریاں عام طور پر ذہین لوگوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق شیزوفرینیا کے ۱۰۰ لوگوں پر جب ریسرچ کی گئی تو پتا چلا کہ اُن میں ۱۱۰ ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں کئی غیر معمولی کام انجام دیے تھے۔ کوئی لکھاری تھا تو کوئی فلم میکر۔ کوئی شاعر یا ادیب تھا تو کوئی کسی ایجاد کا بانی۔ عام طور پر یہ شرح معاشرے کے ایک لاکھ لوگوں میں سے دس فیصد کی ہوتی ہے جبکہ اس ریسرچ کے مطابق محض سو میں سے دس ایسے ذہین لوگ نکلے۔

اپنوں کی بے رُخی کے بعد ایک دوسرے کا ساتھ ہی اب ان کے جینے کا مقصد ہے

شیزوفرینیا میں انسان تخیلاتی دنیا میں اس قدر گم جاتا ہے کہ پھر وہ اس سے باہر نہیں آپاتا۔ اسے وہم ستاتے ہیں۔ اُسے ایسی آوازیں اور لوگ نظر آنے لگتے ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ شیزوفرینیا کی اقسام اور توجیحات بہت وسیع ہیں جن تمام کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں، مگر اس بیماری پر قابو پانا اور دوبارہ سے معاشرے کا کارآمد فرد بننا ممکن ہے۔ مشہور نوبل انعام یافتہ ریاضی دان جان ناش (John Nash) محض ۲۵ یا ۲۶ سال کی عمر میں اس بیماری

www.urdugem.com

صحتمند ہو جانے والا ممبر اپنے پیاروں کی راہ تکتے تکتے مایوس ہو جاتا اور روز پوچھتا ہے کہ مجھے کوئی لینے کیوں نہیں آتا؟

کا شکار ہوئے اور تقریباً پندرہ سال وہ اس سے نبرد آزما رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انھوں نے علاج کروانا بھی چھوڑ دیا مگر پھر دوبارہ علاج شروع کروانے سے نہ صرف وہ صحتیاب ہوئے بلکہ قابلِ ذکر کامیابیاں بھی ان کا نصیب ٹھہریں۔ اُن کی بائیوگرافی A Beautiful Mind کے مصنف سلویا نے لکھا ہے کہ کس طرح جان ناش نے صحتیاب ہونے کے بعد تیزی سے کامیابی کی منازل طے کیں۔ اس کتاب پر ایک فلم بھی بن چکی۔ آئن سٹائن بھی شیزوفرینیا کا شکار تھے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار مثالیں ہیں جن سب کا یہاں تذکرہ ممکن نہیں۔

بائی پولر ایسی بیماری ہے جس میں مریض انتہا پسند ہو جاتا ہے۔ اس مرض کا شکار لوگ یا تو بہت زیادہ ہائپر اور ایزجیٹک ہو جاتے ہیں، جیسے کہ شوخ اور بھڑکیلے کپڑے پہننا، تیز میک اپ کرنا، بے ہنگم شور وغل، غیر معمولی جوش کا مظاہرہ وغیرہ۔ دوسری صورت اس کے بالکل اُلٹ ہے یعنی اپنے آپ کو مردہ سمجھنا۔ یہ سوچنا کہ بس سب ختم ہو چکا اور زندہ لاش کی طرح زندگی گزارنا۔ توازن ان کی شخصیت سے نکل جاتا ہے۔ یہ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں چلے جاتے اور بعض اوقات خودکشی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ بائی پولر کا سامنا کرنے والے بہت سے مشہور لوگ اب صحتیاب ہو چکے۔ آج کی نوجوان نسل مشہور ریپ سنگر ہنی سنگھ کی بہت دلدادہ ہے جو اربوں کروڑوں میں کھیل رہا ہے لیکن اس کے پرستار یہ نہیں جانتے کہ حال ہی میں وہ بائی پولر کے شدید ترین حملے کا شکار ہوا اور اس نے اپنی تمام سرگرمیاں ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ بیماری کے بروقت ادراک و علاج نے اسے سنبھالا دے دیا اور اب وہ صحتیاب ہو چکا۔

یعنی کچھ نے صحتیاب ہونے کے بعد عروج پایا اور کچھ

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں

عروج کو نہ سہتے ہوئے ڈس آرڈر کا شکار ہو گئے۔ اس کے علاوہ یہ سوچ بھی غلط ہے کہ صرف ذہین یا زیادہ پڑھے لکھے لوگ ہی اس کا شکار ہوتے ہیں۔ نفسیاتی بیماری ہر اس انسان کو ہو سکتی ہے جس کے پاس دماغ ہو۔ ٹھیک ویسے جیسے نظر اسی کی کمزور ہوتی ہے جس کے پاس نظر یعنی بصارت ہو۔ اسی طرح دماغ کا ہونا ہی کافی ہے۔ تیز یا غبی کا اس بیماری سے کوئی تعلق نہیں۔ فاؤنٹین ہاؤس میں شیزوفرینیا کے مریضوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

صحتیاب ہونے کے بعد بیماری کا دوبارہ حملہ آور ہونا

فاؤنٹین ہاؤس میں پچاس سال سے جاری اس کارِ خیر کے نتیجے میں اب تک ساٹھ ہزار کے قریب مریض صحتیاب ہو کر معاشرے میں ایک کارآمد شہری بن کر لوٹ چکے ہیں۔

جن مریضوں کے گھر والے ان کا خیال رکھتے اور انھیں باقاعدگی سے ادویہ کھلاتے اور معالج سے رابطے میں رہتے ہیں، وہ مریض تو بہت جلد صحت مند زندگی کی طرف لوٹ جاتے ہیں لیکن جن مریضوں کو یہاں سے بالکل ٹھیک کر کے بھیجا گیا اور پھر انھیں معاشرے کے بدصورت رویوں کا سامنا کرنا پڑا، خاندان والوں کے طعنوں اور تضحیک کا نشانہ بنے، یا گھر والے ان کا مناسب خیال نہ رکھ پائے، ان پر بیماری پہلے سے زیادہ شدت سے حملہ آور ہوتی ہے اور پھر ان پر نہ کوئی تھراپی کام آتی نہ ہی ادویہ اثر کرتی ہیں۔ وہ ناقابلِ علاج ہو جاتے ہیں۔

تعلیم بڑھ رہی، تربیت ختم ہو رہی ہے

گلی گلی میں ہر دوسرا شخص ماسٹرز کی ڈگری لے کر گھوم رہا ہے۔ ان میں تربیت کی اتنی ہی کمی ہے جتنی ایک ان پڑھ انسان میں۔ تعلیم اور تربیت دونوں الگ چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے بالواسطہ تعلق رکھتی ہیں۔ جب تعلیم تو ہو لیکن تربیت اور راہنمائی نہ ہو تو انسان انسانی روابط سے منقطع (isolate) ہونے لگتا ہے۔ یہ Isolation آپ کو اکیلا کر دیتی ہے۔ جب انسان اکیلا ہو جائے گا تو وہ اپنے مسائل کس کو بتائے گا؟ جب آپ کارنر Corner ہو گئے اور آپ کو ایک کونے میں بٹھا دیا گیا، تو آپ کے اندر ٹوٹ پھوٹ لازمی ہو گی۔ گھروں میں جب ٹوٹ پھوٹ پیدا ہو جائے گی تو پھر نفسیاتی بیماریاں جنم بھی لیں گی اور بڑھیں گی بھی۔ سوال یہ ہے کہ کارنر کیوں کر دیا جاتا ہے؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بچہ جیسے ہی کوئی ڈگری حاصل کر لے، اس سے ہزار ہا امیدیں وابستہ کر لی جاتی ہیں کہ اب اچھی اعلیٰ نوکری ملے گی، ڈھیروں روپیا آئے گا۔ جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے ہی جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور کر دیتے ہیں۔ تربیت کا فقدان پہلے ہی ہوتا ہے، سونے پہ سہاگا یہ چیز انھیں تباہ کر ڈالتی ہے۔

ایک معاشرہ یونٹ سے بنتا ہے اور یونٹ گھر سے۔ گھر ہی وہ سب سے مضبوط کلیہ ہے جس سے محلہ بنتا ہے، محلے سے شہر اور پھر ملک۔ لیکن ہمارے گھروں میں کیا ہو رہا

خواتین کا آرٹ روم جہاں اُنھیں بے شمار تخلیقی کام سکھایا جاتا ہے۔

www.urdugem.com

ہے؟ بیوی اپنی تعلیم اور انا کے غرور میں شوہر کو شوہر ماننے پر تیار نہیں۔ اس کا درجہ قبول کرنے پر راضی نہیں۔ جب بیوی ہی شوہر کی اہمیت نہیں مانے گی تو وہ اپنی اولاد میں باپ کا احترام یا اس کی ضرورت کا احساس کیسے اجاگر کر پائے گی۔ تب بچہ اپنے باپ کی نافرمانی بھی کرے گا اپنی من مانی بھی کرے گا۔ رہی سہی کسر موبائل فونز کے استعمال نے پوری کردی ہے۔ ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا کر بیٹھا ہے۔ نتیجتاً لاتعداد مسائل، خرابیاں اور بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔

اسلام میں گھر کے مرد کو امام کا درجہ دیا گیا ہے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ نہ امام کے ساتھ رکوع میں جارہے ہیں، نہ سجدے نہ اقامت میں۔ ہر جگہ بدنظمی اور بے ترتیبی پھیل رہی ہے۔ گھروں کے اندر ہونے والی یہی بدنظمی پھر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

مریضوں کی شخصیت کی تعمیر و تربیت کا بیڑا

یوں تو فاؤنٹین ہاؤس کا بنیادی کام ذہنی امراض میں مبتلا افراد کا علاج معالجہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی یہ ادارہ بیک وقت اور کئی خدمات بھی انجام دے رہا ہے۔ مریضوں کی تعلیم و تربیت کر کے، انھیں مختلف ہنر سکھا کے، معاشرے کا مفید شہری بنانے کا بیڑا بھی اس ادارے نے اپنے سر اُٹھا رکھا ہے۔ اسی ادارے میں ایک تعلیمی درس گاہ بھی قائم ہے جہاں کئی طالب علم تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس ادارے میں طلبا کو مختلف کورس کروائے جاتے ہیں جن میں کمپیوٹر کورس، بلاک پرنٹنگ، سکرین پرنٹنگ، گتے کے بیگ بنانا، فلاور میکنگ، ہاتھ کی سلائی، بٹن لگانا، کھڈی پر کپڑا بنانا، مصوری، فوٹو گرافی اور کھانا پکانا وغیرہ شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ ادارہ والدین کا کردار بخوبی ادا کر رہا ہے۔ طلبا کو نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ سب ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں تاکہ صحت

ڈاکٹر محمد امجد ثاقب (ستارۂ امتیاز) چیئرمین فاؤنٹین ہاؤس

یاب ہونے کے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر معاشرے میں ذریعۂ معاش کے لیے دردر نہ بھٹکیں۔

خواجہ سراؤں کے لیے ماہانہ وظائف اور امداد

فاؤنٹین ہاؤس کا ایک اور قابلِ تحسین کارِ خیر نفسیاتی امراض کے علاج و معالجے کے ساتھ ساتھ نادار اور بے سہارا خواجہ سراؤں کی مستقل بنیادوں پر امداد اور ان کے ساتھ محبت، انسانیت اور مسیحائی کی اعلیٰ اقدارات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا ماہانہ علاج و وظیفہ بھی ہے۔

خواجہ سرا کا یہ پراجیکٹ ڈاکٹر امجد ثاقب نے شروع کیا تھا۔ وہ خواجہ سراؤں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ نے بتایا کہ ایک بار ڈاکٹر ثاقب کے پاس کچھ لوگ زکوٰۃ اور صدقے کے لیے آئے۔ تب انھوں نے سوچا کہ معاشرے کے ٹھکرائے اور ستائے ہوئے اس طبقے کو، پاکستان میں موجود دوسرے نفسیاتی مریضوں سے کہیں زیادہ

نظر انداز کیا جاتا ہے اور یہ خواجہ سرا شاید ان کی نسبت زیادہ توجہ اور محبت کے حقدار ہیں۔

ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ کے مطابق سب سے زیادہ نظر انداز کیا جانے والا (Most neglected section of the population) یہی طبقہ ہے۔ اسی بنیاد پر فاؤنٹین ہاؤس میں ان کے لیے مختلف امدادی سرگرمیاں شروع کی گئیں جو نہایت کامیابی سے جاری و ساری ہیں۔ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے یہ بے بس خواجہ سرا فاؤنٹین ہاؤس سے نہ صرف ماہانہ وظیفہ وصول کرتے بلکہ ان کے مختلف امراض کا بالشافی علاج بھی یہاں کیا جاتا ہے۔

میری ملاقات وہاں خواجہ سراؤں کے اس پراجیکٹ میں اسپتال کے عملے کا ساتھ دینے اور اپنے طبقے کی مؤثر انداز میں نمائندگی کرنے والے کچھ ایسے خواجہ سراؤں سے ہوئی جنھوں نے مجھے زندگی کا ایک نہایت غمزدہ روپ بہت قریب سے دکھایا اور فاؤنٹین ہاؤس کے اس پراجیکٹ کے عوض انھیں ملنے والی خوشیوں کا بھی تذکرہ کیا۔

خواجہ سرا بالی اور عاشی

خواجہ سرا بالی اور عاشی اس سینٹر میں علاج اور وظیفے کے لیے آنے والے خواجہ سراؤں کی پرچیاں بنواتے اور انھیں ہال میں سلیقے سے بٹھاتے ہیں۔ خواجہ سرا ماہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام خواجہ سرا مریضوں اور وظیفہ لینے والوں کی مانیٹرنگ کرے اور انھیں سینٹر کے اصول و ضوابط کی پاسداری کے بارے میں ٹریٹ کرے۔ ہر ہفتے وہاں ڈھیروں خواجہ سرا آتے اور مفت علاج سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ماہی نے بتایا کہ اگرچہ وظیفہ بہت زیادہ تو نہیں ہوتا مگر ان کے جینے کی ایک خوشگوار وجہ ضرور بن جاتا ہے۔ ایک اُمید رہتی ہے کہ انھیں کچھ ملے گا۔ اس سے وہ اپنی ذاتی ضروریات تھوڑی بہت پوری کرنے میں کامیاب ہوتے اور ان میں خود اعتمادی آتی ہے۔

بالی اور عاشی بھی وہاں ملازمت کرتے ہیں۔ یہ دونوں فاؤنٹین ہاؤس کی خواتین ممبرز کو تخلیقی و آرٹ ورک سکھاتے اور منفرد اشیا بناتے ہیں۔ جن کی باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی ہے۔ بالی نے بتایا کہ ان چیزوں کو بنانے کی اجرت بھی مقرر ہے جو ممبر کے کھاتے میں جمع کردی جاتی اور پھر اسی کے کام آتی ہے۔ عاشی اس ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ ہے جہاں یہ سب آرٹ ورک سکھایا جاتا ہے۔ یہاں کسی مریض کو بیمار، ملازم، یا مریض کہہ کر نہیں پکارا جاتا۔ یہاں ڈاکٹر سے لے کر، مریضوں اور ملازموں تک، سب کو ممبرز ہی پکارا جاتا ہے تاکہ کسی قسم کا احساسِ کمتری یا برتری جنم نہ لے سکے۔

لواحقین اپنے عزیزوں کو لینے نہیں آتے

فاؤنٹین ہاؤس کے ایچ آر ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ اور ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ کی شریک حیات ڈاکٹر عائشہ عمران بھی اس کارِ خیر میں ان کے ساتھ برابر شامل ہیں۔ ڈاکٹر عائشہ نے مجھے بتایا کہ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے جب کوئی مریض پوری طرح سے ٹھیک ہو کر اور معاشرے میں

www.urdugem.com

دوبارہ شامل ہو کر ایک نئی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے تب بھی لواحقین انھیں لینے نہیں آتے۔ صحتمند ہو جانے والا ممبر اپنے پیاروں کی راہ تکتے تکتے مایوس ہو جاتا اور روز پوچھتا ہے کہ مجھے کوئی لینے کیوں نہیں آتا؟ ایسے مریضوں کا اسپتال کے ''لانگ ٹرم'' بلاک میں رکھا جاتا ہے جہاں وہ سوائے آہیں بھرنے، انتظار کرنے اور سسکیاں بھرنے کے، اور کچھ نہیں کر پاتے۔

ڈاکٹر عائشہ نے ایک افسوسناک واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ ایک خاتون جو مسلسل علاج اور دیکھ بھال کی وجہ سے مکمل طور پر صحتیاب ہو چکی تھیں، وہ روز اپنے بیٹے کے انتظار میں سینٹر کے باہر بنے بس سٹاپ پر جا کر کھڑی ہو جایا کرتیں۔ وہ اپنے ساتھ جانے والے اٹینڈنٹ سے آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا کرتیں کہ میرا بیٹا مجھے لینے کب آئے گا؟ ان کا بیٹا جو پہلے دن انھیں ہمارے پاس چھوڑ گیا تھا لوٹ کے کبھی نہ آیا اور وہ خاتون اس کے انتظار میں ہی چل بسیں۔

ڈاکٹر عائشہ نے کہا کہ جب ایک مریض ٹھیک ہو جانے کے بعد جب دوبارہ اس حالت کو پہنچ جائے تو وہ پہلے سے زیادہ خطرناک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر اس کا ٹھیک ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ پھر آخری دم تک ٹھیک نہیں ہوتے اور ان پر کوئی دوا یا ٹریٹمنٹ اثر نہیں کرتا۔

ایڈکشن ڈیپارٹمنٹ، فاؤنٹین ہاؤس کا پراجیکٹ

فاؤنٹین ہاؤس میں ایک شعبہ ایڈکشن یعنی نشے کے عادی مریضوں کا بھی ہے۔ یہاں زیادہ تر وہ مریض زیر علاج ہیں جو کسی نہ کسی نشے کا شکار ہو کر اپنی زندگی تباہ کر بیٹھتے ہیں۔ میری ملاقات وہاں زیادہ ان ممبران سے ہوئی جو چرس، ہیروئن وغیرہ کے نشے میں خود کو ڈبو کر تہی دامن ہو چکے تھے۔ وہاں زیر علاج ایک نوجوان جس کی عمر بمشکل ۲۴ یا ۲۵ سال تھی، نے کہا کہ اسے بہت پچھتاوا ہے اس نے اپنا جما جمایا کاروبار، گاڑی اور گھر والوں کی محبت سب اس نشے کے چکر میں گنوا دیا۔ محمد اطہر نامی اس نوجوان نے درخواست کی کہ اردو ڈائجسٹ کے توسط سے یہ بات ہر نوجوان تک پہنچائی جائے کہ نشے جیسی موذی بیماری زندگی برباد کرنے اور پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انسان کہیں کا نہیں رہتا۔

ایک بزرگ بھی وہاں موجود تھے۔ جب ان سے میں پوچھا کہ اس عمر میں وہ یہاں کس ایڈکشن کے تحت زیر علاج ہیں تو انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے غصے کی عادت پر قابو نہ پانے اور شدت کی وجہ سے یہاں زیر علاج ہیں۔

ادویہ کے علاوہ دیگر طریقۂ علاج

فاؤنٹین ہاؤس میں ممبر (مریضوں) کو نماز، تلاوت، سیر و تفریح، میوزیکل تھراپی، کونسلنگ کے ساتھ ساتھ تخلیقی کاموں میں ان کا دل بہلانے، اور محبت اور تحفظ کا احساس دے کر ٹھیک کیا جاتا ہے۔ کیونکہ صرف دوا ہی کافی نہیں۔ ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ مریض کو بعض اوقات دوا دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، وہ محبت کے چند بول اور اپنائیت پا کر ہی بہتری کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ یہی محبت، توجہ اور اپنائیت اگر انھیں گھر پر ملے تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض کبھی بڑھنے نا پائے۔

عزت نفس کی بحالی کیونکر ممکن ہو؟

ایک سب سے اہم نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ جو مریض مکمل طور پر صحت مند ہو کر واپس اپنی زندگیوں میں لوٹ جاتے ہیں انھیں پھر کیسے باعزت اور معزز فرد کا درجہ دلوایا جائے۔ مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر فیاض ہرل اس سلسلے میں راہنمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسے افراد جو سینٹرز سے بالکل صحت یاب ہو کر واپس گھروں کو خوشی خوشی جاتے ہیں ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جاتا جو ایک عام شہری کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یعنی جو رویے اسے ذہنی عوارض کے عروج تک پہنچانے کا باعث بنے تھے وہی رویے اب مکمل ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ وہ جہاں جاتا ہے ''یہ تو پاگل تھا'' جیسے الفاظ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس کی عزت نفس کو قدم قدم پر کچلا جاتا ہے۔ وہ ''اپنوں'' کو یقین دلاتے تھک جاتا ہے کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکا اور نارمل انسانوں کی طرح جینا چاہتا ہے۔ ایسی صورتحال بعض اوقات اسے پہلے سے زیادہ توڑ پھوڑ کا شکار بنا دیتی ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ اسے اس چیز کا قطعاً احساس نہ دلایا جائے کہ پہلے وہ ''کیا'' تھا۔ اس کی عزت و تکریم ویسے ہی کی جائے جس کا وہ حقدار ہے۔

فاؤنٹین ہاؤس اسی عزت نفس کو مدنظر رکھتے ہوئے ان مریضوں کو، جو ہر طرح سے صحتیاب ہو جاتے ہیں، اسی سینٹر میں ملازمت دے کر انھیں باوقار بناتا ہے۔ بیشتر مریض ٹھیک ہونے کے بعد جب خوشی خوشی باہر جاتے ہیں، تو رویوں کی بدصورتی ان سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ پھر دوبارہ اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے ''گھر'' واپس آجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ فاؤنٹین ہاؤس صرف ایک سینٹر یا اسپتال ہی نہیں بلکہ اُن سب کا گھر بھی ہے۔ یہاں انھیں ان کے رجحان اور قابلیت کی بنا پر معقول ملازمت دی جاتی ہے اور وہ اپنے ہی جیسوں کی مدد کر کے بہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس یہ ادارہ کرواتا ہے کہ وہ کل بھی اہم تھے، آج بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے
''دماغی کارکردگی کم کرنے والی دس عادات''
کے بارے میں پڑھیں
صفحہ نمبر ۱۴۷ پر

اسپتال کا ایڈکشن ڈیپارٹمنٹ اور ممبرز

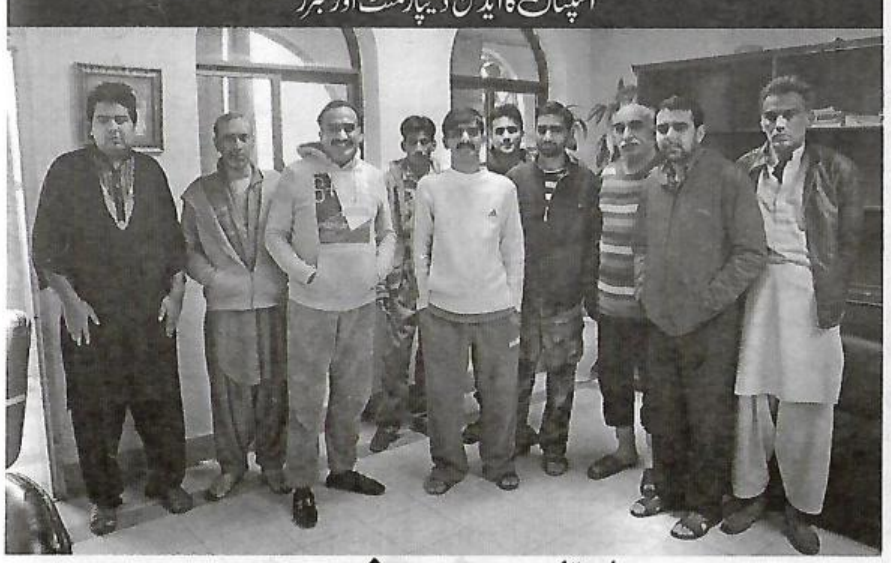

www.urdugem.com

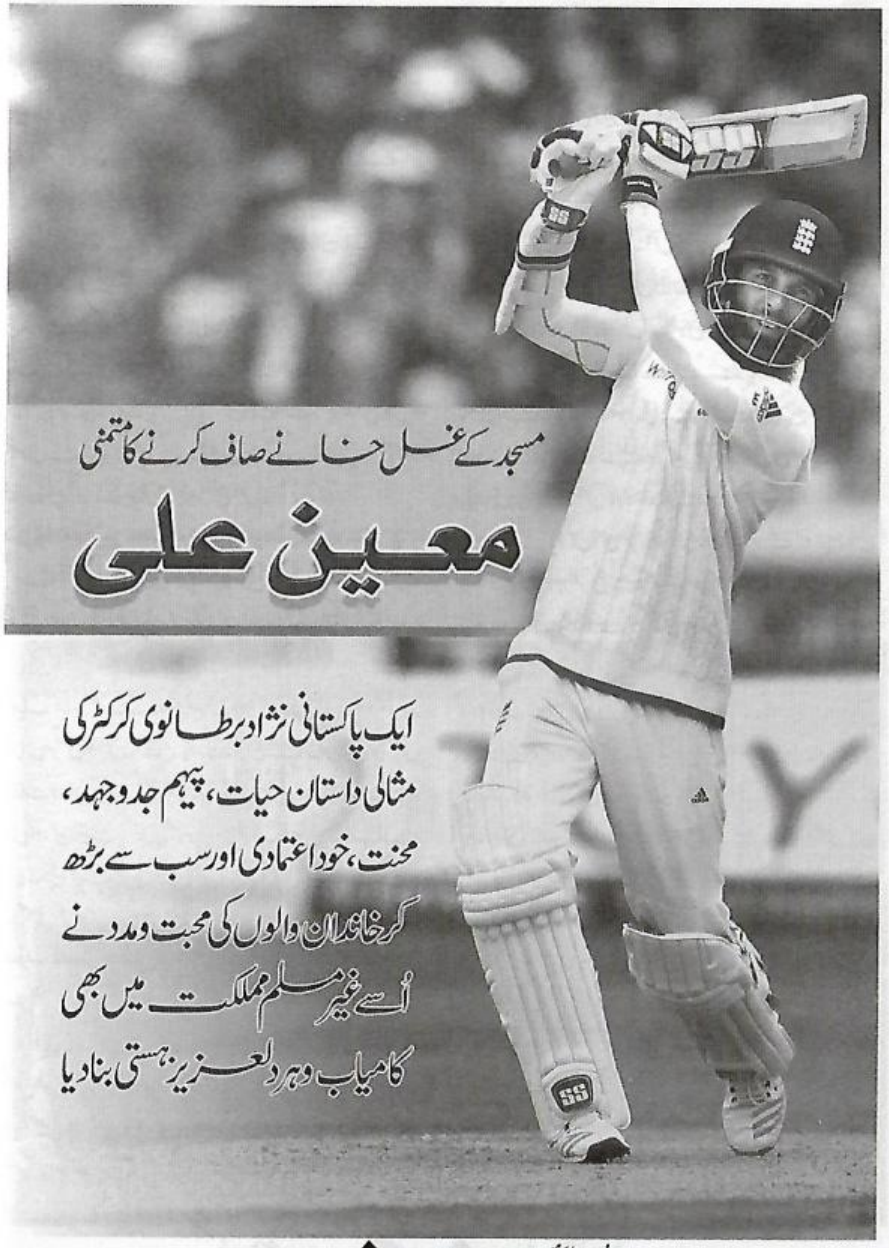

مسجد کے غسل خانے صاف کرنے کا متمنی

معین علی

ایک پاکستانی نژاد برطانوی کرکٹر کی مثالی داستان حیات، پیہم جدوجہد، محنت، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر خاندان والوں کی محبت و مدد نے اُسے غیر مسلم مملکت میں بھی کامیاب و ہردلعزیز ہستی بنا دیا

سیّد عاصم محمود

یہ ۲۰۱۴ء کی بات ہے، جب ایک خبر سے علم ہوا کہ برطانیہ کی قومی کرکٹ ٹیم میں ایک پاکستانی نژاد آل راؤنڈر بھی شامل ہوئے ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً معین علی کی عمدہ کارکردگی کے بارے میں علم ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے ایک منفرد ریکارڈ قائم کر کے خصوصاً برطانیہ میں مقیم تمام پاکستانیوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔

برطانیہ کی طویل کرکٹ تاریخ میں معین علی پہلے آل راؤنڈر ہیں جنھوں نے سب سے کم ٹیسٹ میچوں میں دو ہزار رنز مکمل کیے اور ایک سو وکٹیں لیں۔ کرکٹ کی جنم بھومی ملک میں معین نے یہ کارنامہ صرف ۳۸ ٹیسٹوں میں انجام دیا۔ یہ کارنامہ دکھاتے ہوئے انھوں نے گیری سوبرز، جیکو اس کیلس، عمران خان، کپیل دیو، آئن بوتھم اور رچرڈ ہیڈلی جیسے نامی گرامی آل راؤنڈروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

معین علی کی داستان حیات حیران کن ہے اور شخصیت بے مثال۔ وہ منکسر المزاج اور امن پسند انسان ہیں لیکن انھیں بچپن سے لے کر جوانی تک نفرت کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ ایک بار تو ان پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا اور وہ مرتے مرتے بچے۔ ان کی داستان زندگی دراصل ایک خاندان کی کہانی ہے...... یہ محنت، پیہم جدوجہد، قربانی، اتحاد اور انسانیت کی کتھا ہے جس میں ہم سب کے لیے کئی قیمتی سبق موجود ہیں۔

کھیلوں کی دنیا ہو یا شوبز ورلڈ، کسی کھلاڑی یا فن کار کو شہرت، دولت و عزت مل جائے، تو پھر وہ آخری سانس تک ان دنیاوی تحفوں سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے کئی کھلاڑی ریٹائرمنٹ کے بعد کوچ بن جاتے یا ٹی وی پر تبصرے کرنے لگتے ہیں۔ بوڑھے فن کار بھی موقع ڈھونڈتے ہیں کہ خود کو میڈیا میں نمایاں کر سکیں۔ معین علی کو بھی اللہ تعالیٰ نے شہرت، دولت اور عزت کے دنیاوی تحائف عطا فرمائے مگر یہ عجیب انسان کہ انھیں ان کی کوئی پروا نہیں۔

اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ معین کے نزدیک بعد از ریٹائرمنٹ پسندیدہ ترین کام یہ ہو گا کہ وہ مقامی مسجد کے غسل خانے صاف کرتے رہیں۔ گزر اوقات کی خاطر وہ چھوٹا موٹا ریستوران کھولنا چاہتے ہیں جہاں صرف حلال غذا فروخت ہو گی۔

ڈھڈیال سے برمنگھم تک

معین علی کی غیر معمولی شخصیت کو آپ اس وقت بہتر سمجھ سکتے ہیں جب ان کے والد، منیر علی کے حالات زندگی سے واقف ہو جائیں۔ منیر کے والد کا تعلق آزاد کشمیر کے علاقے ڈھڈیال سے تھا۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے وہ بہتر مستقبل کی چاہ میں انگلستان پہنچ گئے۔

انھوں نے برمنگھم شہر کو مسکن بنایا جہاں بڑی تعداد میں پاکستانی آباد تھے۔ وہیں بیٹی نامی ایک لڑکی اس خوبصورت کشمیری سے محبت کرنے لگی۔ دونوں جلد ہی بیاہ کے بندھن میں بندھ گئے لیکن جب ۱۹۵۵ء میں منیر علی پیدا ہوئے، تو کچھ عرصے بعد میاں بیوی میں رنجش پیدا ہو گئی۔ چناں چہ منیر علی بچے ہی تھے کہ والد انھیں ڈھڈیال لے گئے۔ ان کا بچپن وہیں گزرا۔

منیر علی گیارہ سال کے تھے کہ وہ مع والد پھر لندن پہنچے۔ کئی دن والد کو کام نہیں ملا۔ پیسے کی شدید قلت تھی، اسی لیے انھیں شراکت داری میں ایک فلیٹ پر رہنا پڑا۔ اس فلیٹ میں ان سمیت چار خاندان مقیم تھے۔ آخر والد کو محنت مزدوری کا کام مل گیا۔ یوں لندن میں باپ بیٹے کی زندگیوں کے نئے باب کا آغاز ہوا۔

جب منیر علی اسکول میں داخل ہوئے، تو انھیں انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا تھا۔ اسی لیے انھیں انگریز بچوں کے

www.urdugem.com

استہزائیہ کلمات کا نشانہ بننا پڑا۔ جب وہ اگلی جماعت میں پہنچے، تو متعصب گورے بچوں نے ان سے تضحیک آمیز رویّے کا بھی مظاہرہ کیا۔ اس ماحول نے منیر علی پر اتنے منفی اثرات ڈالے کہ وہ نہایت شرمیلے لڑکے بن گئے۔ حتیٰ کہ ہولتے ہوئے اٹکنے لگے۔

منیر علی کم عمر ہی تھے کہ ان کے والدین میں علیحدگی ہو گئی۔ والد نے پھر انھیں ایک بھائی کے سپرد کر دیا جو لندن ہی میں مقیم اور زیادہ خوشحال تھے۔ یوں منیر علی ماں باپ کی شفقت اور محبت بھی صحیح طرح نہ پا سکے۔ مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود منیر نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پیسے کی کمی بڑی رکاوٹ تھی۔ بعض اوقات ان کے پاس کھانا خریدنے کے لیے بھی رقم نہ ہوتی۔ چناں چہ وہ کسی خیراتی ادارے میں جا کر مفت تقسیم ہوتے کھانے سے پیٹ بھر لیتے۔

دشواریوں کے باوجود منیر علی نے حوصلہ نہ ہارا اور تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آخر ایک دن سائیکرسٹ نرس بن گئے۔ یہ نرس نفسیاتی امراض کا علاج کرنے والوں ڈاکٹروں کی مدد کرتے ہیں۔ جلد انھیں ایک اسپتال میں ملازمت مل گئی اور یوں عملی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ جب معقول رقم جمع ہوئی، تو منیر علی نے برمنگھم کے ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی۔

اس وقت انھوں نے اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا.....

یہ کہ جب ان کے بچے پیدا ہوئے، تو وہ انھیں پوری محبت، شفقت اور توجہ دیں گے جو منیر علی کو نہیں مل سکی تھی۔ بہ حیثیت باپ منیر کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ انھیں نوجوانی تک جن کٹھن مشکلات سے گزرنا پڑا، بچے ان سے نبرد آزما ہوتے ہوئے خوار نہ ہوں۔

کرکٹ کی آغوش میں

منیر علی اپنے وعدے پر ثابت قدم رہے۔ کرکٹ کی آغوش میں ان کے ہاں چار صحت مند بچوں نے جنم لیا۔ والدین نے شروع سے ان کی تربیت و تعلیم پر توجہ دی، انھیں اسلامی اقدار سے روشناس کروایا اور خاندان سے محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ آج اپنے بچوں کی کامیابیاں دیکھ

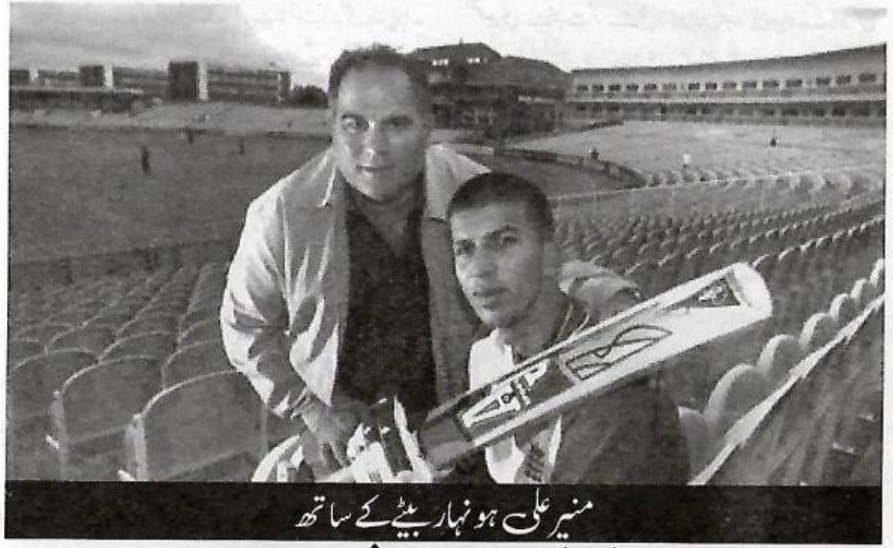

منیر علی ہونہار بیٹے کے ساتھ

کر منیر علی فخر و خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور خود کو نیک بخت انسان سمجھتے ہیں۔

لیکن منیر اور ان کے بچوں کو کامیابیاں پلیٹ میں رکھی نہیں ملیں، خاص طور پر انھیں پانے کی خاطر باپ کو قربانیاں دینا پڑیں۔ چار بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے منیر علی مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرنے لگے تاکہ زیادہ رقم کما سکیں۔ انھوں نے دو ملازمتیں کر لیں۔ افسوس، کام کا دباؤ وہ سہار نہ سکے اور منیر علی پر فالج گر پڑا۔ وہ وقت اہل خانہ کے لیے بہت کڑا اور سخت تھا۔

بیگم کے علاوہ بچوں نے بھی تندہی سے باپ کی تیمارداری کی اور وہ کسی حد تک صحت یاب ہو گئے۔ بیماری نے منیر علی کو ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔ وہ بتاتے ہیں، ''اس زمانے میں اکثر راتوں میں میری نیند کھل جاتی۔ میں سوچا کرتا کہ کہیں میری وجہ سے میرے بچے ناکام نہ ہو جائیں۔ میں کسی بھی قیمت پر انھیں نامراد و مایوس نہیں دیکھنا چاہتا تھا''۔

منیر علی اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتے تھے اور رب کائنات اپنے بندوں کو مصیبت میں کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ منیر علی کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ کرکٹ ان کا محبوب کھیل تھا۔ جب کبھی وہ کرکٹ میچ دیکھتے، تو اپنی تمام پریشانیاں بھول جاتے اور کھیل سے خوب لطف اٹھاتے۔ تب کرکٹ ان کی زندگی میں خوشی کے چند لمحات پیدا کرنے کا سبب بن جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے منیر علی کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ اپنے تینوں بیٹوں کو کرکٹ کھیلنا سکھائیں۔ یہ کھیل انھیں عزت، دولت اور شہرت کے ارضی تحائف سے نواز سکتا تھا۔ چناں چہ منیر علی نے نرس کی ملازمت چھوڑ کر ایک جز وقتی نوکری کر لی۔ وہ چار گھنٹے کام کرتے پھر گھر آ جاتے۔ سہ پہر کو وہ گھر کے پچھواڑے تینوں بیٹوں..... قدیر، معین اور عمر کو

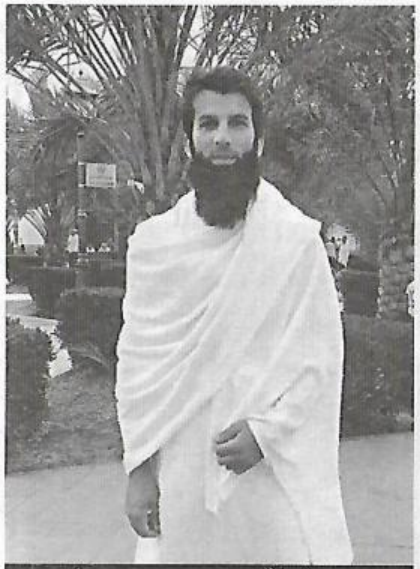

جب حج کی عظیم سعادت نصیب ہوئی

کرکٹ سکھلانے لگتے۔ ان کا چوتھا بچہ ایک بیٹی ہے۔

محنت رنگ لائی

معین علی ۱۸ جون ۱۹۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ دس سال کے تھے، تو والد سے کرکٹ کھیلنا سیکھنے لگے۔ وہ یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں، ''جز وقتی ملازمت کے باعث اکثر گھر میں پیسے کم پڑ جاتے۔ امّی ابو دیکھ بھال کر رقم خرچ کرتے مگر ابو اپنے بچوں کی ترقی کے لیے کہیں نہ کہیں سے رقم کا بندوبست کر ہی لیتے۔ میرے والدین نے ہم بچوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں مگر میں آج تک نہیں جان پایا کہ امی ابا پیسوں کا بندوبست کیسے کر لیتے تھے۔''

منیر علی کی جدوجہد اور تینوں بیٹوں کی محنت و لگن رنگ لائی اور آج وہ ایک کامیاب و خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ کرکٹ کی نامی گرامی مقامی ٹیموں نے انھیں اپنے ہاں جگہ

www.urdugem.com

دی۔ قدیر نے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلی۔ عمر بھی لسٹ اے کرکٹ کے میچ کھیلتا ہے۔ یہ فرسٹ کلاس کرکٹ سے کچھ نچلے درجے کی کرکٹ ہے۔ منجھلے بھائی، معین علی سب سے زیادہ کامران رہے اور اپنی شاندار کارکردگی سے دنیا بھر میں اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کردیا۔

جب معین علی نے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے کا آغاز کیا، تو انھیں معقول آمدن ہونے لگی۔ جب اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی تو معین نے ایک قیمتی کار خریدی اور والد کو تحفے دے ڈالی۔ وہ کہتے ہیں ''یہ کار تو نہایت معمولی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے والدین کے احسانات کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکتا''۔

منیر علی بیٹے سے ملے تحفے پر بہت فخر کرتے ہیں۔ اس کی خوبصورتی اور نفاست اپنی جگہ لیکن کار سے جو جذبات و احساسات وابستہ ہیں..... خاندان سے لگاؤ، بے غرضی، کامیابی، خلوص، عزت و احترام..... ان کا کوئی مول نہیں۔ منیر انکسار سے کہتے ہیں، ''میرے تینوں لڑکے بہت اچھے اور فرماں بردار ہیں۔ بیگم نے ان کی تعلیم و تربیت یقیناً عمدہ طریقے سے کی ہے''۔

جب قاتلانہ حملہ ہوا

بیٹوں میں اخلاقی خوبیوں نے اسی لیے جنم لیا کہ والد بھی ''جینٹل مین'' ہیں۔ معین علی کی زندگی میں صرف ایک ایسا موقع آیا جب انھوں نے والد کو شدید طیش کے عالم میں دیکھا۔ اس وقت معین کی عمر چودہ برس تھی۔ وہ اسکول سے واپس آرہے تھے اچانک کہ ایک کار ان پر چڑھ دوڑی۔ معین علی کی چھٹی حس نے انھیں خبردار کردیا اور وہ فوراً پرے ہوگئے ورنہ کار انھیں رگید ڈالتی۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھی اور دیوار سے ٹکرا کر رک گئی۔

اتفاق سے قریب ہی پولیس موجود تھی۔ اس نے فی الفور کار والے کو زیر حراست لے لیا۔ وہ کوئی سفید فام نہیں بلکہ ایشیائی مرد تھا۔ جب منیر علی کو حادثے کا علم ہوا، تو وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے۔ معین علی کی ٹانگ پر چوٹ آگئی تھی اور اس سے خون بہ رہا تھا۔

منیر علی نے سہمے معین کو لہو میں نہائے دیکھا، تو وہ آپے سے باہر ہوکر اس ایشیائی مرد کو مکے مارنے لگے۔ پولیس والوں نے بیچ بچاؤ کروا دیا ورنہ اس ایشیائی کی خوب دھنائی ہوجاتی۔ یوں موت معین علی کو موت چھوتے ہوئے گزر گئی۔ انھیں آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ ایشیائی مرد انھیں کیوں مارنا چاہتا تھا۔ شاید وہ معین علی کو سفید فام لڑکا سمجھا۔ لڑکپن میں وہ انگریزوں کی طرح گورے چٹے تھے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ کہ سبھی لڑکوں کے مانند معین بھی خاصے شرارتی اور لاابالی تھے۔ اسی لیے شروع میں انھوں نے کرکٹ کھیلنے پر توجہ مرکوز نہ کی۔ والد نے کچھ سختی کی تبھی معین راہِ راست پر آئے۔ وہ آج مسکراتے ہوئے کہتے ہیں، ''اگر مذہب اور کرکٹ..... یہ دونوں عناصر میری زندگی میں داخل نہ ہوتے، تو شاید میری زندگی کی سمت بھی متعین نہ ہوپاتی''۔

یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ میں مقیم بہت سے پاکستانیوں کی اولاد جوان ہوکر منشیات کی جانب راغب ہوجاتی ہے۔ بعض جرائم کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر کما حقہ توجہ نہیں دیتے۔ اگر معین کو بھی محبت بھرا گھریلو ماحول نہ ملتا اور والدین بچوں کی تربیت پر توجہ مرکوز نہ کرتے تو وہ بھی راہِ حق سے بھٹک سکتے تھے۔ اسی لیے وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔

''تم کچھ نہیں کرسکتے''

پیسے اور وسائل کی کمی کے باوجود شفیق باپ کی راہنمائی میں تینوں بیٹوں کا کھیل نکھرتا چلا گیا۔ منیر علی کرکٹ کا ساز و سامان ''سیکنڈ ہینڈ'' خرید کر لاتے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم

نہ تھی کہ نیا سامان خرید سکیں۔ چنانچہ بچوں کو پرانے سامان ہی سے کرکٹ سیکھنا پڑی۔

ایک مصیبت یہ آئی کہ بعض حاسد پاکستانی منیر علی اور ان کے بچوں کی حوصلہ شکنی کرنے لگے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ کرکٹ امراء کا کھیل ہے۔ وہ کبھی نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کھلاڑیوں کو اپنی صف میں نہیں آنے دیں گے، خصوصاً جب ان کا تعلق پاکستانی قوم سے ہے۔ (کئی امیر برطانوی پاکستانیوں کی تضحیک کرتے ہوئے انھیں ''پاکی'' کہتے ہیں)

اس تنقید میں دم تھا مگر منیر علی ثابت قدم رہے اور اپنے تینوں بیٹوں کو کرکٹ کھیلنا سکھاتے رہے۔ جب بیٹے بڑے ہوئے، تو گھر کے قریب واقع سپارک ہل نامی پارک میں کرکٹ کھیلنے کی مشق کرنے لگے۔ وہاں چچا کے بیٹے بھی آجاتے۔ کہا جاتا ہے کہ چچا کو منیر علی سے بھی زیادہ اس کھیل سے عشق تھا۔ جب ان کے ہاں بیٹا، کبیر علی پیدا ہوا، تو کان میں اذان دینے کے بعد دوسرا عمل یہ اپنایا کہ انھوں نے بیٹے کے کھٹولے میں کرکٹ کی گیند رکھ دی۔

اسی طرح جب منیر علی کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی، تو وہ ایک مقامی کرکٹ کلب کی ٹیم میں شامل ہوکر میچ کھیل رہے تھے۔ غرض دونوں بھائیوں کے بیٹوں کو کرکٹ کے جرثومے وراثت میں ملے۔ یہی وجہ ہے، انھیں اس کھیل میں طاق ہوتے ہوئے خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ مسلسل مشق کی بدولت ہی خصوصاً معین علی کے کھیل میں نفاست و عمدگی آئی۔

برمنگھم میں گیارہ لاکھ چوبیس ہزار نفوس آباد ہیں۔ ان میں سے ۲۶٫۶ فیصد ایشیائی ہیں جن کی تعداد دو لاکھ بانوے ہزار بنتی ہے۔ ان ایشیائی باشندوں میں سے ۱۳٫۵ فیصد پاکستانی ہیں۔ جبکہ ۶ فیصد بھارتی، ۳ فیصد بنگلہ دیشی، ۱٫۲ فیصد چینی اور ۲٫۹ فیصد دیگر ایشیائی ہیں۔ گویا شہر میں پاکستانی ہی سب سے بڑا ایشیائی گروہ ہیں۔

پاکستانیوں کی بڑی تعداد برمنگھم کے تین علاقوں.....

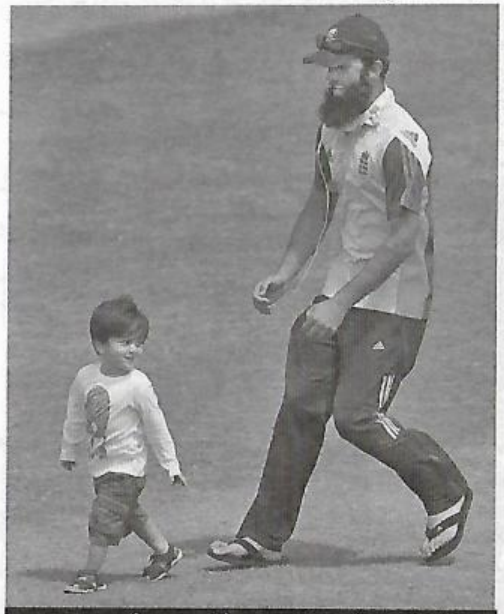

بیٹے کے ساتھ پدرانہ شفقت کا اظہار

سپارک بروک، سپارک ہل اور بلسال ہیتھ میں آباد ہے۔ ان علاقوں میں چلے جائیں، تو یہی لگتا ہے کہ کسی پاکستانی علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ جابجا پاکستانیوں کی دکانیں اور دفاتر نظر آتے ہیں۔ اسی لیے یہ علاقہ ''برطانوی پاکستانیوں کا دارالحکومت'' کہلاتا ہے۔ چونکہ علاقے میں کشمیریوں کے بہت سے ریستوران واقع ہیں لہٰذا اسے ''بلتی ٹرائی اینگل'' بھی کہا جاتا ہے۔

اسی علاقے میں معین علی نے بھائیوں اور کزنز کے ساتھ

www.urdugem.com

پرورش پائی اور وہ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے۔ پاکستانیوں کے علاوہ علاقے میں بھارتی، صومالی اور آئرش بھی آباد ہیں۔ یوں معین نے ایسے ماحول میں تربیت پائی جس کا خمیر متنوع تہذیب وثقافت کے خمیر میں گندھا ہوا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ معین علی روادار اور امن پسند بن گئے۔ وہ دیگر مذاہب اور نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کے نظریات وجذبات کا احترام کرتے ہیں۔ کسی سے اختلاف ہو، تو فوراً بھڑک کر مرنے مارنے پر نہیں اتر آتے۔

بلتی ٹرائی اینگل اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ وہاں متوسط طبقے کے شہری آباد ہیں۔ وہ کثیر دولت نہیں رکھتے اور بس اتنا کماتے ہیں کہ بھی روزمرہ اخراجات پورے ہو جائیں۔ ان کے بچوں کو بھی کھیلنے کا واجبی ساز وسامان ہی میسّر آتا ہے۔ لہٰذا یہ حیرت کی بات ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود بلتی ٹرائی اینگل نے معین علی جیسا بہترین آل راؤنڈر برطانوی قومی کرکٹ ٹیم کو عطا کر دیا۔

ایک عوامی کرکٹر

معین علی حقیقتاً خود پروردہ (سیلف میڈ) کھلاڑی ہیں۔ انھیں حکومت کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملی۔ بس ان کو والدین کی بھرپور مدد حاصل تھی اور انھوں نے بیٹوں کے جذبوں کو مہمیز بھی دے ڈالی۔ ان میں آگے بڑھنے کی تڑپ نے جنم لیا اور اس خواہش نے بھی کہ وہ کچھ کر کے دکھائیں اور خصوصاً اپنے والدین کے سر فخر وانبساط سے بلند کر دیں۔

خود پروردہ ہونے کے باعث ہی عالمی شہرت پا کر بھی معین علی انکسار وتواضع کا مرقع ہیں۔ ان میں وہ پھوں پھاں اور اکڑ پیدا نہیں ہوئی جو شہرت، عزت اور دولت پا کر اکثر مرد وزن میں جنم لیتی ہے۔ کسی ملک کا صدر ہو یا عام آدمی، معین ہر ایک سے یکساں سلوک کرتے اور پُرتپاک انداز میں ملتے ہیں۔

منکسر المزاج طبیعت کے باعث ہی معین "بلتی ٹرائی اینگل" میں بہت مقبول ہیں۔ ہندو ہو یا عیسائی، سبھی کو اپنے اس سپوت پر فخر ہے۔ معین علی بھی علاقے کے لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں اور کہیں سے نہیں لگتا کہ وہ ایک وی آئی پی شخصیت ہیں۔

معین علی خصوصاً کرکٹ کھیلنے والے بچوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ انھیں کھیلتا دیکھ کر انھیں اپنا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں، "جب میں نے شعور سنبھالا تو بھی کرکٹ میچ بصد شوق دیکھنے لگا۔ لڑکپن میں (سابق برطانوی کھلاڑی) مارکس ٹریسکو تھک میرا من پسند بلے باز تھا۔ شاید اس لیے کہ میری طرح وہ بھی "کھبو" تھا۔ جب کبھی باؤلروں کی دھنائی کرنے پر آتا، تو اس کا کھیل دیکھنے والا ہوتا۔ (پاکستانی کھلاڑی) سعید انور کے چوکے چھکے بھی مجھے خوب بھاتے۔ تب میں سوچا کرتا تھا کہ میں بھی ان کی طرح کھیلوں۔ آج شاید میرا کھیل دیکھ کر ہزارہا بچے یہی تمنا کرتے ہوں گے۔"

خاندان کا ساتھ اہم

معین علی مزید بتاتے ہیں "لڑکپن اور نوجوانی میں، میں جن لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلا ان میں اکثر باؤلنگ یا بلے بازی میں بڑے طاق تھے۔ وہ بھی میری طرح عمدہ کھلاڑی بن سکتے تھے مگر کئی گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ ان کے اور میرے درمیان فرق یہ ہے کہ مجھے اپنے خاندان کی بھرپور مدد حاصل تھی۔ جب کبھی میں پریشان یا مایوس ہوتا، تو امی ابا میری ہمت بندھاتے"۔ والدین کی سعی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو یہ اہم سبق ضرور دیں کہ ہمیشہ مثبت سوچ کا دامن تھامے رکھیں اور منفی سوچوں کو اپنے اُوپر حاوی نہ ہونے دیں۔

مثبت طرزِ فکر کے باعث ہی معین علی نسل پرستی نہیں انسانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں، "ایک بار ایک دس سالہ پاکستانی نژاد بچہ میرے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا کوئی ایسا کلب ہے جہاں مجھے نسل پرستی کا سامان نہیں کرنا پڑے؟ میں نے بتایا کہ بیٹا، اگر تم خود نسل پرست ہو، تو تمھیں ہر کلب میں اس آفت سے پالا پڑے گا"۔

معین علی کا خیال ہے کہ ناکام لوگ نسل پرستی اور مذہب کو اپنی ناکامی کا ذمے دار ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ جو لوگ محنت کریں، اپنی منفی صلاحیتوں کو کام میں لائیں، انھیں قطعاً ضرورت نہیں ہوتی کہ اپنی ناکامیوں کے لیے کسی چیز کو قربانی کا بکرا بنالیں۔ معین یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ والدین ہیں جو بچے کی شخصیت میں منفی پن پیدا کرتے ہیں اور وہ اس کے کردار کا حصّہ بن جاتا ہے۔

فتح سے سرشار ایک انمول لمحہ

یہ مثبت سوچ ہی ہے جس نے معین علی کو با اعتماد بنا دیا۔ وہ محض چودہ سال کے تھے کہ ۲۰۰۱ء میں انھیں برطانیہ کی انڈر ۱۵ ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ انھوں نے پانچ میچ کھیل کر چار سو رنز بنائے۔ اس میں سنچریاں بھی شامل تھیں۔

۲۰۰۴ء ہی میں وارویک شائر کاؤنٹی کی کرکٹ ٹیم ابھرتے نوجوان کھلاڑیوں کو کھوجنے لگی۔ معین علی نے بھی آزمائشی مقابلوں میں حصّہ لیا اور عمدہ کارکردگی دکھائی۔ کاؤنٹی کے کارپردازوں کو ان کا کھیل پسند آیا، چنانچہ وہ اس کی کرکٹ ٹیم کا حصّہ بن گئے۔

مئی ۲۰۰۵ء میں معین نے کیمبرج یونیورسٹی کے خلاف اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا اور اس میں نصف سنچری بنائی۔ تاہم وارویک شائر ٹیم انھیں پسند نہیں آئی۔ اسی لیے ایک سال بعد معین ووسٹر شائر کاؤنٹی کرکٹ ٹیم کا حصّہ بن گئے۔ وہاں معین کا دل لگ گیا اور اس کی ایک بڑی وجہ وہاں روادار انتظامیہ کی موجودگی ہے۔

من پسند کاؤنٹی مل گئی

اس زمانے میں کاؤنٹی ٹیم کے کھلاڑی شراب بنانے والی ایک کمپنی کے لوگو پر مشتمل قمیص پہنتے تھے۔ معین علی نے وہ قمیص پہننے سے انکار کر دیا۔ تب کاؤنٹی انتظامیہ نے ان کے لیے ایسی خصوصی قمیص تیار کروائی جس میں شراب بنانے والی کمپنی کا لوگو ثبت نہ تھا۔

ووسٹر شائر کی ٹیم میں شامل سبھی کھلاڑیوں نے خندہ پیشانی سے نوجوان اور مسلم معین علی کا استقبال کیا۔ ان میں سب سے نمایاں گریم ہک تھا جو ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۱ء برطانیہ کی قومی کرکٹ ٹیم کا اہم رکن رہا اور ۲۰۰۸ء تک فرسٹ کلاس

www.urdugem.com

میچ کھیلتا رہا۔ ایک دن گریم ہک نے دیکھا کہ معین ڈریسنگ روم میں نماز پڑھنے کی جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ گریم ہک نے کچھ فرنیچر اِدھر اُدھر کیا اور معین کو جگہ فراہم کر دی۔ ظاہر ہے، معین اپنے ساتھی کے جذبۂ ہمدردی سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کا کہنا ہے، ''لوگ گریم ہک کو بہترین کھلاڑی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ ایک عظیم انسان بھی ہے''۔

ووسٹر شائر کی جانب سے کھیلتے ہوئے معین علی نے عمدہ کارکردگی دکھائی۔ وہ اب تک فرسٹ کلاس کرکٹ میں ۱۷۸ میچ کھیل کر دس ہزار سے زائد رنز بنا چکے۔ سنچریوں کی تعداد ۱۹ ہے۔ معین برطانیہ کی انڈر ۱۹ قومی ٹیم کا حصّہ بھی بنے۔ جب وہ اکیس سال کے تھے، تو انڈر ۱۹ ٹیم نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا۔ یہ دورہ معین کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر گیا۔

ہوا یہ کہ بنگلہ دیش میں معین کی ملاقات سلہٹ سے آئی ایک لڑکی سے ہوئی۔ دورانِ گفتگو دونوں پر منکشف ہوا کہ وہ کئی امور میں یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چناں چہ وہ رفتہ رفتہ قریب آ گئے۔ اپنے رشتے کو مضبوط بنانے کی خاطر انھوں نے شادی کر لی۔ آج وہ ایک پیارے سے بیٹے، ابوبکر علی کے فخر مند والدین ہیں۔ ماں باپ اپنے راج دلارے کو عالم دین بنانا چاہتے ہیں۔

تعصب آ ہی گیا

معین علی بنیادی طور پر بلّے باز ہیں مگر ووسٹر شائر میں انھیں باؤلنگ کروانے کا بھی موقع ملا۔ یہ اس کلب کی خصوصیت ہے کہ کوچ سبھی کھلاڑیوں کو کھل کر کھیلنے کا موقع دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی مخفی صلاحیتیں دریافت کر سکیں۔ چناں چہ معین رفتہ رفتہ اسپن باؤلنگ بھی اچھی خاصی کروانے لگے۔ اس طرح وہ ایک آل راؤنڈر کے روپ میں سامنے آئے۔

حیرت انگیز بات یہ کہ فرسٹ کلاس کرکٹ میں عمدہ کھیل دکھانے کے باوجود معین علی کو برطانیہ کرکٹ بورڈ نے طویل عرصہ گھاس نہیں ڈالی۔ معلوم نہیں، انھیں ایشیائی نژاد سمجھ کر نظر انداز کیا گیا یا پھر راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی وجہ سے معین تعصب کا نشانہ بن گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ برطانوی کرکٹ بورڈ میں لارڈ بیٹھے ہیں جو غیر انگریزوں کو قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہوتا دیکھ کر زیادہ خوش نہیں ہوتے۔

عام طور پر انیس بیس سال کے لڑکے اچھی کرکٹ دکھائیں، تو انھیں قومی کرکٹ ٹیموں میں کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر معین کی عمر ۲۶ سال ہو گئی، انھیں برطانوی کرکٹ بورڈ نے کوئی دعوت نہ دی۔ اس صورت حال سے معین بہت دل برداشتہ ہوئے اور کرکٹ کو خیرباد کہنے کا سوچنے لگے۔ وہ اب گزر اوقات کی خاطر کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتے تھے۔

جب منیر علی کو بیٹے کے ارادے کا علم ہوا، تو علم نفسیات میں ان کا تجربہ کام آیا۔ انھوں نے بیٹے کی ہمت بندھائی اور معین کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں! والد کی باتوں نے بیٹے کو مایوسی و پژمردگی کی دلدل سے نکال دیا۔

والدین، بہن بھائیوں اور نیک خواہشات رکھنے والے دوست احباب کی دعائیں رنگ لائیں اور فروری ۲۰۱۴ء میں معین کو ایک روزہ عالمی کرکٹ کھیلنے والی برطانوی قومی کرکٹ ٹیم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یوں والد اور بیٹے کی محنت ٹھکانے لگی اور معین کی زندگی کے ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز ہو گیا۔

پہلے بین الاقوامی میچ ہی میں معین علی نے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ یہ میچ ویسٹ انڈین ٹیم کے خلاف تھا جس میں براوو، اسمتھ اور پاول جیسے مشہور کھلاڑی شامل تھے۔ معین نے باؤلنگ کروا کر ایک وکٹ لی جبکہ ۴۴ رنز بنائے۔

اس کے بعد معین نے جون ۲۰۱۴ء میں اپنا پہلا ٹیسٹ کھیلا اور یوں وہ عالمی دنیائے کرکٹ میں داخل ہو گئے۔ اب تک وہ گیند اور بلے، دونوں سے اپنی صلاحیتوں کے کمال دکھا چکے۔ معین ۴۹ ٹیسٹ کھیل کر ۲۴۶۷ رنز بنا چکے۔

انھوں نے پانچ سنچریاں اور بارہ نصف سنچریاں بنائی ہیں جبکہ ایک روزہ کرکٹ میں انھوں نے ۶۸ مقابلوں میں حصّہ لیا اور ۹۵ء۱۳ رنز بنا چکے۔

پاکستانی باؤلر اور نو مسلم سے ٹاکرا

جیسا کہ بتایا گیا، معین علی بنیادی طور پر بلے باز تھے مگر جب وہ قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہوئے تو انھیں محسوس ہوا کہ انھیں عمدہ باؤلنگ بھی کروانی چاہیے۔ اس طرح وہ ٹیم میں اپنی جگہ مستحکم کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اسپن باؤلنگ سیکھنے لگے۔

خوش قسمتی سے ۲۰۱۵ء میں ثقلین مشتاق اسپن باؤلنگ کے سلسلے میں برطانوی کرکٹ ٹیم کے کوچ بن گئے۔ ثقلین مشتاق نامور پاکستانی باؤلر رہے ہیں۔ انھیں ''امرا'' نامی گیند کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اب ثقلین اس نوجوان پاکستانی نژاد کھلاڑی کو اسپن باؤلنگ کے اسرار و رموز سکھانے لگے۔ قابل و تجربے کار استاد کی راہنمائی میں معین علی بھی عمدہ اسپنر بن گئے۔ آنے والے برسوں میں انھوں نے پھر اپنی باؤلنگ سے بھی برطانوی کرکٹ ٹیم کو میچ جیت کر دیے۔

یہ کرکٹ ہی ہے جس کے ذریعے معین علی نے صحیح معنوں میں دین اسلام کو دریافت کیا۔ اب اسلام ہی ان کی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا۔ ورنہ پہلے صرف کرکٹ ہی ان کی دلچسپی کا محور تھا۔ وہ بتاتے ہیں:

''میں نماز کبھی کبھی پڑھتا تھا مگر خاص طور پر بس یا ریل میں سفر کرتے ہوئے میں عجیب روحانی واردات سے گزرتا۔ راہ میں آنے والے حسین و جمیل قدرتی مناظر مجھے مسحور کر دیتے۔ میں سوچتا کہ یقیناً کسی عظیم ترین ہستی ہی نے یہ خوبصورت دنیا تخلیق کی ہے۔ تب مجھ میں اس ہستی کے بارے میں جاننے کی تڑپ اٹھتی مگر جب میں گھر پہنچتا، تو پھر دنیاوی مصروفیات میں منہمک ہو جاتا''۔

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ معین علی کو ویسٹ انڈیز میں بسنے والے ایک نو مسلم، ولی محمد نے اسلام سے روشناس کروایا۔ دراصل ولی محمد سینکڑوں کتب پڑھنے کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لیے وہ ایسے مغالطے دور کرنے میں مہارت رکھتے تھے جن کا شکار غیر مسلم ہی نہیں ہوتے بلکہ نوجوان مسلمان بھی الٹے سیدھے خیالات کی وجہ سے تشکیک زدہ ہو جاتے ہیں۔

معین علی بھی خاص طور پر دیارِ غیر میں رہنے کی وجہ سے اپنے دین کے متعلق شکوک و شبہات رکھتے تھے۔ جب ولی محمد سے ملاقات ہوئی تو مختلف شکوک زیرِ گفتگو آئے۔ نو مسلم ویسٹ انڈین نے بڑی تفصیل سے انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ یوں نوجوان معین کے ذہن پر چھائے شکوک کے سبھی بادل چھٹ گئے۔

اب معین کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ انھوں نے ڈاڑھی رکھ لی جو ان کا ''ٹریڈ مارک'' بن چکی۔ دوست احباب نے انھیں متنبہ کیا کہ برطانوی کرکٹ بورڈ میں بیٹھے تعصب پرست انگریز ڈاڑھی رکھنے پر برافروختہ ہو سکتے ہیں، مگر معین نے کوئی پروا نہیں کی۔ ڈاڑھی رکھ کر معین نے دراصل انگریزوں اور پوری مغربی دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اسلام اور مغرب کے مابین کوئی تصادم نہیں، بلکہ یہ قوتیں امن و آشتی سے ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔

مثبت شخصیت کا اثر

معین علی کی مثبت شخصیت نے عام انگریزوں پر خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ متعصب میڈیا کی وجہ سے وہ پاکستان اور اسلام کا تعلق دہشت گردی سے جوڑنے لگے تھے مگر معین علی نے کرکٹ میدان اور اس سے باہر بھی مثبت رویّوں کے ذریعے انگریزوں کو بتایا کہ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یوں معین علی کی مدد سے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کا تصوّر بہتر ہوا اور وہاں مفاہمت و یگانگت کی فضا نے جنم لیا۔ یہ معین کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

معین علی حقیقی مسلمان کی طرح سبھی مسلمانوں کی فلاح و

www.urdugem.com

یہود کے لیے سرگرم رہتے اور عملی قدم بھی اٹھاتے ہیں۔ جب اسرائیل نے غزہ پر حملہ کر کے مظلوم فلسطینیوں کو نشانہ بنایا تو معین علی نے دوران میچ فلسطینی بھائیوں سے اظہارِ یک جہتی کرتے ہوئے ایسے رسٹ بینڈز زیب تن کیے جن پر ''فلسطین بچاؤ'' اور ''فلسطین کو آزاد کرو'' کے نعرے درج تھے۔ یہ رسٹ بینڈ پہننے پر معین علی کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔

معین کی عمر ۳۱ سال ہو چکی۔ وہ ابھی مزید چار پانچ سال کرکٹ کھیل سکتے تھے۔ بہ حیثیت آل راؤنڈر ان کا کھیل نکھر رہا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد معین کے نزدیک دنیاوی کامیابی اور ناکامی بے معنی ہو چکی۔ وہ بس ایسی زندگی گزارنا اور ایسے عمل کرنا چاہتے ہیں جن کی بدولت انھیں اللہ پاک کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ چونکہ کرکٹ ان کا پیشہ ہے لہٰذا معین کی کوشش ہے کہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے مسلمانوں ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کی جائے۔

کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد معین علی کیا کریں گے؟ ان کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ مقامی مسجد میں مؤذن بن جائیں۔ وہ مسجد کے غسل خانے صاف کرتے ہوئے اپنا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ معین کہتے ہیں ''مجھے یہ کام سب سے زیادہ خوشی عطا کرے گا''۔

معین علی کی داستانِ حیات آشکارا کرتی ہے کہ وہ ایک سچے و پکے مسلمان ہیں۔ ایک مسلمان کو جس نیک راہ پر گامزن ہونا چاہیے، وہ اسی پر فخر و شان سے چل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے محبوب بندے کو دنیاوی کامیابیوں سے نواز دیا اور آخرت میں بھی ایک شاندار دائمی زندگی معین کی منتظر ہے۔ ◆◆◆

معین انگریز بچوں میں بہت مقبول ہیں

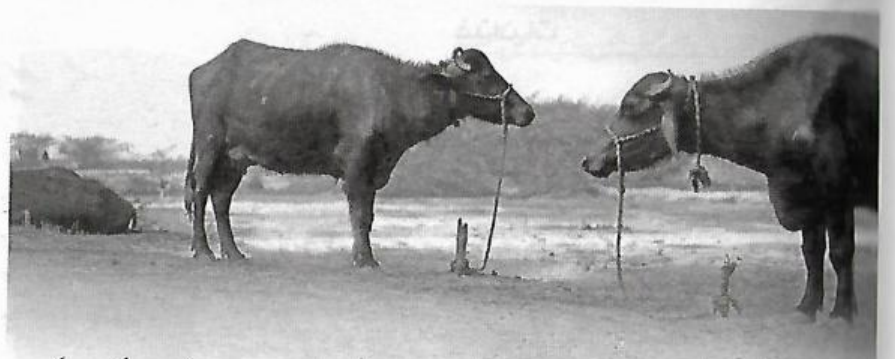

گلی کوچوں میں بِکنے والا

کیمیکل دودھ قاتل بن چکا

لالچ و ہوس کا شکار انسان کیمیائی مادّوں کی مدد سے ایسا زہریلا سفید مائع تیار کر رہے ہیں جو کروڑوں پاکستانی بچوں بڑوں کو رنگ برنگ بیماریوں میں مبتلا کرنے لگا ہے

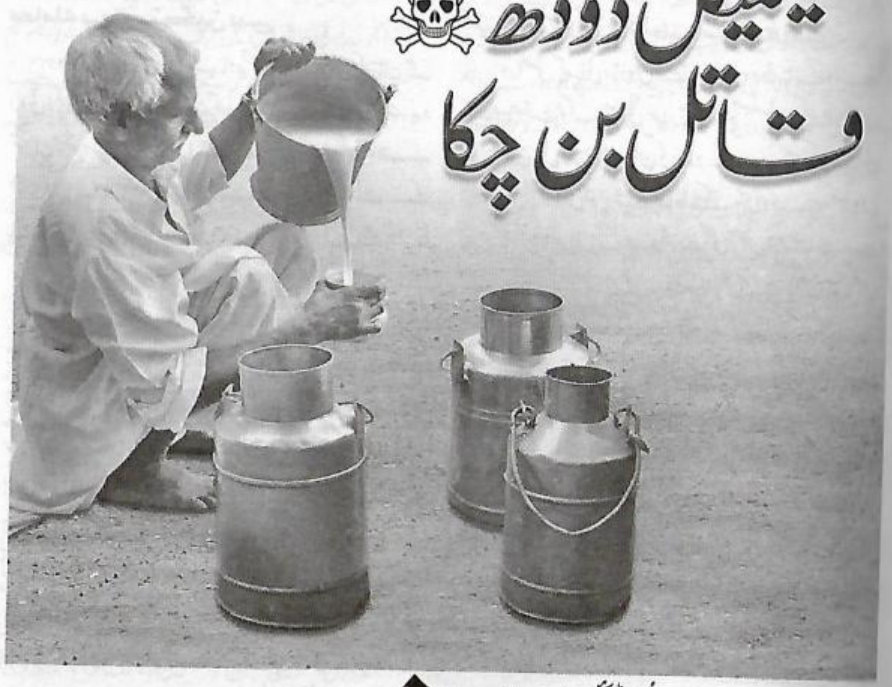

www.urdugem.com

عاصم محمود

یہ پچھلے سال کی بات ہے، میں لاہور کے علاقے، ٹاؤن شپ میں واقع ایک دکان سے روزانہ دودھ لینے لگا۔ دودھ گرم کرتے تو اُوپر بالائی کی تہ جم جاتی۔ یہ عمل خالص دودھ ہونے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میں بڑا خوش ہوا کہ ایسی دکان مل گئی جہاں سے خالص دودھ ملتا ہے، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ دودھ سے ویسی مہک نہ آتی جیسی پندرہ بیس سال قبل آیا کرتی تھی۔ یہ بات راقم کو حیران کر دیتی۔

ایک دن دودھ لینے گیا تو دیکھا کہ دودھ کی دکان بند ہے اور وہاں پولیس کھڑی ہے۔ حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا تو پتا چلا، دکان والا آلودہ دودھ فروخت کرتا تھا۔ یہ جان کر میں سمجھ گیا کہ دودھ سے کیوں خوشبو نہیں آتی تھی..... وہ کیمیائی مادوں سے تیار کردہ دودھ جو تھا۔

معاملہ بہت سنگین ہے

دودھ اللہ تعالیٰ کی ایک نادر نعمت ہے۔ پاکستان میں روٹی اگر ہم وطنوں کا من پسند کھاجا ہے، تو دودھ ہی پسندیدہ ترین مشروب بن چکا۔ اسے دہی، لسی اور دیگر مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ دودھ کی مانگ کے باعث ہی یہ لالچی اور پیسے کی ہوس کا شکار لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بھی بن گیا۔

مجھے یاد ہے، بیس سال قبل تک دودھ پچیس تیس روپے میں مل جاتا تھا اور وہ اچھا خاصا معیاری بھی ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ تب گوالے دودھ میں صرف پانی ملاتے تھے، جبکہ کچھ زیادہ رقم دینے پر خالص دودھ آسانی سے مل جاتا۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھی اور دودھ کی طلب میں اضافہ ہوا، تو یہ سفید مائع بھی مہنگا ہونے لگا۔ اس کی بڑھتی قیمت ہی نے انسانوں کے بھیس میں پھرتے بھیڑیوں کو دودھ کی جانب متوجہ کر دیا۔

دودھ کیلشیم کا خزانہ ہے۔ ایک پیالی دودھ کیلشیم کی روزانہ مقدار کا ۱۲ فیصد حصّہ پورا کرتا ہے۔ اسی میں پروٹین، پوٹاشیم، وٹامن بی۔ ۱۲ اور میگنیشیم بھی ملتا ہے۔ انسان روزانہ دو گلاس دودھ پی لے، تو اس کی اچھی غذائی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن آج کل خصوصاً عام پاکستانی کے لیے خالص دودھ پانا ایک کٹھن مرحلہ بن چکا۔

صوبہ پنجاب میں انسداد ملاوٹ کا سرکاری ادارہ وقتاً فوقتاً کیمیائی مادوں سے دودھ تیار کرنے والوں پر چھاپے مارتا رہتا ہے۔ وطن عزیز کی عدلیہ بھی وقفے وقفے سے ملاوٹی دودھ کا معاملہ اٹھاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل سپریم کورٹ نے قرار دیا تھا کہ ڈبے کا دودھ بنانے والی بعض کمپنیوں کی مصنوعات میں بھی کیمیائی مادوں کی ملاوٹ پائی گئی ہے۔ یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ معاملہ خاصا سنگین ہو چکا۔

دراصل کیمیائی مادوں سے زہریلا دودھ بنانے والے شیطان صفت لوگ انتہائی عیار ہیں۔ وہ مسلسل ایسے طریقوں کی کھوج میں رہتے ہیں جن کی مدد سے دودھ میں کیمیائی مادوں کی آمیزش کو پوشیدہ رکھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے، کمپنیوں اور سرکاری اداروں کے جدید آلات بھی بعض اوقات یہ نہیں جان پاتے کہ زیر تجربہ دودھ خالص ہے یا اس میں کسی چیز کی ملاوٹ ہو چکی۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں تین کروڑ گائے بیل، دو کروڑ اسی لاکھ بھینسیں، ساڑھے پانچ کروڑ بھیڑیں، ڈھائی کروڑ بکریاں اور دس لاکھ اونٹ و اونٹنیاں پائی جاتی ہیں۔ ملک بھر میں عموماً گائے بھینس کا دودھ استعمال ہوتا ہے مگر بڑھتی آبادی کے باعث ان مویشیوں کا دودھ نایاب اور مہنگا ہو رہا ہے۔ اسی عمل کو لالچی انسانوں نے کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔

اب پاکستان کے تمام بڑے شہروں مثلاً کراچی، لاہور، راولپنڈی، فیصل آباد، حیدر آباد وغیرہ میں ایسی دکانیں کھل چکیں جہاں دودھ سستے داموں فروخت ہوتا ہے۔ متوسط اور غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ عموماً وہیں سے دودھ خریدتے ہیں۔ مگر اس سستے مال میں دودھ نام کی شے بہت کم ہوتی ہے بلکہ وہ مختلف کیمیائی مادوں اور اشیا کا مرکب ہوتا ہے۔

کیمیائی مادّوں کی بھرمار

ان کیمیائی مادوں اور اشیا میں سے اکثر انسانی صحت کے لیے خطرناک ہیں۔ یہی وجہ ہے، ان سے بنا دودھ پی کر پاکستانی مختلف امراض کا شکار ہو رہے ہیں۔ چونکہ دودھ سمیت اکثر غذاؤں میں ملاوٹ معمول بن چکی لہٰذا یہ عیوب بھی سامنے آ چکا کہ اب اکیس بائیس سالہ نوجوان حملۂ قلب (ہارٹ اٹیک) کے باعث آناً فاناً چل بستے ہیں۔ گویا تندرست نوجوان بھی عجیب و غریب بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ خرابی ناقص غذاؤں کی پیدا کردہ ہے جو ہمارے اہم جسمانی اعضا مثلاً دل، جگر، گردوں، پھیپھڑوں وغیرہ کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔

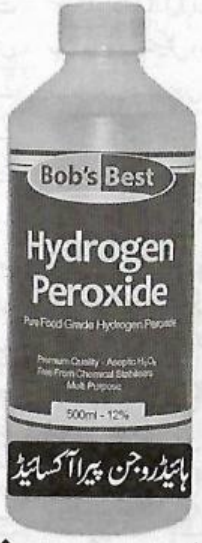

یہ زیادہ پرانی بات نہیں، صرف بیس سال پہلے تک دودھ میں صرف پانی کی ملاوٹ ہوتی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ دودھ کی مقدار بڑھ جائے اور زیادہ آمدن ہو سکے۔ تاہم یہ دودھ انسانی صحت کے لیے خطرناک نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ گوالے دودھ کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھنے کی خاطر اس میں جراثیم مارنے والے کیمیکل مثلاً ہائیڈروجن پیرا آکسائیڈ، فارملن، پنسلین، بال صفا پاؤڈر اور بورکس ملانے لگے۔

دراصل گوالوں کی اکثریت شہروں کے نواحی علاقوں میں آباد ہے۔ یہ گوالے عموماً علی الصبح مویشیوں سے دودھ نکالتے ہیں۔ یہ دودھ پھر چند گھنٹوں بعد شہروں کی طرف بھجوایا جاتا۔ کچے دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس میں درج بالا کیمیائی مادے ملائے جانے لگے۔

بعد ازاں گوالوں کو علم ہوا کہ ٹھنڈا دودھ دیر تک محفوظ رہتا اور اس میں جراثیم جنم نہیں لیتے۔ اب گوالے دودھ کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر اس میں برف، یوریا کھاد اور ایلومونیم سلفیٹ ملانے لگے۔ کچھ عرصے بعد کھانے کا سوڈا (بیکنگ سوڈا) اور کاسٹک سوڈا بھی دودھ میں ڈالا جانے لگا۔ یہ تیزاب بھی دودھ میں جراثیم پیدا نہیں ہونے دیتا۔

کیمیائی مادوں کی آمیزش سے نہ صرف دودھ تادیر محفوظ رہتا ہے بلکہ اس کی مقدار بھی بڑھ جاتی۔ یہی وجہ ہے، لالچی گوالوں نے بھی دودھ میں کیمیائی مادوں کی آمیزش کو معمول بنا لیا۔ اب صرف ایماندار اور خوف خدا رکھنے والے گوالے ہی خالص دودھ گاہکوں کو فراہم کرتے ہیں۔ ورنہ بے ایمان گوالوں کا دودھ مختلف کیمیائی مادوں سے پُر ہوتا ہے۔

آکسی ٹوسین ہارمون

سونے پہ سہاگہ، اب ہر گوالا چاہتا ہے کہ اس کی بھینس یا گائے زیادہ دودھ دے، چنانچہ دودھ کی افزائش کے لیے بھی مویشیوں کو کیمیکل دیے جاتے ہیں۔ ان کیمیائی مادوں میں آکسی ٹوسین (OXYTOCIN)

www.urdugem.com

ہارمون قابل ذکر ہے۔ اس ہارمون کے گائے بھینسوں کو ٹیکے لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ زیادہ دودھ دے سکیں مگر یہ انسانی صحت کے لیے خطرناک عمل ہے۔

آکسی ٹوسین والا دودھ پینے سے لڑکے لڑکیاں جلد بالغ ہوجاتے ہیں۔ لڑکیوں کو پندرہ سولہ سال کے بجائے دس سال کی عمر سے ماہواری آنے لگتی ہے۔ جبکہ لڑکوں میں سینہ بڑھ جاتا ہے۔ انسانی جسم میں اس ہارمون کی زیادتی سے انسان پر تھکن طاری رہتی ہے۔ جدید طبی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ اس ہارمون والے دودھ سے بچوں میں حس سماعت اور بینائی متاثر ہوتی ہے۔ جبکہ حاملہ خواتین میں اسقاط حمل ہوجاتا ہے۔ اگر بچے کی پیدائش کے بعد ماں میں اس ہارمون کی مقدار بڑھ جائے تو وہ جریان خون میں مبتلا ہوسکتی ہے۔

آکسی ٹوسین گائے بھینس کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ ہارمون دراصل مویشی کا رحم سکیڑ دیتا ہے اور تب اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جس مویشی کو یہ ہارمون باقاعدگی سے دیا جائے، وہ جلد بانجھ ہوجاتی ہے۔ اس کا دودھ بھی کم غذائیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں گوالوں پر پابندی لگ چکی کہ وہ اس ہارمون کا ٹیکا گائے بھینس کو نہ لگائیں مگر پاکستان میں گوالے چوری چھپے اسے استعمال کررہے ہیں۔ آگاہی نہ ہونے کے سبب ایماندار گوالے بھی آکسی ٹوسین کو بے ضرر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ انسانی صحت کے لیے خطرناک ہارمون ہے۔

(BOVINE SOMATOTROPIN) پاکستان میں گوالے ایک ہارمون، بوائن سوماٹوٹروفین کا بھی ٹیکا مویشیوں کو لگاتے ہیں۔ یہ ہارمون دودھ کی افزائش میں ۳۰ فیصد تک اضافہ کردیتا ہے، مگر بعض طبی تجربوں سے آشکارا ہوا ہے کہ یہ ہارمون انسان میں کینسر پیدا کرسکتا ہے۔ مزید برآں گائے بھینس پر اس کے استعمال سے مویشی کے تھن میں چھوت جنم لیتی ہے۔ چھوت والا دودھ بھی انسانی صحت پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے، حال ہی میں سپریم کورٹ پاکستان نے اس ہارمون کے استعمال پر پابندی لگادی ہے۔

جعلی دودھ کی لعنت

خالص اور قدرتی دودھ میں مختلف کیمیائی مادوں کی ملاوٹ کا سلسلہ جاری تھا کہ بے ضمیر اور ہوس پرست عناصر نے ''مصنوعی دودھ'' بنانے کا دھندا شروع کردیا۔ آج کل خصوصاً نچلے طبقے کے علاقوں میں یہی مصنوعی دودھ پچاس ساٹھ روپے لیٹر کے حساب سے فروخت ہورہا ہے، حالانکہ اس میں دودھ نام کی شے بہت کم ہوتی ہے۔

مصنوعی دودھ بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک عام طریق عمل یہ ہے کہ ایک برتن میں ایک لیٹر خالص دودھ میں ایک لیٹر پکانے کا تیل ملاتے ہیں۔ دوسرے برتن میں ایک کلو خشک دودھ میں دس لیٹر پانی ملایا جاتا ہے۔ پانی کو خوب پھینٹا جاتا ہے تاکہ خشک دودھ حل ہوجائے۔

اس کے بعد دونوں کا محلول ملا کر پھینٹا جاتا ہے۔ اس دوران آمیزے میں سفوف جیسا ایک کیمیکل کاربوکسی میتھائل سیلولوز (CARBOXYMETHYL CELLULOSE) ملایا جاتا ہے۔ یہ کیمیکل دودھ نما محلول کو گاڑھا کردیتا ہے۔ یہ مادہ پودوں یا سبزیوں سے بنتا ہے اور انسانی صحت کے لیے خطرناک نہیں ہوتا۔

سبزیوں یا پودوں سے بنا کاربوکسی میتھائل سیلولوز مہنگا ہے، مگر یہی سفوف نما مادہ لکڑی کے برادے سے بھی بنتا ہے جو سستا ہے۔ پاکستان میں گوالے اسی برادے سے بنا کیمیکل سفوف مصنوعی دودھ میں ملاتے ہیں۔ انسان یہ کیمیکل تادیر استعمال کرے، تو اس کا نظام ہاضمہ خراب ہوجاتا اور آنتوں پر زخم پڑ جاتے ہیں۔ معدہ السر کا نشانہ بھی بن سکتا ہے۔

اب اس مصنوعی دودھ میں قدرتی دودھ کے مانند پروٹین اور چکنائی پیدا کرنے کی خاطر مختلف کیمیائی مادے

ڈالے جاتے ہیں۔ ان میں سوڈیم کلورائیڈ، ڈٹرجنٹ (کپڑے دھونے کا پاؤڈر)، ایس این ایف مادے، نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ)، سنگھاڑے، کیلشیم ہائیڈروآکسائیڈ، سلم ملک پاؤڈر، دیواروں پر کیا جانے والا روغن (پینٹ) ہیڈروک ایسڈ، سیلی سیلک ایسڈ، کلورین، کاربونیٹس، بائی کاربونیٹس اور ایلومونیم سلفیٹ شامل ہیں۔ ایک تحقیق کی رُو سے مصنوعی دودھ اور خالص دودھ میں بھی ملائے جانے والی بیس سے زائد کیمیائی اشیا سامنے آچکیں۔

یہ مصنوعی دودھ کوئی غذا نہیں بلکہ شلوار قمیص، قلم، کمپیوٹر کی طرح ایک مصنوعہ ہے۔ محض ایک پراڈکٹ۔ اسے استعمال کرنے والے کو کسی قسم کی غذائیت نہیں ملتی بلکہ الٹا صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکٹومیٹر وہ آلہ ہے جس کی مدد سے دودھ میں ملاوٹی اشیا پکڑی جاتی ہیں۔ عیار و مکار گوالے اس آلے کو بھی دھوکا دینے کی خاطر مختلف طریقے ایجاد کرچکے۔ بعض اوقات دودھ فروخت کرنے والی کمپنیوں کے جو ملازم گوالوں کے دودھ کا معیار چیک کرتے ہیں، وہ کرپٹ ہوجاتے ہیں۔ گوالے انھیں رشوت دے کر ناقص دودھ مہنگے داموں کمپنی کو بیچ ڈالتے ہیں۔

مصنوعی یا خالص دودھ میں کھانا پکانے کا تیل چکنائی پیدا کرنے میں کام آتا ہے۔ ڈٹرجنٹ، پانی اور تیل کو باہم ملاتا ہے۔ کاسٹک سوڈا دودھ میں تیزابیت پیدا نہیں ہونے دیتا۔ مصنوعی دودھ کا ایک لیٹر ۴۰ سے ۵۰ روپے میں تیار ہوجاتا ہے، مگر مارکیٹ میں یہ دودھ ۷۰ تا ۹۰ روپے فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ منافع کے لالچ میں ہی ہوس ناک انسان اس دھندے کی جانب متوجہ ہوئے۔

خالص دودھ سے چکنائی نکال لینا بھی ایک قسم کی کرپشن ہے۔ یہ کام عموماً ڈبہ بند دودھ فروخت کرنے والی کمپنیاں انجام دیتی ہیں۔ یہ چکنائی پھر مکھن اور گھی کی شکل میں الگ سے فروخت ہوتی ہے۔ اس کرپشن کے باعث خریدنے والے کو کم غذائیت والا دودھ ملتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ خالص دودھ میں بھی بعض کیمیائی مادے موجود ہوتے ہیں، مگر وہ قدرتی ہونے کی وجہ سے انسانی صحت کو نقصان نہیں پہنچاتے، مگر جو کیمیکل انسان دودھ میں ملاتا ہے، وہ بظاہر بے ضرر ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طریقے سے انسانی صحت کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔

رنگ برنگ کیمیائی مادے

مثال کے طور پر ہائیڈروجن پیرآکسائیڈ ہی کو لیجیے۔ دنیا بھر میں گوالے اسے دودھ میں ملاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ کیمیکل دودھ میں جراثیم پیدا نہیں ہونے دیتا، یوں وہ دیر تک محفوظ رہتا ہے۔ لیکن بیرون ملک تقریباً سبھی گوالے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھیں علم ہے کہ کتنے من دودھ میں ہائیڈروجن پیرآکسائیڈ کی کتنی مقدار ملانی ہے۔ اس ناپ تول کے باعث کیمیکل خطرناک نہیں بنتا۔ پاکستان میں بیشتر گوالے ناخواندہ ہیں۔ وہ اپنی مرضی کی مقدار دودھ میں ڈال دیتے ہیں۔ ظاہر ہے، وہ خود تو یہ دودھ استعمال نہیں کرتے۔

ہائیڈروجن پیرآکسائیڈ کی زیادہ مقدار انسانی جسم میں پہنچے، تو وہ خطرناک مادہ بن جاتا ہے۔ اس کی زیادتی کینسر بھی پیدا کرسکتی ہے۔ نیز یہ آنتوں میں سوزش اور زخم پیدا کرتا ہے۔ یہ کیمیائی مادہ ویسے زخم پر چھڑکا جاتا ہے تاکہ جراثیم مارسکے۔ یہ بال بلیچ کرنے میں بھی کام آتا ہے۔

گوالے دودھ کو تروتازہ رکھنے کی خاطر اس میں فارملین (FORMALIN) بھی ملاتے ہیں۔ یہ کیمیائی مادہ ایک قدرتی کیمیکل، فارملڈ ہائیڈ اور پانی کی آمیزش سے تیار ہوتا ہے۔ فارملڈ ہائیڈ لاشیں حنوط اور مختلف اشیا محفوظ کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کیمیائی مادے کی بھی زیادہ مقدار انسانی جسم میں کینسر پیدا کردیتی ہے۔ جبکہ پاکستانی گوالے بے سوچے سمجھے اپنے دودھ میں فارملین کی مقدار ملاتے ہیں۔ ایسے دودھ کا مسلسل استعمال انسانی صحت پر متفرق منفی

www.urdugem.com

اثرات مرتب کرتا ہے، مثلاً سستی و تھکن طاری رہنا، پیٹ میں درد، قے آنا وغیرہ۔

یہ یاد رہے کہ خالص دودھ اگر ریفریجریٹر میں بھی ہو، تو وہ ۲۴ گھنٹے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی دودھ دو تین دن تک ریفریجریٹر میں محفوظ رہے، تو یہ اسی امر کی نشانی ہے کہ اس میں کیمیائی مادے ملائے گئے ہیں۔

یوریا انسان سمیت تمام ممالیہ کے پیشاب میں پیدا ہونے والا قدرتی مادہ ہے۔ اسے صنعتی طور پر بھی بنایا جاتا ہے تاکہ وہ بطور نائیٹروجن کھاد کا حصہ بن سکے۔ یہ سفید سفوف کی شکل میں ملتا ہے۔

گوالے مصنوعی یا قدرتی دودھ میں یوریا اس لیے ملاتے ہیں تاکہ وہ گاڑھا ہو جائے۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ گاڑھا ہونے کے باعث دودھ خالص ہے مگر یہ یوریا کی ''کرامت'' ہوتی ہے۔ کم مقدار میں یوریا بھی نقصان دہ کیمیکل نہیں، مگر یہ مادہ انسان مسلسل استعمال کرتا رہے، تو وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، مثلاً معدے کی بیماریاں۔ یوریا خصوصاً گردوں پر منفی اثرات ڈالتی ہے کیونکہ اسے نکالنے کے لیے انھیں زیادہ مشقت کرنا پڑتی ہے۔

انسان کے جسم میں پانچ بنیادی اعضا ہیں..... دماغ، دل، جگر، گردے اور پھیپھڑے۔ آلودہ دودھ ان پانچوں اعضا پہ منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ قسم قسم کے کیمیائی مادوں سے آلودہ دودھ پی کر پاکستانی جن بیماریوں اور طبی علتوں کا نشانہ بن رہے ہیں، وہ کچھ یوں ہیں:

☆امراض معدہ ☆آنتوں میں سوزش اور زخم ☆سانس کی بیماریاں ☆ہائی یا لو بلڈ پریشر ☆امراض قلب ☆باپ یا ماں بننے کی صلاحیت میں کمی یعنی بانجھ پن ☆ٹائیفائیڈ ☆بال جھڑ جانا ☆ہیپاٹائٹس کی مختلف اقسام ☆غم و غصے میں اضافہ ☆برداشت میں کمی، بچہ وقت سے پہلے پیدا ہونا ☆دل کی شریانوں کی بیماریاں۔

درج بالا امراض کی تفصیل سے عیاں ہے کہ آلودہ دودھ پی کر لاکھوں پاکستانی، مرد، عورتیں اور خصوصاً بچے مختلف امراض کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ان بیماریوں سے بچنے کی خاطر کیمیکل ملے دودھ کے قریب مت جائیے۔ جیب اجازت دیتی ہے، تو مہنگا خالص دودھ خوش کیجیے اگر آمدن کم ہے، تو ایسی سستی غذائیں کھائیے جو دودھ کا متبادل ہوں۔ کیمیائی دودھ پینے کا تو مطلب ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لے۔

پنجاب میں خصوصاً حکومت نے مصنوعی اور ملاوٹی دودھ کی پیداوار روکنے کے لیے کچھ اقدامات کیے ہیں، مگر لالچی اور گھٹیا لوگ باز نہیں آتے۔ پیسے کے لالچ نے انھیں اندھا کر دیا ہے۔ چنانچہ سخت سزائیں بھی ایسے لوگوں کو بدی سے نہیں روک پاتیں۔

آلودہ دودھ کی شناخت

پاکستان ہی نہیں بھارت اور دیگر ترقی پزیر ممالک میں بھی لالچی لوگ مصنوعی یا کیمیکل سے آلودہ دودھ تیار کرتے ہیں بھارت میں حکومت نے ایسی سستی کٹس تیار کی ہیں جن کے ذریعے عام آدمی اپنے گھر میں یہ تجربہ کر سکتا ہے کہ بعض کیمیائی مادے مثلاً ڈٹرجنٹ، یوریا اور نشاستہ دودھ میں شامل ہیں یا نہیں۔ ایسی کٹ پندرہ بیس روپے میں مل جاتی ہے۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ بھی اس قسم کی کٹس عوام الناس کو فراہم کرے۔

آلودہ دودھ میں کیمیکل شناخت کرنے والی کٹ

خوش قسمتی سے عام آدمی گھریلو تجربوں سے بھی دودھ میں کچھ آلودگیاں دریافت کر سکتا ہے۔ ان کا بیان درج ذیل ہے۔

ڈٹرجنٹ

دودھ میں ڈٹرجنٹ اور کاسٹک سوڈا بھی ڈالا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دودھ گاڑھا ہو جائے۔ کاسٹک سوڈے سے صابن بنتا ہے۔ دونوں کیمیکل انسان میں امراض کو جنم دیتے ہیں۔ دودھ میں ڈٹرجنٹ کی ملاوٹ جاننے کا طریق کار یہ ہے کہ ایک برتن میں مشکوک دودھ کی ۱۰ ملی لیٹر مقدار لیجیے۔ پھر اسی میں اتنا ہی پانی ملائیے۔ اب برتن اچھی طرح ہلائیے تاکہ دودھ اور پانی حل ہو جائیں۔ ہلانے سے آمیزے میں جھاگ پیدا ہو، تو یہ علامت ہے کہ دودھ میں ڈٹرجنٹ یا کاسٹک سوڈا ملا ہوا ہے۔

یوریا

یہ کیمیائی مادہ کھاد کا جزو ہے مگر ہوس ناک لوگ اسے دودھ میں ملا دیتے ہیں۔ اسے شناخت کرنے کا طریقہ یہ ہے

یوریا جو دودھ میں شامل کرنے کی خاطر نہیں بنتی

کہ مشتبہ دودھ کا ایک چمچ کسی برتن میں ڈالیے۔ اسی میں پھر دو یا تین یا ربر کی دال کا آدھی چمچی سفوف ڈال دیجیے۔

ان دونوں کو اچھی طرح ملائیے تاکہ وہ یکجا ہو جائیں۔ پھر آمیزہ پانچ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر اس آمیزے میں لٹمس کا غذ ڈالیے اور ڈیڑھ منٹ بعد نکال لیں۔ اگر لٹمس پیلا پڑ جائے، تو دودھ میں یوریا ملا ہوا ہے۔

پانی

دودھ میں یہ قدرتی عنصر ملانے سے وہ انسانی صحت کو نقصان تو نہیں پہنچاتا لیکن جیب پر بھاری ضرور پڑتا ہے۔ پانی ملا دودھ شناخت کرنے کا طریق کار یہ ہے کہ تھوڑا سا مشکوک دودھ ڈھلواں سطح پر گرائیے۔ اگر دودھ کے قطرے پیچھے سفید لکیر چھوڑ جائیں تو یہ خالص ہے۔ لیکن کوئی سفید لکیر نہ چھوڑے، تو جان جائیے کہ دودھ میں پانی ملا ہوا ہے۔

مصنوعی دودھ

دودھ کی تمام اقسام میں یہ سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ متفرق کیمیائی مادوں کے ذریعے تیار ہوتا ہے۔ اس میں حقیقی دودھ بہت کم ہوتا ہے۔ اسے صرف اس لیے

مصنوعی دودھ تیار ہو رہا ہے

ملایا جاتا ہے تاکہ تیار شدہ کیمیائی آمیزہ میں دودھ کا ذائقہ جنم لے سکے۔

اس دودھ کی نمایاں نشانیاں یہ ہیں: چکھنے پر ذائقہ تلخ لگتا ہے۔ جب اسے انگلیوں سے ملا جائے، تو صابن کی طرح چکناہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ گرم کیا جائے، تو مصنوعی دودھ پیلا پڑ جاتا ہے۔ اس کی بالائی بے ذائقہ ہوتی ہے۔

نشاستہ

گوالے دودھ میں چکنائی کی مقدار بڑھانے کی خاطر نشاستہ ملاتے ہیں۔ اس ملاوٹ کے بارے میں جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑے سے دودھ میں آیوڈین یا ٹنکچر ملائیے۔ چار منٹ میں دودھ نیلا پڑ جائے، تو یہ علامت ہے کہ اس میں نشاستہ ملا ہوا ہے۔

www.urdugem.com

Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With the Mother
100% خالص
روزبڈ شیمپو
DOCTOR'S ROSEBUD CREAM

ایپل سائیڈر ونیگر، بادام ناریل اور گلاب سے بنا منفرد شیمپو
بال گرنے بند، خشکی سکری ختم، بال لمبے گھنے
اور مضبوط، سر کی جوؤں کا خاتمہ

Doctor's
Rosebud
BEAUTY & FAIRNESS CREAM
A Quality Herbal Product
No Mercury | No Steroid | No Hydroquinone

ایکنی، کیل، مہاسے، چھائیاں، جھریاں اور سیاہ حلقے دور کرتی ہے۔ شوگر کے مریضوں کے پاؤں کی درد، جلن، اکڑاؤ، مختلف ایگزیما اور پوسٹ ہرپز زوسٹر کا یقینی علاج

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

"میں نے ڈاکٹر اصغر علی کی تیار کردہ مصنوعات خصوصاً شیمپو کو بہت مفید پایا ہے۔ اب میرا پورا خاندان یہ شیمپو استعمال کرتا ہے۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا تعارف کرواتا اور انھیں استعمال کرنے کا کہتا ہوں۔ یہ شیمپو خواتین کے بالوں کی کئی بیماریوں کا علاج ہے"۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (اُردو ڈائجسٹ)

ڈاکٹرز ایپل سائیڈر ونیگر

وزن کم کرتا ہے۔ کولیسٹرول کنٹرول کرتا ہے۔ جگر اور پیٹ کے بہت سارے امراض کا حل ہے۔ فالتو چربی ختم کرتا اور اسمارٹ بناتا ہے۔ ڈاکٹرز ایپل سائیڈر ونیگر سو فیصد خالص Unpasturised, unfiltered,living and the Mother ہے۔ جو پاکستان کے بہت سارے شہروں میں استعمال ہو رہا ہے اور لوگ مثبت رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹرز روزبڈ کریم

ڈاکٹرز روزبڈ کریم میں شامل گلاب، بادام روغن، ناریل کا تیل، ایپل سائیڈر ونیگر اور قیمتی جڑی بوٹیاں خشک اور سرد موسم میں چہرے کی حفاظت کر کے چہرے کو گلاب کی طرح شاداب، تروتازہ، دلکش اور جاذبِ نظر بنا کر رنگ بھی گورا کرتی ہے۔

آیئے ہم آپ کو اسمارٹ، صحت منداور توانا بنائیں

موٹاپے میں مبتلا افراد بڑی آسانی سے شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو قدرتی طریقۂ علاج سے مثلاً ڈاکٹرز ٹانک، خوراک کنٹرول اور مناسب ورزش سے وزن کم، پیٹ چھوٹا، صحتمند، اسمارٹ، توانا، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض سے بغیر کسی سائیڈ ایفیکٹ کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی مریضوں کو دوائی کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور وہ دوبارہ آئیڈیل صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔

اتوار کے علاوہ شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اطلاع دے کر تشریف لا سکتے ہیں۔

برائے مشورہ: ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)
کلینک: P-62 مرغزار کالونی ملتان روڈ لاہور
0321-8823321, 0336-4167960
doctor health and beauty clinic
Doctor Rosebud Shampoo
برائے رابطہ: حافظ مبشر علی 0321-9785644
www.doctorsons.org
پاکستان بھر سے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں
رابطہ نمبر برائے کراچی، حیدر آباد۔ 0321-2075111

سارہ شیخ

کالی زبان

کسی انسان کو جزا یا سزا سے نوازنا صرف اللہ پاک ہی کو زیب دیتا ہے

سائرہ کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ ٹانگیں کپکپا رہیں اور دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے گود میں لیٹے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بچہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اُس نے بے اختیار اُسے جھنجوڑ ڈالا۔ بچہ روتے سے چونک کر رونے لگا۔ سائرہ نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا اور گہری گہری سانسیں لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

بات بظاہر کچھ بھی نہ تھی مگر سائرہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی روح قبض ہونے والی ہو۔ بازار میں گاڑی روک کر اُس کا شوہر اُسے اور بچے کو گاڑی ہی میں بٹھا کر کچھ خریداری کرنے گیا تھا۔ یہ بھی سائرہ کی ہی تجویز تھی کیونکہ ایک تو بچہ سو رہا تھا۔ دوسرے سردی بہت تھی اور کام بھی کچھ ایسا خاص نہ تھا جس کے لیے وہ بھی اترتی۔ میاں کے جاتے ہی ایک زنخا گاڑی کی کھڑکی سے آٹکا اور تالیاں پیٹ پیٹ کر مانگنے لگا۔ "اری تو بھاگوان ہو، تیرا منا سلامت رہے تو سدا سہاگن رہے! اے مجھ غریبنی کو کچھ دے جا! دے جانہ!"

شور سے بچہ کسمسانے لگا۔ سائرہ نے ایک ہاتھ سے اُسے تھپکا اور دوسرے سے اسے مسنع کر دیا۔ آن کی آن میں زنخے کا چہرہ بدل گیا۔ کہاں تو وہ منگ منگ کر دعائیں دے رہا تھا کہاں غصے کی شدت سے آنکھیں لال ہو گئیں۔ سائرہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہو گئی۔ یکدم زنخے نے بھاڑ سا منہ کھولا اور پان کی پیک سے رنگی ہوئی زبان باہر نکال دی۔ پھر ایک میلی چیکٹ انگلی زبانی پر رکھ کر بولا، "دیکھ لے غور سے۔ کالی زبان ہے میری کالی! پھر نہ کہیو تیرا نقصان ہوا! ارے ایک ہفتہ... ایک ہفتے میں سب ختم ہو جائے گا، سب! تجھے جتنی دعائیں دی تھیں سب واپس لے

www.urdugem.com

لیں میں نے! کچھ نہیں رہے گا ہاں!'' کہہ کر ایک جھٹکے سے مڑا اور کچھ دور جا کر سائرہ کو دیکھا۔ اسے جنبش کرتا نہ دیکھ کر کوسنے لگا۔ پھر تھوڑا آگے گیا اور پھر مڑا۔ کوئی اشارہ نہ ہوتے دیکھ کر بکتا جھکتا آگے چلا گیا۔

سائرہ یوں بیٹھی رہ گئی جیسے جسم سے یکا یک جان نکال لی گئی ہو۔ اُس کے دماغ میں خیالات آندھی کی طرح گردش کرنے لگے۔ اماں، دادی، پڑوسن خالہ اور ماسی کے جملے جن کو وہ اُس وقت اہمیت نہ دیتی تھی:

''ارے ان ہیجڑوں کی زبان میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ بہت قریب ہوتے ہیں اللہ کے!''

''اگر کبھی بھی کچھ مانگیں تو انکار نہ کرنا چاہیے۔ کالی زبان ہوتی ہے ان کی!''

''ان کی بد دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ آپا شمع نے در پر آئے ہیجڑے کو لوٹا دیا تھا۔

اُسی دن جوان لڑکا پتنگ اڑاتے چھت سے گرا اور بازو تڑوا بیٹھا۔''

''ارے گھر کے گھر تباہ ہو جاتے ہیں بی بی!''

یہ سارے جملے اس کے دماغ میں گھومنے لگے۔ سائرہ نے لرز کر بچے کو مزید چمٹا لیا۔ اُسی وقت سائرہ کا شوہر جبران گاڑی میں داخل ہوا۔

''بھئی دیکھو تمام سامان لے آیا ہوں۔ کچھ کمی بیشی تو نہیں ہوگئی؟ ورنہ تم سے کچھ بعید نہیں گھر جا کر مجھے دوبارہ ہی بھیج دو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے سائرہ کا ہاتھ تھاما اور گھبرا گیا۔ وہ ٹھنڈی برف ہو رہی تھی۔

اب شوہر نے غور سے اُس کی شکل دیکھی۔ لٹھے جیسا سفید چہرہ اور دہشت زدہ تاثرات۔ ''یا اللہ! کہیں موٹر سائیکل سواروں نے اُس سے موبائل وغیرہ تو نہیں چھین لیا؟ جبران نے ہوکھلا کر اُسے جھنجوڑا تو وہ چونک کر اُسے تکنے لگی۔ جبران نے بار بار سوال کیے تب جا کر اسے پورا قصہ سنایا۔ وہ حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔

''اب کیا ہوگا جبران؟ وہ ہمیں بد دعا دے کر چلا گیا ہے۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ مجھے اُسے روک لینا چاہیے تھا۔ تم ہی آ کر اُسے کچھ دے دیتے۔ چلو نا اُسے ڈھونڈتے ہیں۔ یہیں کہیں ہوگا وہ۔'' الفاظ سائرہ کی زبان سے جیسے لڑھک رہے تھے۔

جبران نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا ''تم اتنی پڑھی لکھی اور باشعور ہو کر بھی اتنی کمزور عقیدہ کیسے ہو سکتی ہو؟ ذرا سی بات پر بڑی بڑی بد دعائیں دینا تو ان لوگوں کا خاص طریقہ ہے۔ ان کی نام نہاد کالی زبان سے ڈر کر لوگ ان کو زیادہ خیرات دے دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو اُس نے کہا وہ سچ ہی ہو جائے۔''

''مگر ان کی بد دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ لوگ الگ سے ہوتے ہیں نا، اللہ ان کی سنتا ہے۔'' سائرہ بول پڑی۔ جبران سر جھٹک کر بولا، ''سائرہ! سائرہ! اصلی نسخے بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جو سڑکوں پر مانگتے نظر آتے ہیں، زیادہ تر مرد ہوتے ہیں جو عورت کا بھیس بھر کر گھومتے ہیں۔ حالات سے مجبور ہو کر یا کسی بھی وجہ سے، بہر حال یہ اصلی نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کو یہ بات گوارا ہے کہ سائل کو منع کر دیا جائے مگر یہ نہیں کہ اُسے جھڑکا یا بدتمیزی کی جائے اور تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ اللہ کو سب معلوم ہے۔ وہ ایسے ہی کوئی فیصلہ نہیں لے لیتا۔''

اتنی تقریر کے باوجود بھی سائرہ کو سکون نہیں آ رہا تھا۔ نسخے کا جملہ اُس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا تا رہا۔ ''ایک ہفتے میں سب ختم ہو جائے گا سب!'' اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاڑی سے اُتر کر اُسے تلاش کرے اور پیروں ہی میں گر پڑے۔ مگر جبران گاڑی چلا کر وہاں سے نکل گیا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔

ایک ہفتہ سائرہ نے ایسے گزارا جیسے پھانسی کی سزا پانے والا مجرم۔ وہ ہر وقت سوچ میں رہتی۔ ایک جگہ بیٹھتی تو اٹھنے کا نام نہ لیتی۔ دروازے کی گھنٹی بجنے پر لرز اٹھتی۔ بچے کو

گود میں لیے لیے گھومتی رہتی۔ دن میں دس دفعہ دفتر فون کر کے جبران کی خیریت لیتی۔ نہ ڈھنگ سے بات کرتی نہ کوئی کام کرتی۔ بیٹھے بیٹھے چونک کر اٹھتی اور جائے نماز بچھا کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی پورا پورا دن تسبیح روتی رہتی۔ نہ گھر صاف ہوتا نہ کھانا صحیح بنتا۔ عجیب بے ہنگم نظام ہو گیا۔

جبران پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ بار بار سائرہ کو دلاسے دیتا مگر سائرہ کے دماغ پر تو 'ایک ہفتہ' سوار ہو گیا تھا۔ وہ روز روتی ہوئی اٹھتی اور کانپتی ہوئی سوتی۔ ہر وقت کسی بری خبر کا انتظار کرتی رہتی۔ حالانکہ دعائیں کرتے کرتے اُس کا منہ دکھ جاتا پھر بھی اُسے چین نہ ملتا۔

وہ ہفتہ ختم ہونے کا آخری دن تھا۔ سائرہ کی عجیب حالت تھی۔ اُس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ وہ بچے اور جبران کو لے کر کہاں چھپ جائے جہاں وہ تینوں محفوظ ہو جائیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جبران آج دفتر جائے۔ مگر وہ بھی ایک ہفتے میں اچھا خاصا چڑچڑا اور بیزار ہو گیا تھا۔ اُس نے رکنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ سائرہ بچے کو لے کر کمرہ بند کر کے بیٹھی رہی۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔

ایک دم فون کی گھنٹی بجی تو وہ اچھل پڑی۔ ''یا اللہ جبران کی خیر رکھنا!'' کہتے ہوئے وہ دوڑی۔ فون تک جاتے جاتے اُسے کمرا گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ فون اٹھا کر 'ہیلو' کہا ہی تھا کہ زور کا چکر آیا۔ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

اُسے ہوش آیا تو جبران کی آواز سنائی دی۔ وہ بچے سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور مردانہ آواز سنائی دی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اُس نے گردن گھما کر دیکھا تو اُسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اُسے ہوش میں آتے دیکھ کر جبران تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ ''شکر ہے اللہ کا! تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا سائرہ۔ اگر تم نے میرا فون ریسیو نہ کیا ہوتا تو مجھے خبر ہی نہ ہوتی اور جانے بچے کا کیا حشر ہوتا!''

سائرہ کا دل کانپ اٹھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد بچہ سو گیا تو سائرہ کو سونے کا موقع ملا۔ اُس نے وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ایک ہفتہ ختم ہو گیا تھا۔ مگر سائرہ پھر بھی بے چین تھی۔ اسی بے چینی میں اُسے نیند آ گئی۔ دوسرے دن جبران نے چھٹی کر لی اور سائرہ کو بستر سے نہ اٹھنے دیا۔ شام تک اُس کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی۔ جبران اُس کا دل بہلانے کی غرض سے اُسے گھمانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

سڑکوں پر گاڑی گھماتے گھماتے وہ لوگ پھر اُسی بازار جا نکلے جہاں سے سب کچھ شروع ہوا تھا۔ وہی منظر وہی جگہ۔ سائرہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔ جبران نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ تھوڑا ہی آگے گئے ہوں گے کہ چیخ پکار سنائی دی۔

کچھ ہی دور عین سڑک پر ہجوم اکٹھا تھا۔ اُس نے گاڑی بڑھائی اور قریب پہنچ کر بالکل آہستہ کر دی۔ سائرہ کی نظر سڑک پر پڑے زخمی پر پڑی اور اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہی زنخا کسی گاڑی سے ٹکرا کر خون میں لت پت سڑک پر گرا ہوا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا مگر پھر گر پڑتا۔ لوگ باتیں کر رہے تھے:

''ہائے غریب آدمی کی ٹانگیں ہی ٹوٹ گئیں۔ کیا کرے گا۔؟''

''ارے صاحب اچھا ہی ہوا۔ ہر گاڑی کے سامنے کھڑا ہو کر منہ بھر بھر کر کوسنے دیتا تھا۔ اچھا ہوا لنگڑا ہو گیا۔''

''پھر بھی''۔...

ایمبولینس آ گئی۔ جبران گاڑی بڑھا لے گیا۔

سائرہ کا دماغ ایک دم خالی ہو گیا۔ اُسے سمجھ ہی نہ آیا کہ اب وہ کیا سوچے۔ پہلے تو سائرہ کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اُسے احساس ہوا کہ کسی انسان کی بد دعا پوری نہیں ہو سکتی، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے کہ وہ کس کو سزا دیتا ہے اور کسے جزا ملتی ہے۔

www.urdugem.com

شکور عالم (نیویارک)

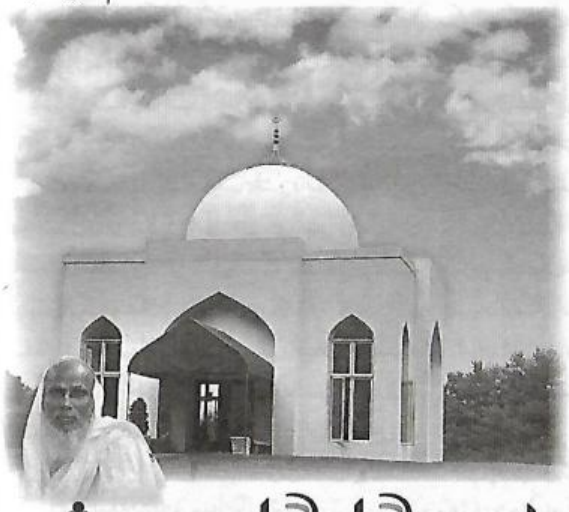

امریکا کا درویش

امن و آشتی کے علم بردار ایک سری لنکن بزرگ کی کتھا'

ہزارہا امریکی اس سے فیض یاب ہوئے

"یار انیق، اگر میں امریکا میں فوت ہو جاؤں تو مجھے تو بس اس جگہ دفنا دینا۔" اشفاق احمد نے اپنے بیٹے کو کہا۔ پھر بانو قدسیہ نے جھاڑو اٹھائی اور مزار اور اس سے ملحقہ باورچی خانے کی صفائی شروع کر دی۔

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔

جب اشفاق احمد اور بانو قدسیہ اپنے بیٹے پروفیسر انیق خان کے پاس میری لینڈ، امریکا مقیم تھے۔ ایک دن احباب کی ایک محفل میں بابوں کا ذکر ہو رہا تھا کہ ایک خاتون بولیں۔ یہاں پنسلوانیا میں بھی تو ایک بزرگ کا مزار ہے۔ پھر کیا تھا اشفاق احمد فوراً حاضری کے لیے تیار ہو گئے۔

نیوجرسی سے اُنھوں نے سفر کا آغاز کیا۔ اُن کی منزل سرسبز پہاڑوں، نظر فریب شاداب وادیوں میں گھرے ایک چھوٹے سے قصبے کوسٹوائس (coastivice) میں تھی جہاں تک پہنچنے کا دورانیہ تقریباً چار گھنٹے تھا۔ راستے میں بھارت کے "اسٹیل کنگ" کہلانے والے لکشمی متل کا وسیع ترین کارخانہ آتا تھا۔ اُسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ بھارت نے کس ہوشیاری سے امریکا میں اپنے معاشی استحکام کی جڑیں گاڑ رکھی ہیں۔

گاڑی قصبے میں داخل ہو کر کہیں اپنی رفتار کم کر دیتے تو باہر آتے جاتے لوگ اور دکاندار "باوا؟ وہاں ہے" (Bawa This Way) کہہ کر ایک جانب اشارہ کر دیتے۔ گویا انھیں معلوم ہے کہ ہماری منزل بابا کا مزار ہی ہے۔ حسین پہاڑی علاقے میں گاڑی اونچائی کی طرف جاتے ہوئے ایک ایسے ٹیلے پر پہنچی جس کے قریب ہری بھری سبزیوں اور پھلوں کے درختوں کی کثرت تھی۔ خوش نما پھولوں کی کیاریوں اور رنگ برنگ کے پرندوں کی چہچہاہٹ سُنائی دیتی۔ خوبصورت پرندوں کی مٹرگشت کے درمیان سادہ لیکن انتہائی پرکشش مزار آپ کا منتظر ہے جسے بابا کے عاشقوں نے صرف تین دن میں مکمل کیا تھا۔

کہانی شروع ہوتی ہے ۱۹۶۰ء کی دہائی سے، جب یورپ اور امریکا کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دنیاوی دھندوں سے بےزار پھٹی پتلونیں پہنے کسی اندرونی سکون یا مقصد کی تلاش میں دنیا کے کونے کونے میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ انھیں عرف عام میں "ہپی" کہا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک پارٹی سری لنکا کے علاقے "جانینا" جا پہنچی۔ یہاں آ کر چند معاشی نوجوان طالب علم ملے جنھوں نے بتایا کہ اِدھر جنگلوں میں ایک بابا رہتا ہے جو زیادہ میل جول نہیں رکھتا لیکن لوگ اس کی محبت میں سرشار دور دور سے اُسے ملنے آتے ہیں۔

اپنے مقامی دوستوں کی راہنمائی میں یہ ٹولی بھی ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچی۔ دیکھا کہ گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ چند جھونپڑیوں کے درمیاں دھان کے کھیت میں دھوتی اور بنیان پہنے کھڑا ایک بوڑھا چاولوں کی بوائی کر رہا تھا۔

درمیانہ قد، گہرا گندمی رنگ، ڈبیوں والی دھوتی، سفید بنیان، سفید عمامہ۔ آپ تھے باوا محی الدین! بزرگ نے ان کی آؤ بھگت کی اور اس کے باوجود کہ بابا صرف تامل زبان بولتا تھا اور یہ صرف انگریزی، یہ ٹولی بزرگ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوتی کہ کئی سال تک ان کے آنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ بلا آخر اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ باوا محی الدین کو امریکا ہی بلا لیا جائے۔ جنوبی ہندوستان کے ایک ہندو ڈاکٹر نے ترجمان کے فرائض سنبھالے اور اکتوبر ۱۹۷۱ء کو باوا امریکا منتقل ہو گئے۔

باباجی کے افکار اور شخصیت کی خوشبو کچھ ایسی پھیلی کہ تھوڑے ہی عرصے میں اللہ کے راز جاننے کے شائق امریکا اور کینیڈا سے زائرین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بابا صاحب بنیادی طور پر حضرت عبدالقادر جیلانی بغدادیؒ کی راہ سلوک کے مسافر تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کے افکار اور ہدایت کی ترویج کے لیے ایک منظم انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا جائے۔ اس طرح "بابا محی الدین فیلوشپ" کی بنیاد پڑی۔ آپ کی قیام گاہ کے ساتھ، جواب مزار ہے، ایک مسجد اور لنگر کا قیام عمل میں آیا۔

باباجی کی محفل میں ہر مذہب اور مکتب فکر شریک ہوتے اور اللہ کے احکام اور با مقصد امن و آشتی کی زندگی بسر کرنے کا علم حاصل کرتے۔ آپ کے افکار اور ہدایات نہ صرف عوام بلکہ بہت اعلیٰ عہدوں پر فائض لوگوں کی راہنمائی کا باعث بنے۔ ۱۹۷۰ء میں اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل رابرٹ مُلر نے بابا صاحب کی انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور عملی اظہار کے لیے بابا صاحب سے راہنمائی حاصل کی۔

۱۹۸۰ء میں جب تہران میں امریکی سفارت خانے کے لوگوں کو یرغمال بنا لیا گیا تو بابا صاحب نے امام خمینی، اسرائیلی وزیر اعظم اور صدر کارٹر کو خطوط لکھے۔ آپ کا فرمان تھا کہ جب ایرانی قرآن کو سمجھ جائیں گے تو یرغمال رہا ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں آپ کے انٹرویو کئی امریکی جریدوں نے شائع کیے۔ اس حوالے سے دنیا کے ایک اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے، بوسٹن یونیورسٹی میں آپ کو خطاب کے لیے مدعو کیا گیا۔

یاد رہے کہ بابا صاحب نے کوئی دنیاوی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور صرف اللہ کے احکام کو دل میں بسا کر ان کی ترویج کا کارنامہ انجام دیا۔ انگریزی زبان نہ جانتے ہوئے بھی مترجم کے ذریعے آپ کے افکار اعلیٰ تعلیمی اور انتظامی اداروں میں سنے جاتے تھے۔ ڈبیوں والی دھوتی اور بنیان میں ملبوس باواجی کی محفل میں ہندو، سکھ، مسلمان کے علاوہ بدھ مت، عیسائی وغیرہ بھی مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی شریک ہوتے۔ آپ مولانا روم کے انداز میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور قصوں کے ذریعے ان کی روحانی تربیت کرتے تھے۔

www.urdugem.com

آپ کی صحبت میں شامل لوگ روح کی پاکیزگی اور اللہ کی حقانیت سے روشناس ہو کر آپ کو مختلف القابات سے پکارتے۔ آپ کے چند القاب تھے: شیخ، گرو، سوامی، قطب HIS HOLINESS اور باواجی، لیکن آپ نے اپنے آپ کو ANT MAN یعنی چیونٹی آدمی کا نام دیا ہوا تھا کہ میں تو صرف ایک چیونٹی کے برابر ہوں۔ بڑائی اور بڑا نام صرف اللہ کے لیے ہے۔

رشد ہدایات کا یہ شاہکار، ۱۹۸۶ میں اپنے خالق سے جا ملا۔ آپ کی ہدایت پر ٹیلے کی چوٹی پر آپ کی جھونپڑی کے مقام پر آپ کی تدفین ہوئی اور ایک نہایت سادہ لیکن دلکش مزار تعمیر ہوا جسے آپ کے چاہنے والوں نے صرف تین دن کے شب و روز میں مکمل کیا۔

آپ کے بعد کسی کو جانشین صرف اس لیے مقرر نہیں کیا گیا کیونکہ چاہنے والے آپ کی رحلت کے بعد بھی آپ سے براہ راست رابطہ رکھنا چاہتے تھے۔

اپنی تعلیمات میں باوا صاحب کئی رنگ اختیار کرتے تھے۔ کبھی چھوٹی چھوٹی نظموں کی صورت میں کبھی شاعری اور اکثر اوقات انتہائی عام فہم سادہ گفتگو میں کہ سننے والوں کے دلوں میں اُتر جاتے۔

باواجی کی فاؤنڈیشن کا دائرہ کار اب امریکا، کینیڈا، یورپ اور آسٹریلیا تک جا پہنچا ہے۔ آپ کے ارشادات اور لیکچر اب ۲۵ کتابوں اور دس ہزار گھنٹوں پر محیط ریکارڈنگ پر مشتمل ہے۔

باباجی الدین کے افکار و ارشادات۔

(۱) انسان کی نیکیاں، خیرات، محبت فی الحقیقت ایک قطرے کے مانند ہیں۔ اگر ہم اس قطرے کو کبھی ختم ہونے کی حقیقت سمجھیں تو فی الحقیقت وہ اپنے اصلی وجود کی جانب لوٹ رہا ہوتا ہے۔ یہ ادراک ہمیں اللہ کے انعام اور نوازشات کے سمندر کا احساس دلاتا ہے۔

(۲) باعقل لوگ ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنی ذات کی کمزوریوں اور غلطیوں پر نظر رکھیں نہ کہ دوسروں کے عیب تلاش کریں۔

(۳) انسان کی سب سے بڑی کامیابی اپنے دل کو اللہ کے احکام کے تابع کرنا ہے۔

(۴) ظاہری اور نظر آنے والی تبدیلیاں، اصل تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔ ہمارے اندر ایک اور خوبصورت وجود موجود ہے جس کو اندر کی آنکھ سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ وہی دراصل ابدی روشنی اور خوشی کا مظہر ہے۔ ہمیں فقط اُس وجود کی جستجو کرنی چاہیے اور یہ جستجو ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔

(۵) میرے بچو، تم جو کچھ بھی کرو اُس میں محبت کو ضرور داخل کرلو۔

(۶) اللہ تو سب کا ہے۔ اُس نے تو ہماری ایک اقوام متحدہ قائم کردی ہے جس کے ہم حصہ دار ہیں۔ ہمیں اُس میں سے اپنے حصے سے زیادہ کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔

(۷) ہمیں دوسروں کے دُکھ کو محسوس کرنا چاہیے اور بانٹنے کی عادت پالنی چاہیے۔ صرف اسی طرح ہم روحانی خوشی حاصل کر کے دنیاوی آلام پر قابو پا سکتے ہیں۔

(۸) اللہ کی پہچان، اُس کی عبادات انسان کا زیور ہیں۔ آپ نے اُن کو پالیا تو دنیا کی ساری دولت آپ کے قدموں میں ہوگی۔

(۹) اللہ کا گھر آپ کے دل میں ہے۔ اُس کا قرب چاہیے تو آپ بھی اُس میں ہی بسنے کی کوشش اور تلاش کریں۔

(۱۰) اپنے مسلمان ہونے کے دعوے مت کرتے پھرو۔

(۱۱) اللہ پر یقین کو اپنے اندر اتنا مضبوط کرلو کہ کسی مشکل کے وقت کہہ سکو کہ اللہ یہ تو تیری ذمہ داری ہے، میں تو بے بس ہوں۔ ◆◆◆

جیسن بکارو / احمد فواد

یہ ہے سبق سکھانے کا صحیح طریقہ

ایک نوجوان کی کتھا جس نے ایک بار جھوٹ بولا اور تمام عمر پچھتاتا رہا

میں اسپین کے جنوب میں ایسٹونیا نامی ایک چھوٹی سی آبادی میں پلا بڑھا۔ اُس وقت میری عمر ۱۶ سال تھی جب ایک صبح سویرے میرے والد نے مجھے کہا کہ میں انھیں وہاں سے تقریباً ۱۸ میل دور واقع میخاس نامی جگہ کار میں لے جاؤں۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہاں پہنچ کر گاڑی قریب میں موجود گیراج لے جا کر اُس کی سروس بھی کروادوں۔ تازہ تازہ ڈرائیونگ سیکھنے اور کار چلانے کے مواقع بہت کم ہونے کی وجہ سے یہ خوشی اس کے لیے تیار ہوگیا۔

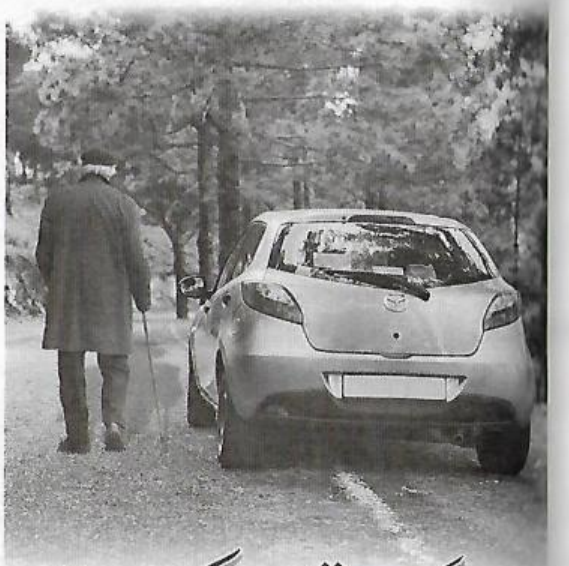

والد کو میخاس پہنچا کر میں نے اُن سے وعدہ کرلیا کہ سروس کے بعد گاڑی ٹھیک چار بجے انھیں لیتے مقررہ جگہ پہنچ جائے گی۔ چونکہ میرے پاس چند گھنٹے وقت تھا، اس لیے میں گیراج کے قریب بنے تھیٹر میں ایک دو فلمیں دیکھنے چلا گیا۔ وہاں میں فلمیں دیکھنے میں اتنا مگن ہوا کہ وقت گزرنے کا کوئی احساس ہی نہ رہا۔ جب آخری فلم ختم ہوئی تو میں نے اپنی گھڑی دیکھی تو چھ بج رہے تھے۔ مجھے دو گھنٹے قبل ابا جان کے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ والد فلموں کہ وجہ سے ہونے والی اس تاخیر پر بہت غصہ ہوں گے۔ ممکن ہے کہ دوبارہ مجھے گاڑی چلانے کی اجازت بھی نہ دیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں انھیں کہوں گا، چونکہ کار میں مرمت کا

www.urdugem.com

کچھ کام نکل آیا تھا اس وجہ سے اتنی تاخیر ہوگئی۔ جس کی توقع نہیں تھی۔

جب گاڑی لے کر میں مقررہ جگہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ وہاں صبر و استقامت کی تصویر بنے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اس تاخیر پر اُن سے معافی چاہی اور انھیں بتایا کہ گاڑی میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہوگئی تھی جس کی مرمت میں اتنا زیادہ وقت لگ گیا۔

یہ سُن کر انھوں نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جسے میں کبھی بُھلا نہیں سکوں گا۔ وہ کہنے لگے:

''حسین، مجھے اس بات نے بے حد مایوس کیا ہے کہ تمہیں یوں مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔''

''آپ کا کیا مطلب ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں؟'' میں ہڑبڑا کر بولا۔

والد نے اداسی سے مجھے دیکھا اور بولے: ''جب تم مقررہ وقت پر نہ پہنچے تو میں نے گیراج فون کر کے معلوم کیا کہ کیا کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تم ابھی تک گاڑی لینے نہیں آئے۔ اس لیے مجھے پتا چل گیا تھا کہ گاڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ والد کی باتیں سُن کر اپنے جرم کے شدید احساس سے میرے بدن میں لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے بہت ہی کمزور انداز میں اس بات کا اعتراف کیا کہ دراصل فلم دیکھنے میں مصروف ہوجانے سے تاخیر ہوئی۔ انھوں نے یہ بات بہت غور سے سُنی۔ اُداسی نے ان کی شخصیت کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ کہنے لگے:

''مجھے تم پر نہیں بلکہ خود پر غصہ آرہا ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ ایک باپ کی حیثیت سے ناکام ہوچکا۔ اگر اتنے برس بعد بھی تم مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس کرتے ہو تو یقیناً میں ناکام ہوا ہوں۔ اس کی تربیت میں رہ جانے والی کسی کوتاہی کا ہی نتیجہ ہے کہ بیٹا باپ سے سچ کہنے پر تیار نہیں ہے۔ اب گھر تک پیدل چل کر میں اس بات پر غور کرنا چاہتا ہوں کہ اس کام میں مجھ سے غلطی کہاں سرزد ہوئی ہے۔''

میرا سارا احتجاج، معافیاں اور ملتجیانہ الفاظ اُن پر کوئی اثر نہ کر سکے۔ میں نے اپنے والد کو سخت صدمہ پہنچایا تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی کا سب سے اذیت ناک سبق سیکھنا پڑا۔

والد نے اس گرد آلود سڑک پر چلنا شروع کیا۔ میں جلدی سے کود کر گاڑی میں بیٹھا اور ان کے پیچھے پیچھے اس امید پر ۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاتا رہا کہ وہ بالآخر اپنے رویے میں نرمی لے آئیں۔ تمام راستہ میں ان سے التجا کرتا اور انھیں بتاتا رہا کہ میں کس قدر شرمندہ ہوں۔ لیکن وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے خاموشی سے چلتے رہے... انتہائی متفکر اور دکھی۔

والد کو اس قدر جسمانی اور جذباتی تکلیف میں دیکھنا میری زندگی کا سب سے اذیت ناک تجربہ تھا۔ بہرصورت یہی میرے لیے سب سے کامیاب سبق ثابت ہوا۔ اُس کے بعد میں نے اُن سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ◆◆◆

کھرا سچ

ایک زمانہ تھا کہ دیباچہ لکھنا خاصا مشکل کام تھا۔ اِس کا ہمیں خود تجربہ ہے، دو چار کتابوں پر دیباچے لکھنے کا اتفاق ہوا تو ہم اِس نتیجے پر پہنچے کہ کسی کتاب پر دیباچہ لکھنا اور پہاڑ کھودنا ایک ہی جیسے کام ہیں، کیوں کہ دیباچہ نگار کو کتاب کی خوبیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں، جو اُس میں موجود نہیں ہوتیں۔

(دستِ بخیل میں قلم، مشمولہ ''سخن در سخن'' از خامہ بگوش، مرتبہ مظفر علی سیّد، اکادمی بازیافت، کراچی، پہلی اشاعت: اپریل ۲۰۰۴ء)

یمن... ملکۂ سبا کا دیس

عبدالعظیم سمیع

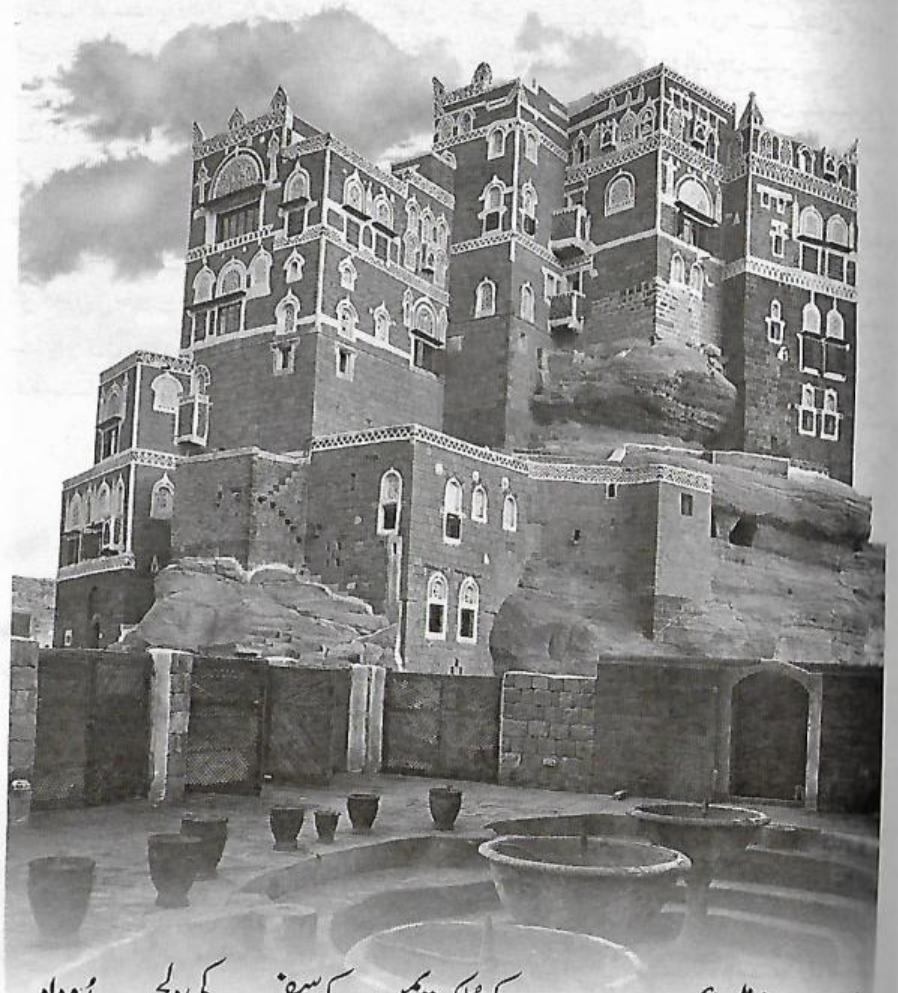

سرزمینِ عرب کے مُلک یمن کے سفر کی دلچسپ رُوداد

www.urdugem.com

سعودی عرب نے ۲۶ مارچ ۲۰۱۵ کو یمن پر فضائی حملے شروع کیے جس کو یمن حکومت اور متحدہ عرب عمارات کی پشت پناہی حاصل تھی۔ تقریباً تین سال سے جاری اس جنگ میں دس ہزار سے زیادہ لوگ جاں بحق جبکہ بیس لاکھ سے زیادہ افراد بے گھر ہو گئے ہیں۔ سعودی عرب نے یہ جنگ یمن کے ہوتی قبائل کے خلاف شروع کی ہے۔ اِس جنگ کے نتیجے میں انسانیت سوز صورت حال جنم لے رہی ہے۔ لاتعداد بے گھر خاندان اب غاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ اِن بے گھر افراد کو ناقابل برداشت صورتِ حال کا سامنا ہے۔

پانی اور غذائی قلت کے ساتھ ساتھ سخت موسمی حالات بھی یمنیوں کی مشکلات میں اضافے کا سبب ہیں۔ ۱۰ فیصد سے زیادہ یمن کی آبادی انخلا پر مجبور ہو گئی ہے۔ قدیم شہر صنعاء بلکہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی جا بجا ملبے کے ڈھیر یمن کے عوام کی حالت پر نوحہ کناں ہیں۔ وہ ننھے ہاتھ جن میں قلم ہونے چاہئیں، مختلف چھوٹی موٹی اشیا فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ یونیسکو کے مطابق ۲۵۰۰ سال قدیم شہر صنعاء کے عجائب گھر اور قدیم عمارات کو بھی اس جنگ کے نتیجے میں نقصان پہنچا ہے۔ خانہ جنگی اور سعودی عرب کے فضائی حملوں نے یمن کی معاشرتی زندگی تہ و بالا کر دی ہے۔

شمارۂ جنوری میں میرا مضمون وانوا تو قارئین نے بے پناہ پسند کیا اور اس سلسلے میں مجھے بے شمار تعریفی و توصیفی خطوط اور ای میلز موصول ہوئیں۔ اپنے سیاحتی اور پیشہ ور دوروں کو سفرنامے کی شکل میں آپ سب تک پہنچانے کے لیے میں اُردو ڈائجسٹ کا شکر گزار ہوں۔ خاص طور پر ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، طیب اعجاز قریشی اور عافیہ مقبول جہانگیر، جنہوں نے میری اُس روداد کی نوک پلک سنوارنے میں راہنمائی اور مدد کر کے میرے لکھنے کے شوق کو مہمیز دی۔ اسی کے پیشِ نظر

اب یمن کا تفریحی اور معلوماتی مضمون آپ کے لیے حاضر ہے۔ یہ اُن دنوں کی یادیں تازہ کرتا ہے جب وہاں حالات اتنے خراب نہیں تھے۔

مجھے ۲۰۱۴ء میں ٹیلی کام کے پراجیکٹ پر کام کرنے کے لیے یمن جانے کا موقع ملا۔ یمن جزیرہ نما عرب کا حصہ ہے۔ اس کے ہمسایہ ممالک میں عمان اور سعودی عرب شامل ہیں جبکہ خلیج عدن اس کے جنوب میں واقع ہے اور اس کے علاوہ ہمسایہ ملک، جبوتی افریقی ملک ہے اور یمن کا بیشتر مزدور طبقہ جبوتی ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ گھریلو ملازمہ یا صفائی پر مامور افراد بھی جبوتی یا سوڈان سے ہی یمن میں روزگار حاصل کرنے کی نیت سے آتے ہیں۔ دو کروڑ ستر لاکھ کی آبادی کے حامل یمن میں شرح خواندگی مردوں میں ۷۷ فیصد اور خواتین میں ۴۰ فیصد کے قریب ہے۔

عبداللہ الصالح نے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۰ء تک جنوبی یمن پر حکمرانی کی اور ۱۹۹۰ سے ۲۰۱۲ء تک جمہوریہ یمن کے صدارتی عہدے پر فائز رہے۔ یمنی حکومت بنانے اور اقتدار میں آنا ہی یمن میں جاری خانہ جنگی کی وجہ تنازع ہے۔ اس کے لیے اندرونی اور بیرونی عناصر بھی مدد فراہم کر رہے ہیں۔ شام میں جاری جنگ کے باعث شام (Syria) کے پناہ گزین بھی کافی تعداد میں براستہ سعودی عرب یمن میں داخل ہوئے اور اکثر مساجد کے باہر شامی پناہ گزین بھیک مانگتے ہوئے دکھائی دیے۔

یمن پہنچنے کے لیے میں نے صنعاء فضائی روٹ اختیار کیا جو لاہور سے دوبا تقریباً پونے چار گھنٹے پر مشتمل قطر ائیر

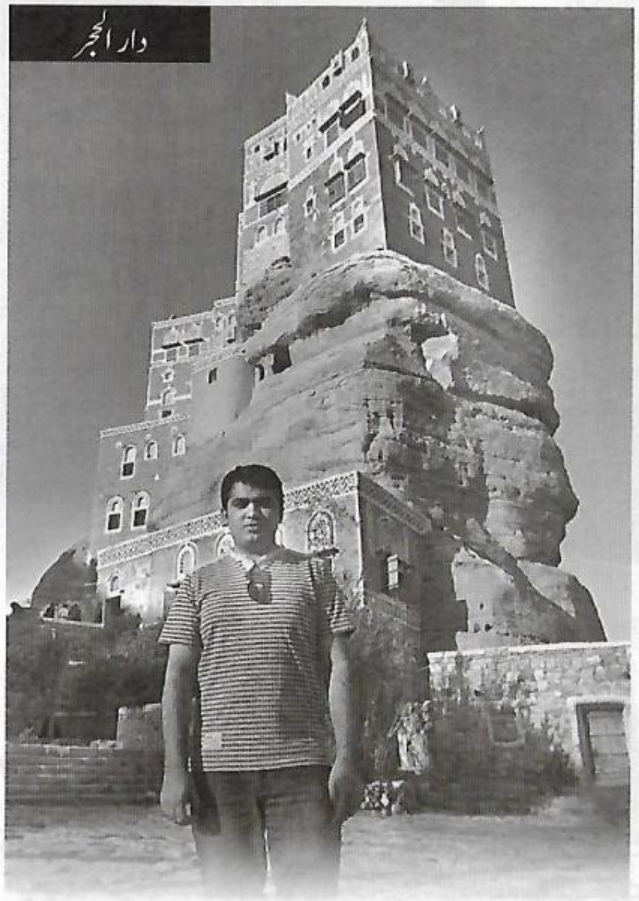

www.urdugem.com

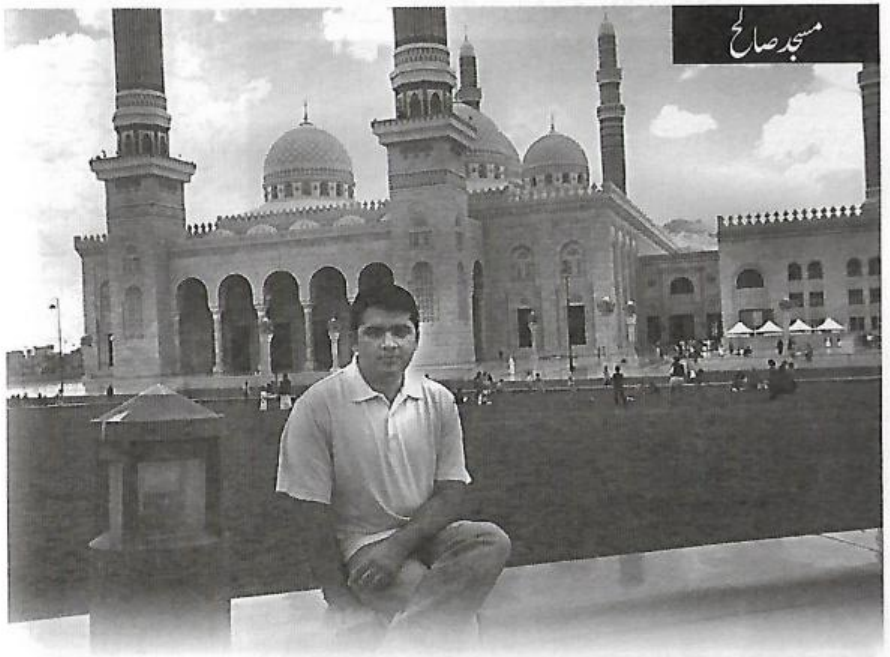
مسجد صالح

ویزے کی پرواز ہے۔ اس روٹ کا خرچہ پاکستانی ۸۳ ہزار روپے تھا۔ دو ہامیں چار گھنٹے کا ٹرانزٹ پھر یمن کے دارالحکومت صنعاء کے لیے پونے تین گھنٹے کی پرواز ہوتی ہے۔ اس کا ویزا میری کمپنی نے ہی لگوایا تھا۔ یہ محض کاغذی ویزہ ہے جو آن لائن ای میل کے ذریعے موصول ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو اُس کا پرنٹ لے کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسے ائیر لائن سے Ok To Board کروانا پڑتا ہے۔ اس کا کاغذی پرنٹ ہوائی اڈے پر لازمی آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ چونکہ یمن میں امن و امان کے حالات اچھے نہیں اور القاعدہ کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ تفتیش کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں لہٰذا کمپنی کی طرف سے تمام کاغذات ہونے کے باوجود مجھ سے بھی میرے آنے کا مقصد ہوٹل کا نام، بکنگ وغیرہ جیسے سب سوالات کیے گئے۔

صرف اتنا ہی نہیں، جو آپ کو ہوائی اڈے پر لینے آتا ہے، امیگریشن حکام اُسے بھی شاملِ تفتیش کرتے اور اندر بلاتے ہیں۔ اُن کا سوال ہوتا ہے کہ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ اس کی مکمل تفتیش کرنے کے بعد ہی وہ آپ کو جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ یمن میں دخول ویزا تو درکار ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ جب آپ نے خروج کرنا ہو تو بھی آپ کو ایک خروج ویزہ درکار ہوتا ہے جس کا دورانیہ تقریباً دو ہفتے ہوتا ہے۔ انہی دو ہفتے کے اندر اندر آپ نے یمن سے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ آج کل یمن میں پروازیں منسوخ ہیں اور وہاں پہنچنا ناممکن ہے۔ اس لحاظ سے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یمن حالتِ جنگ سے پہلے دیکھنے کا موقع دے دیا۔

یمن میں ٹیلی کام سیکٹر میں سبافون کا راج تھا جس کے لیے ہم وہاں گئے تھے۔ پاکستان کے ساتھ ان کا International Roaming Agreement ہے جس کی وجہ سے آپ کی اپنی سم بھی وہاں استعمال ہو سکتی ہے۔ وہاں امن و امان کی صورت حال اچھی نہیں تھی، لہٰذا دارالحکومت صنعاء سے باہر جانے کے لیے بھی آپ کو مقامی پولیس اسٹیشن سے ایک اجازت نامہ درکار ہوتا جسے تصریح کہتے ہیں۔

یمن کی قومی زبان عربی ہے اس لیے وہاں عمومی طور پر عربی ہی بولی جاتی ہے۔ جہاں تک کرنسی کا تعلق ہے۔ وہ یمنی ریال کہلاتی ہے۔ اب جنگ کے باعث کرنسی گراوٹ کا شکار ہو چکی۔ میں نے فروری ۲۰۱۴ء سے لے کر اپریل ۲۰۱۴ء تک یمن میں کام کیا۔ ایک امریکی ڈالر تقریباً ۲۱۵ یمنی ریال کے برابر ہے۔ یمن کا انٹرنیشنل ڈائیلنگ کوڈ ۹۶۷ ہے۔ GMT+3 Time Zone یعنی پاکستان سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔

یمن کا دارالحکومت صنعاء ہے جو قدیم ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں جن مقامات کو دیکھنے کا موقع ملا اُن میں دارالحجر، وادی دہر، مسجد صالح، باب یمن، مسجد کبیر جسے مسجد علی بھی کہا جاتا ہے، کے علاوہ قدیم صنعاء بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاپنگ مال بھی کافی موجود ہیں۔ قابلِ ذکر لیبیا سینٹر، شمائل حریری ہیں۔

جنگ کے بعد اب یمن کا دارالحکومت عدن میں منتقل ہو چکا۔ صنعاء دنیا کا تیسرا بلند ترین دارالحکومت ہے۔ اب سب سے بلند دارالحکومت لاطینی امریکا میں ہے جس کا ذکر میں آئندہ کسی تحریر میں کروں گا۔ صنعاء کافی اونچائی پر ہے شاید اسی لیے وہاں بارشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ تقریباً صبح کے وقت دھوپ بھی ہو تو دوپہر کے وقت بارش کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ شام کے وقت موسم کافی خوشگوار ہو جاتا ہے۔

یمن میں پاکستانی سفارتخانہ بھی موجود ہے اور سن ۲۰۱۵

مسجد الکبیر

www.urdugem.com

میں جنگ کی صورتحال پیدا ہوئی تھی تو پاکستانی سفارت خانے نے وہاں موجود پاکستانیوں کو بحفاظت یمن سے باہر نکلنے میں کافی مدد بھی کی تھی جن میں میرے دوست احباب بھی تھے جو وہاں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔

یمن کی معیشت اتنی اہمیت کی حامل نہیں کیونکہ اس کا شمار عرب کے سب سے غریب ممالک میں ہوتا ہے۔ یمن کی نصف آبادی زراعت سے منسلک ہے۔ قابلِ ذکر زرعی پیداوار قات، گنا اور مکئی ہیں۔ یمن میں بیروزگاری کی شرح ۳۷ فیصد اور فی کس آمدنی اندازاً ۹۹۰ امریکی ڈالر بنتی ہے۔ اگرچہ یمن میں پٹرول کافی مقدار میں نکلتا ہے لیکن یہاں آئل ریفائنری سسٹم نہیں لہٰذا زرِمبادلہ کمانا ممکن نہیں ہوتا اور اسے درآمد کر دیا جاتا ہے۔ البتہ بڑی پٹرولیم کمپنیوں کے دفاتر یہاں موجود ہیں۔ پاکستان بھی چونکہ ترقی پزیر ملک ہے لہٰذا ہمیں بھی یہاں کارخانہ سازی کو فروغ دینا چاہیے تاکہ ہم اپنے خام وسائل کو احسن طریقے سے استعمال کر کے زرِمبادلہ کما سکیں۔

بجلی کی کمی اور ترسیل میں خرابی کے باعث لوڈشیڈنگ عام تھی۔ پوری پوری رات بھی شہر تاریکی میں ڈوبا رہتا تھا۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جنریٹر کا معقول انتظام بھی ضروری تھا جس کے باعث مناسب رہائش بھی مہنگی میسر تھی۔ ایک بیڈ روم اپارٹمنٹ تقریباً ایک ہزار ڈالر ماہانہ کرایہ میں دستیاب تھا۔

لباس میں یمنی کرتا اور تہبند پہنتے ہیں۔ ایک خنجر جسے عربی میں جُمبایا کہا جاتا ہے، اسے یہ ہمیشہ اپنی قمیص میں رکھتے ہیں۔ تمام خواتین کے لیے عبایا پہننا لازمی ہے۔ مرد حضرات سر پر صافہ بھی باندھتے ہیں۔

کھیلوں میں یہ لوگ فٹ بال کے شوقین ہیں لیکن چونکہ

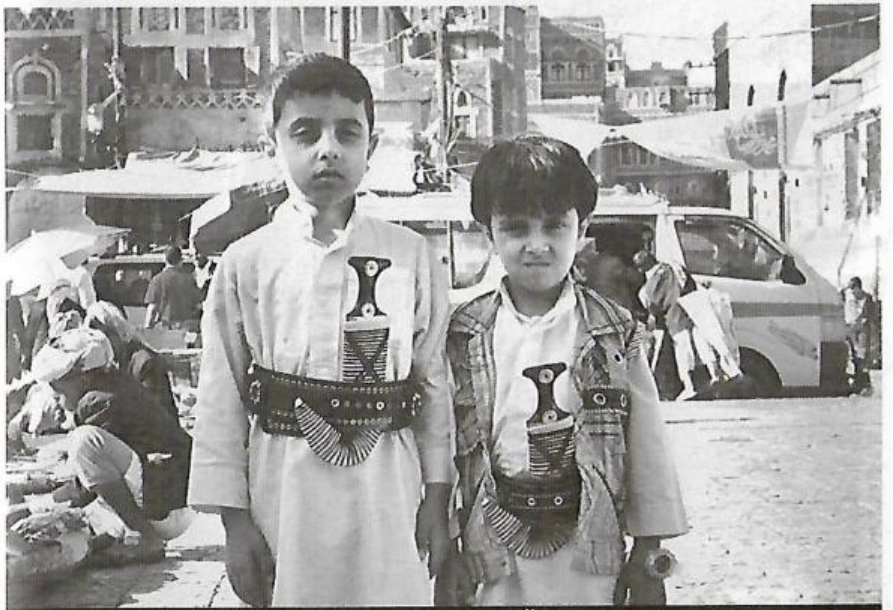

مقامی بچے اپنے قومی لباس میں جُمبیا لگائے ہوئے

یہاں کافی تعداد میں پاکستانی اور ہندوستانی موجود ہیں، اس لیے کرکٹ کے ٹورنامنٹ بھی میں نے وہاں دیکھے اور خود بھی کرکٹ میچ کھیلے۔

جہاں تک کھانوں کا تعلق ہے۔ یمن کی مشہور ڈش جسے مندی کہتے ہیں، ہماری بریانی سے کافی ملتی جلتی ہے۔ اسے گوشت اور چاول کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔ چاول کو عربی زبان میں رُز بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح یخنی کو شوربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں زیادہ تر ریستوران میں فرشی نشست کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

یمنی پھلوں کے رس پینے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ خاص طور پر گاجر کا رس جسے عربی زبان میں جزر اور مالٹے کا رس یعنی بُرتقال کافی شوق سے پیتے ہیں۔ سڑک کے کنارے کافی تعداد میں مشروبات کی دکانیں موجود ہیں۔ سلاد کے طور پر ایک سہاوک نامی ڈش، جس میں ٹماٹر کے آمیزے جیسا ادرک، دھنیا، پودینا شامل کیا جاتا ہے، استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مچھلی کافی لذیذ ہوتی ہے جسے سمک کہتے ہیں۔ اور روٹی کو خبس کہا جاتا ہے۔

پھلوں میں انجیر جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے، کافی زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔ انجیر اور انار یمن کے مشہور پھل ہیں۔ مجھے پاکستانی کینو کھانے کا بھی اتفاق ہوا۔ کینو یمن میں کلو کے حساب سے ملتے ہیں۔

یمنی لوگ ”قات“ نامی ایک پتے کو چباتے اور منہ میں ہی جمع کرتے رہتے ہیں۔ اس کا غذائیت، ذائقے یا افادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح ہمارے ملک میں نسوار، یا سگریٹ نوشی شغلاً کی جاتی ہے، بالکل اُسی طرح یہ لوگ قات کو منہ میں رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا گال ایک طرف سے پھولا ہوا ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوا جیسے آیوڈین کی کمی کے باعث گلا پھولا ہو۔ کہیں یہ لوگ آیوڈین کی کمی کا شکار تو نہیں...... کیا یمنیوں کو

www.urdugem.com

کوئی بیماری ہے؟ پھر عقدہ کھلا کہ یہ دراصل قات ہے جو یہ اپنے گال کے اندر جمع کرتے رہتے ہیں۔ وہ دوپہر سے شام تک ان پتوں کو چباتے رہتے ہیں۔ یہ بالکل تازہ پتے ہوتے ہیں۔

یمن میں ٹرانسپورٹ کی کوالٹی اچھی نہیں لیکن ٹیکسی مل جاتی ہے۔ لوکل ٹرانسپورٹ ہمارے ملک کی پک اپ گاڑیوں جیسی ہوتی ہے۔ اس طرح کی ویگنیں وہاں چلتی ہیں۔ کرایہ تقریباً پچاس یمنی ریال ہوتا ہے۔ آپ شہر میں جہاں مرضی اُتر سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ موٹر سائیکل ٹیکسی بھی دستیاب ہوتی ہے۔

عربی زبان میں میوزیم کو متحف کہتے ہیں اور اس کے ملٹری میوزیم میں مینار پاکستان کا ماڈل بھی رکھا گیا ہے جو یمن اور پاکستان کے تعلقات کی عکاسی کرتا ہے۔ دیگر مقامات میں ایک ''تحریر میدان'' بھی ہے جہاں احتجاج وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ جگہ اس کے لیے مختص ہے۔

جس طرح لاہور میں اندرون شہر قدیم علاقہ ہے، اس طرح صنعاء میں بھی قدیم شہر ہے جسے قدیم صنعاء کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں پرانی اونچی اونچی عمارات ہیں۔ لیکن پرانی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کے ساتھ! اس کے اُوپر بہت خوبصورت نقش نگار اور رنگ ہوتے ہیں۔ میں نے وہاں پر کئی فوٹو گرافرز کو صرف قدیم صنعاء کی تصاویر لیتے دیکھا۔ یہ ثقافتی ورثے کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ یہاں ایک مشہور دروازہ باب یمن بھی ہے۔

جس طرح لاہور کے بارہ دروازے مشہور ہیں اسی طرح یمن کا باب یمن بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ۲۰۰۰ سال پرانا داخلی دروازہ ہے اور کافی عرصے تک تجارتی مرکز بھی رہا۔ یہاں سونیر سوق (بازار) کی دُکانیں ہیں۔ صنعاء کی بنیاد حضرت نوحؑ کے بیٹے شیم نے رکھی تھی۔ یہ کافی پرانا شہر ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دینا کے قدیم ترین شہروں میں شامل ہے۔

صنعاء کے اردگرد کافی خشک پہاڑ موجود ہیں۔ جن میں سبزہ کم ہے، لیکن شہر سے باہر جائیں تو دارالحجر کے راستے میں کچھ درخت پہاڑوں پر نظر آتے ہیں۔ صنعاء کے اردگرد سارے پتھریلے پہاڑ ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ یہاں سڑکوں اور شاہراہوں کے نام فاصلے یعنی کلومیٹر کے حساب سے رکھے گئے ہیں۔ جیسے ستین ۶۰ سبعین ۷۰۔ اسی طرح یہاں ۶۰ میٹر ۷۰ میٹر لمبی سڑکوں کو لمبائی کے مطابق نام دیے گئے ہیں۔

یہ سڑکیں رِنگ کی شکل میں ہیں جیسے ہماری رِنگ روڈ ہے۔ یمن کے پرچم میں تین رنگ سرخ، سفید اور سیاہ شامل ہیں۔ ۱۹۹۰ء تک شمالی یمن اور جنوبی یمن دو الگ الگ ملک تھے۔ ۱۹۹۰ میں یہ دونوں مل گئے اور جمہوریہ یمن کے نام سے مملکت قائم ہوئی۔

دارالحکومت صنعاء سے باہر مجھے دارالحجر یعنی پتھر کا گھر دیکھنے کا بھی اتفاق سے موقع ملا۔ یہ وادیٔ دہر میں واقع ہے۔ یہ صنعاء سے تقریباً پونے گھنٹے کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک اونچا مقام ہے جہاں پتھروں پر ایک عالیشان محل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ اب ایک میوزیم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

صنعاء کی سب سے خوبصورت اور بڑی مسجد صالح ہے۔ یہ بھی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ اس کی مشابہت اور محل وقوع کافی حد تک فیصل مسجد جیسا ہے۔ فیصل مسجد کی طرح اس کے اردگرد بھی پہاڑ ہیں۔ یہ یمن کے صدر عبداللہ صالح کے نام سے منسوب ہے۔ عبداللہ صالح کو دسمبر ۲۰۱۷ء میں حوثیوں نے ملک سے فرار ہوتے وقت قتل کر دیا تھا۔

قدیم صنعاء کی عمارات نہایت باریک اینٹوں سے تیار کی گئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے کسی بچے نے کھیلنے والے رنگ برنگے بلاکس سے بنائی ہوں۔ یہ بالکل وہی

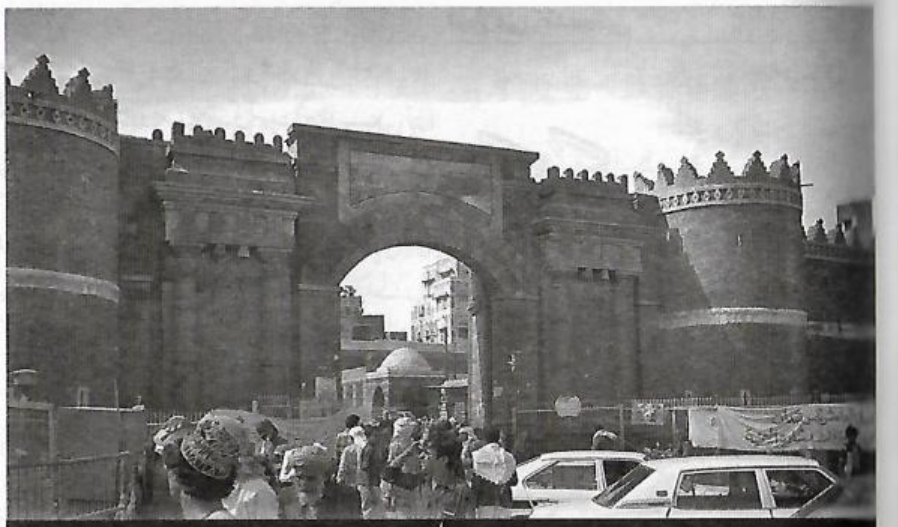

باب الیمن

نظر پیش کرتی ہیں۔ یمن میں ڈرائنگ روم کو مجلس کہتے ہیں۔ یہ نشستی ہوتا ہے۔ اس میں یمنی لوگ وقت گزارتے ہیں۔

یہاں پر ایک اور مشہور مسجد کبیر ہے۔ جس کی بنیاد حضرت محمد ﷺ کے کہنے پر حضرت علیؓ نے رکھی تھی۔ یہ سن ۶۲۰ء میں بنی اور ۱۴۰۰ سو سال پرانی ہے۔ مجھے وہاں جانے اور نماز ادا کرنے کا بھی موقع ملا۔

میں جنگ سے پہلے وہاں گیا تھا۔ تب وہاں اسلحے کی نمائش بہت ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی جب آپ نماز پڑھتے ہیں، تب صفوں میں بھی کلاشنکوف پڑی نظر آتی ہیں۔ ایک بات جو مجھے وہاں بہت اچھی لگی وہ مغرب و عشاء کی نماز کے اوقات کے درمیان کم فاصلہ ہے، تقریباً آدھے گھنٹے کا۔ جب آپ مغرب کی نماز پڑھنے مسجد آئیں تو عشاء کی نماز بھی ساتھ ہی پڑھ کے جاسکتے ہیں۔

یمن میں جو قاری حضرات ہیں، ان کی قرأت بہت اچھی ہے۔ وہ قرآن بہت ٹھہر ٹھہر کر اور قرأت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یمن کے دیگر شہروں میں اِب، عدن اور کچھ جزائر بھی ہیں۔ یمن کے پاس واقع بہت مشہور جزیرہ سقطریٰ امن کے زمانے میں کبھی بہترین سیاحتی مقام ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ملکہ سبا کا محل بھی یمن میں موجود ہے۔ سبا یمن کی وہ ملکہ تھی جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے۔ اسی کی مناسبت سے یمن کو سرزمین سبا (Land Of Sheba) بھی کہتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ یمن میں جلد سے جلد جنگ بندی ہو اور وہاں امن بحال ہو۔ آمین ◆◆◆

abdulazeem001@gmail.com

اگلی تحریر میں لاطینی امریکا کے خوبصورت ملک ایکواڈور (Ecuador) کی سیر کے لیے تیار ہو جائیں)

www.urdugem.com

حاکم کو بے عیب ہونا چاہیئے!

حکایاتِ سعدی سے سبق آموز واقعات کا انمول انتخاب

طالب ہاشمی

ایک عالم وفاضل استاد سے ایک شہزادہ بھی تعلیم پاتا تھا۔ استاد دوسرے طلبہ کی نسبت شہزادے پر بہت سختی کرتا تھا۔ ایک دن شہزادے نے تنگ آکر باپ کے پاس شکایت کی اور جسم سے لباس اتار کر استاد کی مار کے نشانات دکھائے۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا۔ اس نے استاد کو بلا کر پوچھا کہ تو دوسرے شاگردوں پر اتنی سختی کیوں نہیں کرتا جتنی میرے فرزند پر۔

استاد نے جواب دیا کہ شہزادے نے بڑے ہو کر بہت بڑی ذمہ داری سنبھالنی ہے اس لیے اسے دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ عاقل اور قابل ہونا چاہیے۔ بادشاہ کے ہاتھ اور زبان سے جو حرکت ہوتی ہے اس پر دنیا کی نظر ہوتی ہے اور عوام میں اس کا چرچا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عام لوگوں کے قول اور فعل کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ میں شہزادے کو تعلیم دینے اور اس کے اخلاق سنوارنے میں دوسروں سے امتیازی سلوک کرتا ہوں۔

اگر صد عیب دارد مرد درویش
رفیقا نش یکے از صد ندا نند
دیگریک ناپسند آیدز سلطان!
زا قلیمے با قلیمے سانند

(اگر ایک درویش میں سو عیب ہوں تب بھی اس کے ساتھی سو میں سے ایک کو بھی نہیں جانتے۔ لیکن اگر بادشاہ سے ایک ناپسندیدہ فعل بھی سرزد ہو تو اس کا چرچا ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہو جاتا ہے۔)

بادشاہ کو استاد کا جواب پسند آیا۔ اسے انعام واکرام سے سرفراز کیا اور اس کا منصب بڑھا دیا۔

قریب بہشت میں پہلے

دو آدمی قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ایک اپنے دولت مند باپ کی قبر پر اور دوسرا اپنے درویش باپ کی قبر پر۔ امیر زادے نے درویش لڑکے کو طعنہ دیا کہ میرے باپ کی قبر کا صندوق پتھر کا ہے۔ اس کا کتبہ رنگین اور فرش سنگ مرمر کا ہے اور فیروزے کی اینٹ اس میں جڑی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں تیرے باپ کی قبر کیسی خستہ حال ہے کہ دو مٹھی مٹی اس پر پڑی ہے اور دو اینٹیں رکھی ہیں۔

درویش زادے نے جواب دیا۔ "یہ درست ہے، لیکن کبھی تو سوچو کہ قیامت کے دن جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ تیرا باپ بھاری پتھروں کے نیچے جنبش کرے، میرا باپ بہشت میں پہنچا ہوگا۔"

جس کا کام اسی کو ساجھے

ایک شخص آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا۔ علاج کے لیے سلوتری (جانوروں کے معالج) کے پاس گیا۔ اس نے وہی دوا جو جانوروں کی آنکھوں میں لگاتا تھا، اس کی آنکھوں میں لگا دی۔ اس دوا سے آشوب چشم کیا ٹھیک ہونا تھا، بے چارہ اندھا ہو گیا اور سلوتری سے جھگڑنے لگا یہاں تک کہ معاملہ عدالت میں پہنچا۔

قاضی نے فیصلہ دیا کہ سلوتری پر کوئی تاوان نہیں اگر یہ شخص گدھا نہ ہوتا تو سلوتری کے پاس کیوں جاتا؟ داناؤں کے نزدیک یہ کم عقلی کی بات ہے کہ ایسے کام کو کسی ناتجربے کار آدمی کے سپرد کیا جائے جس کے لیے تجربہ اور مہارت فن لازم ہو۔

بوریا باف گرچه بافنده است
نبرندش بکار گاه حریر

(چٹائی بننے والا اگرچہ بننے والا ہے لیکن اس کو حریر بافی کے کام پر کوئی نہیں لگاتا۔)

اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ

ایک پارسا کے لڑکے کو اپنے چچا کے مرنے پر بہت سا مال و دولت ترکے میں ملا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم، اس نے دونوں ہاتھوں سے یہ دولت عیاشی میں اڑانا شروع کر دی۔ میں نے ایک بار اسے نصیحت کی کہ اے بیٹے! آمدنی سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

به کوہستان اگر بارا نبارد
بسالے دجله کرد وخشک رد دے

(اگر پہاڑ پر بارش نہ برسے تو ایک سال میں دریائے دجلہ ایک خشک نالہ بن جائے۔)

لہو ولعب کو چھوڑ دے اور پسندیدہ طرز عمل اختیار کر۔ ایسا نہ ہو کہ دولت ختم ہو جائے اور تجھے تکلیف ہو۔ آج کی راحت چھوڑ کر کل کے غم میں دُبلا ہونا محض حماقت ہے۔ جب اس کا عمل تبدیل نہ ہوا تو میں نے سمجھ لیا کہ بے وقوف آدمی پر کلام نرم و نازک بے اثر ہے، چنانچہ اس سے کنارہ کشی کر لی اور داناؤں کے اس قول پر عمل کیا:

بلغ ما علیک نان لم یقبلوا ما علیک

(جو چیز تجھ پر واجب ہے تو لوگوں تک پہنچا دے۔
اگر کوئی قبول نہ کرے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔)

کچھ عرصہ بعد وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ نوجوان نے تمام جائیداد عیاشی اور فضول خرچی میں برباد کر ڈالی اور ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج ہو گیا۔ میں نے اسے پیوند لگے کپڑے پہنے بھیک مانگتے دیکھا تو سخت غصہ آیا اور جی میں آیا کہ اس سے کہوں کہ کیوں میں تجھے اس دن سے ڈراتا نہ تھا؟ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس حالت میں میری بات اس کے زخموں پر نمک چھڑکے گی اور اس کے دکھ میں اضافہ ہوگا۔

www.urdugem.com

ظاہری تن و توش بیکار ہے

ایک دفعہ میں بلخ سے چند شامیوں کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا۔ ان دنوں قزاق اکثر قافلوں کو لوٹ لیتے تھے اور ہمیں بھی راستے میں ہر لحظہ قزاقوں کے حملہ کا ڈر تھا۔ ہماری راہبری اور نگہبانی ایک قوی الجثہ وجیہہ نوجوان کر رہا تھا۔ وہ سر تا پا ہتھیار سجائے فوجی بنا ہوا تھا۔ جوانی کے زور میں جو دیوار سامنے آتی اسے گرا دیتا اور بڑے بڑے تناور درختوں کو اپنی قوت بازو سے اکھاڑ دیتا اور فخریہ لہجے میں یہ شعر پڑھتا تھا۔

پیل کو تا کتف بازو گرداں بیند
شیر کو تا کف و سر پنجہ مرداں بیند

(ہاتھی کہاں ہے کہ پہلوانوں کے بازو اور شانے دیکھے۔ شیر کہاں ہے کہ مردوں کی ہتھیلی اور پنجہ دیکھے۔)

اس نوجوان کا تن و توش فی الواقع بہت بھاری تھا اور اس کی شہ زوری میں کوئی کلام نہ تھا، لیکن اس نے اپنے گھر کے اندر ناز و نصیحت سے پرورش پائی تھی اور زمانے کی سختی نرمی نہیں دیکھی تھی۔ اس سے پہلے اس نے نہ کبھی سفر کیا تھا نہ اس کے کان کبھی شہسواروں کے نعروں اور جنگی نقاروں کی آواز سے آشنا ہوئے تھے۔

اثنائے سفر میں یکا یک ایک چٹان کے پیچھے سے دو قزاق نمودار ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں لکڑی اور دوسرے کے ہاتھ میں موگری تھی۔ انھوں نے ہم سے لڑنے کا قصد کیا تو میں نے نوجوان سے کہا کہ دیکھتا کیا ہے آگے بڑھ اور ان کا کچومر نکال کر رکھ دے، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ نوجوان کے ہاتھ سے کمان گر پڑی اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ناچار ہم نے اپنا مال اسباب اور ہتھیار قزاقوں کے حوالے کیے اور اپنی جان بچائی۔

مردان خدا اپنی عبادت پر ناز نہیں کرتے

میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ کعبہ کی چوکھٹ پر اپنا سر رگڑتے رو رہا تھا کہ اے غفور اے رحیم! تو جانتا ہے کہ مجھ ظالم اور جاہل سے کیا ہو سکتا ہے۔ عبادت گزار عبادت کا بدلہ اور سوداگر سامان کی قیمت چاہتے ہیں۔ میں نا چیز اُمید لے کر آیا ہوں نہ بندگی کے عوض بھیک مانگتا ہوں اور نہ تجارت کرنے آیا ہوں۔

اصنع بنا ما انت اھلہ ولا تفعل بنا ما نحن اھلہ

(ہمارے ساتھ وہ کر جس کا تو اہل ہے وہ نہ کر جس کے ہم سزاوار ہیں۔)

می نگویم کہ طاعتم بپزیر
قلم عفو بر گنا ہم کش

(میں یہ نہیں کہتا کہ میری عبادت قبول کر لے۔ ہاں معافی کا قلم میرے گناہ پر پھیر دے۔)

گدھ اور چیل

ایک گدھ نے چیل سے کہا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ کسی کی نظر تیز نہیں ہوگی۔ چیل نے کہا ایسی ڈینگیں نہیں مارنی چاہئیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تیری نظر مجھ سے بھی زیادہ تیز ہوگی۔ گدھ اترا کر بولا۔ ”دیکھو گندم کا ایک دانہ زمین پر پڑا ہے۔ کیا تو اسے دیکھ سکتی ہے؟“ چیل حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگی اور پھر کہنے لگی کہ اس کا کیا ثبوت کہ تو سچ کہہ رہا ہے۔

گدھ نے جھلا کر کہا ”اس کا ثبوت پیش کرنا بھلا کون سا مشکل کام ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی اُڑان اور نظر کی تیزی کے گھمنڈ میں گندم کے دانے پر جھپٹا۔ وہاں کسی شکاری نے جال بچھا رکھا تھا۔ گدھ اس میں پھنس کے رہ گیا اور اس کی ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ چیل نے اب چلا کر کہا۔ ”کم بخت گندم کے اس دانے کو دیکھنے سے کیا فائدہ جب تجھے اتنا بڑا جال نظر نہ آیا۔“ گدھ اب رو کر کہنے لگا۔

نہ باد جذبہ با قدر سود مند

(تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔)

موت کو سختی اور آرام سے کچھ تعلق نہیں

کوفہ سے ایک قافلہ سوئے حجاز روانہ ہوا تو ایک پیدل چلنے والا درویش ننگے سر اور ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ افتاں و خیزاں اکڑ کر چل رہا تھا اور یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

نہ باشتر برسو ارم نہ چو اشتر زیر بارم
نہ خداوند اعیت نہ غلام شہریارم
غم موجود پریشانئے معدوم ندارم
نفسے میزنم آسودہ عمر ہے میگزارم

(نہ تو میں اونٹ پر سوار ہوں اور نہ اونٹ کی طرح بوجھ تلے دبا ہوں۔ نہ رعیت کا بادشاہ ہوں اور نہ بادشاہ کا غلام ہوں۔ نہ موجود کا غم رکھتا ہوں اور نہ اس کی فکر ہے جو موجود نہیں ہے۔ آرام سے سانس لیتا ہوں اور عمر گزارتا ہوں۔)

ایک مالدار اونٹ سوار نے اس سے کہا ”اے فقیر کہاں جا رہا ہے؟ سفر کی صعوبت تجھے مار ڈالے گی۔“ اس نے نہ سنا اور صحرا کی طرف چل دیا۔ جب قافلہ ”نخلہ محمود“ کے مقام پر پہنچا تو مالدار اونٹ سوار فوت ہو گیا۔ درویش اس کے سرہانے آیا اور کہا: ہم تو سختی سے نہ مرے اور تو خوش بخت اونٹ پر مر گیا۔

اے بسا اسپ تیز رو کہ بماند
کہ خر لنگ جاں بمنزل بُرد

(بہت سے تیز رو گھوڑے ہیں، جو منزل سے رہ گئے اور لنگڑا گدھا اپنی جان منزل تک لے گیا۔)

بھوکے کے لیے روکھی سوکھی روٹی بھی نعمت

ایک بھوکا پیاسا درویش ایسی جگہ پہنچا جہاں کا مالک بڑا اہل علم و فضل کا قدردان تھا۔ بہت سے علما و فضلا اس دولت سے وابستہ تھے اور سخی امیر کی قیام گاہ پر اکثر

عجوبے نگر نگر کے

پیشہ ورانہ نرسنگ کی بانی فلورنس نائٹ انگیل نے ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا میں برطانوی فوجیوں کی بے پناہ خدمت کی، اس نے ایک الو پال رکھا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتی اس الو کو اپنی جیب میں ڈال کر ساتھ لے جایا کرتی تھی۔

☆☆

۱۸۱۵ء میں واٹرلو کے میدان میں نپولین کو شکست دینے والے ولنگٹن کے پہلے ڈیوک آرتھر ویلزلی کا کورٹ مارشل ہوا لیکن بعد میں اسے تمام الزامات سے بری کر دیا گیا۔ ۱۸۲۸ء میں وہ انگلستان کا وزیر اعظم بنا۔ وہ بیک وقت چھ گھڑیاں اپنے پاس رکھتا تھا۔ یہ سب جیبی گھڑیاں تھیں۔ ڈیوک کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کسی طے شدہ ملاقات میں تاخیر نہیں کی۔

☆☆

۱۸۵۰ء میں شائع ہونے والی مشہور زمانہ کتاب ”سکارلیٹ لیٹر“ کا مصنف نتھانیئل ہاتھورن اپنی بیوی کے ہاتھوں سے کوئی خط لے کر پڑھنے سے پہلے اپنے ہاتھ دھوتا تھا۔

☆☆

موجودہ ملکہ برطانیہ الزبتھ کے باپ جارج ششم کا اصل نام البرٹ تھا۔ ملکہ وکٹوریہ (۱۹۰۱ء - ۱۸۳۷ء) نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ آئندہ کوئی بادشاہ البرٹ نہ کہلائے، چنانچہ شاہ جارج ششم نے اپنی پردادی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے البرٹ کے بجائے جارج ششم کے نام سے اپنا عہد حکومت نبھایا۔

www.urdugem.com

ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ درویش کے آنے سے پہلے ایسی ہی ایک محفل وہاں جمی ہوئی تھی۔ وہ بے چارہ چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

وہ لوگ سمجھ گئے کہ یہ بیچارہ بھوکا ہے۔ فوراً اس کے سامنے دسترخوان بچھایا گیا اور جو کچھ حاضر تھا، اس پر لا کر رکھ دیا گیا۔ درویش کھانے میں مشغول ہوا تو میزبان نے کہا، اگر آپ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تو کیا اچھا ہو۔ میرے نوکر بھنے ہوئے کوفتے تیار کر رہے ہیں۔ درویش نے سر اٹھایا اور ہنس کر کہا۔

کوفته بر سُفره من گو میاش
کوفته نان تهی کوفته است

(اگر میرے دسترخوان پر کوئی کوفتہ نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ فاقہ زدہ تھکے ہوئے کے لیے تو روکھی روٹی بھی کوفتہ ہے۔)

سونے کی اینٹ کہاں تک ساتھ دے گی؟

ایک پارسا کو سونے کی اینٹ کہیں سے مل گئی۔ دنیا کی اس دولت نے اس سے نور باطن کی دولت چھین لی۔ وہ ساری رات یہی سوچتا رہا کہ اب میں سنگ مرمر کی ایک عالی شان حویلی بنوا کر بہت سے نوکر چاکر رکھوں گا۔ عمدہ عمدہ کھانے کھاؤں اور اعلیٰ درجے کی پوشاک سلواؤں گا۔ غرض تموّل کے خیال نے اسے دیوانہ بنا دیا۔

نہ کھانا پینا یاد رہا اور نہ ذکر حق۔ صبح کو اسی خیال میں مست جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص ایک قبر پر مٹی گوندھ رہا ہے تاکہ اس سے اینٹیں بنا لے۔ یہ نظارہ دیکھ کر پارسا کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کو خیال آیا کہ مرنے کے بعد میری قبر کی مٹی سے بھی لوگ اینٹیں بنائیں گے۔ عالی شان مکان، اعلیٰ لباس اور عمدہ کھانے سب یہیں دھرے رہ جائیں گے۔ اس لیے سونے کی اینٹ سے دل لگانا بے کار ہے۔ ہاں دل لگانا ہے تو اپنے خالق سے لگا۔ یہ سوچ کر اس نے سونے کی اینٹ کہیں پھینک دی اور پھر پہلے کی طرح زہد و قناعت کی زندگی بسر کرنے لگا۔

بکن سرمه غفلت از چشم پاک
که فرد اشوی سرمه در زیر خاک

(غفلت کا سرمہ آنکھ سے صاف کر لے۔ اس لیے کہ کل کو تو بھی مٹی کے نیچے سرمہ ہوگا۔)

بلندی چاہتے ہو تو تواضع اختیار کرو

ایک نیک سیرت نوجوان تحصیل علم کے لیے روم میں وارد ہوا۔ لوگ اس کے اعلیٰ اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے اور اسے ایک مسجد میں عزت و احترام کے ساتھ ٹھہرایا۔ ایک دن امام مسجد نے اسے کہا کہ مسجد سے خاک اور گرد جھاڑو۔ امام کی بات سن کر نوجوان مسجد سے باہر چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ خدام مسجد اور دوسرے امام مسجد نے سمجھا کہ نوجوان مسجد کی خدمت سے پہلوتہی کرتا ہے، اس لیے غائب ہو گیا ہے۔

دوسرے دن مسجد کے ایک خادم نے اسے راستے میں پکڑ لیا اور کہا کہ تم نے بہت بُری حرکت کی ہے۔ اے متکبر نوجوان! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ لوگ خدمت کی بدولت ہی کسی مرتبے پر پہنچتے ہیں۔

نوجوان اس کی باتیں سُن کر رو دیا اور کہنے لگا: کہ اے میرے قابل احترام دوست، حقیقت یہ ہے کہ میں نے مسجد میں مطلق خاک اور گرد نہیں دیکھی۔ اس لیے میں نے یہی سمجھا کہ میں ہی اس پاک جگہ میں خاک آلود ہوں۔ سو میں مسجد سے باہر آ گیا تاکہ اللہ کا گھر خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔

بلندیت باید تواضع گزین
که ای بام راه نیست سلم جزین

(اگر تجھے بلندی درکار ہے تو تواضع اختیار کر۔ اس لیے کہ اس بالاخانہ پر چڑھنے کے لیے اس (خاکساری) کے علاوہ کوئی سیڑھی نہیں۔)

عشنا پتافی

شیشے کی دیواریں

ایک بہو کا دلدوز ماجرا، جب وہ ساس بنی تو ماضی کے خیالات اُسے چرکے لگانے لگے

کیا تھا اگر زندگی بھی کسی ریل جیسی ہی ہوتی، چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر نہ سہی، کسی بڑے جنکشن پر ہی ذرا دیر کو ٹھہر تو جاتی مگر...

''باجی چاء پی لو''۔ (باجی چائے پئیں)۔ دائرہ در دائرہ پھیلتی سوچوں میں ایک پتھر آ گرا۔ سامنے والی نشست پر بیٹھی عورت مجھ سے مخاطب تھی۔ کھلے منہ کا گول پیالا سنہری چائے سے بھرا ہوا تھا۔ چائے کی خوشبو مجھے اس کی طرف لبھانے لگی۔ مگر اس پیالے کو انگلیوں اور انگوٹھے کی پوروں کے درمیان تھامنا بڑی مہارت کا کام تھا۔

لے لوں؟..... یا انکار کر دوں؟ میں سوچ میں پڑ گئی۔ چلتی ہوئی ریل میں چائے پینے کا ویسے بھی کبھی کچھ تجربہ نہ تھا۔

''اری بلقیس! ایک پیالی چاء دے۔'' اس نے کسی سے کہا تھا کہ ایک پیالہ اٹھا کر دے۔ اس کے ساتھ برابر عمر کی تین اور کہاں بیٹھی تھیں۔ انہی میں سے ایک نے ٹوکری سے پیالہ نکال کر دی۔

دیکھنے میں تو سیدھی سادھی دیہاتی عورت تھی مگر اس نے بھانپ لیا کہ میں کیوں ہچکچا رہی ہوں۔

''شکریہ۔'' مجھے لگا کہ میں کئی برس کے بعد مسکرائی ہوں۔

www.urdugem.com

"تساں تاں روٹی وی نئیں کھادی" (آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا)

"بس بہن بھوک ہی نہیں تھی۔" میں بولی۔ گرم چائے کے چھوٹے سے گھونٹ نے دکھتے سر کو ہلکا کر دیا تھا۔

میں نے ریل کی کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا، ایک روشن دن طلوع ہو رہا تھا۔ ریل دور دور تک پھیلے بے آباد میدانوں کو کہیں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اب کسی آبادی سے گزر رہی تھی۔ ہر طرف صبح کے وقت کی مخصوص چہل پہل محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں طرف ٹریفک رکی ہوئی تھی کہ باادب... باملاحظہ... ہوشیار۔

رکشے، ویگنیں، موٹر سائیکلیں، بسیں، کاریں رُکی ہوئی تھیں۔ چہرے اور آنکھیں ریل کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ ہر آنکھ کے تاثرات الگ تھے۔ کچھ آنکھوں میں نیند کا ہلکا سا خمار ابھی باقی تھا۔ کچھ آنکھوں میں بھاگتی ہوئی ریل دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ کچھ آنکھیں بار بار گھڑی کی سمت دیکھتی تھیں۔ کچھ آنکھیں ایسی تھیں کہ یوں تاثر ملا، ہر چیز سے بے زار کھڑے ہیں تو کیا؟ اور چل پڑیں گے تو کیا۔

جب ریل گزر جائے گی تو جیسے ساتویں پری کے چھڑی گھمانے سے سویا ہوا شہر جاگ اٹھے گا۔ انجنوں کے سٹارٹ ہونے کی آوازیں، گاڑیوں کے ہارن اور جلد سے جلد منزل پر پہنچنے کی جستجو جاگ اٹھے گی۔

وقت کے ایک مختصر لمحے میں ریل ان سب چہروں اور ساری آنکھوں کے سامنے دھڑ دھڑاتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔ وہ شہر پیچھے رہ گیا تو مجھے خیال آیا کہ اتنے مختصر سے لمحے میں، میں نے اتنا سب کچھ کیسے دیکھ لیا۔ تب وسط جولائی کی اس اجلی چمکیلی صبح مجھ پر عجیب سا انکشاف ہوا کہ یہ لمحہ تو مجھ پہ دوسری دفعہ گزر رہا ہے۔ ایک دفعہ یوں کہ گزرنے ہی نہ دیتا تھا۔

☆☆☆☆☆

"اللہ! اور کتنی دیر ہے ریل کے آنے میں! اتنی دیر پہلے ہی پھاٹک بند کر دیے۔" میں نے فائل کور سے خود کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وین میں لڑکیاں اس قدر بھری ہوئی تھیں کہ فائل کور ہلانے کی جگہ بھی نہ تھی۔

"ریل کا سفر کتنا رومانی ہوتا ہے نہ۔" جانے کس لڑکی نے کہا تھا۔

"کپڑوں کی ساری استری تو یہیں خراب ہو گئی۔" اس عمر کی پریشانیاں بھی کیسی تھیں...

اور اب اتنے برس بعد وہی لمحہ دوسرے رخ سے گزرا تھا۔ اب دل چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کو ہی سہی، وقت ذرا ٹھہرے تو...

"باجی...؟"

میں اپنے خیالوں سے چونک گئی۔

"اری بلقیس تھالی دے۔" آواز آئی۔ تین لڑکیوں میں سے ایک نے ٹوکری کھولی۔

پلیٹ ملی تو اس نے رومال کی کئی تہوں میں لپٹی روٹی نکال کر پلیٹ پر رکھی اور اوپر ڈھیر سارا اچار۔

مجھے اس کی سخاوت پہ پیار آیا۔ اس کے ہاتھوں پر مشقتوں کی کہانیاں رقم تھیں۔ کالی چادر کان کے قریب سے ہٹی ہوئی تھی جس سے اس کے کھچڑی بال جھانکتے تھے مگر وہ مطمئن تھی۔ شاید اس کی زندگی میں وقت یوں پلٹ پلٹ کے نہ گزرتا تھا۔

دس سال میں نے سکول میں گزار دیے، استانیوں پہ رشک کرتے ہوئے، کہ ان کے کیسے مزے ہیں۔ روزانہ تیار ہو کے آتی ہیں، جماعت میں لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی،

اسٹاف روم میں چائے پی، گپ شپ لگائی پھر گھر جا کے مزے سے سو گئے۔ نہ ہوم ورک کی فکر نہ کسی سزا کا ڈر اور قسمت دیکھیے وقت مجھے پھر وہیں لے آیا مگر اب میں شیشے کی دیوار کے دوسری طرف تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہمارے وجود کی دیواریں بھی شیشے جیسی ہیں۔ یہاں سے باہر کا منظر نظر آتا ہے مگر محسوس نہیں ہوتا۔ اب لگتا تھا کہ لڑکیوں کے بے فکری کے دن ہیں، نہ کورس ختم کروانے کی فکر، نہ رزلٹ شو کروانا... نہ حاضریاں... نہ چیکنگ...

"باجی: کھتاں وینڈے پیو؟" (باجی! کہاں جا رہی ہیں؟) وہ شاید میری چپ سے گھبرا جاتی تھی اس لیے بار بار مجھے مخاطب کرتی۔

"بہاول پور جا رہی ہوں... بیٹے کے پاس۔"

"کنے بال نے تواڈے...؟" (کتنے بچے ہیں آپ کے؟)

"دو بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔"

"اچھا... اچھا... وڈی حیاتی ہوویں (اللہ زندگی دے)۔

"میڈیاں وی اے ترے دھیریں ان۔" وہ ذرا دیر چپ رہ کے پھر بتانے لگی "تے کو ہک پتر۔" (میری بھی یہ تین بیٹیاں ہیں اور ایک ہی بیٹا)۔ "وڈا نیک تے فرمانبردار اے۔"

"ماشاءاللہ... ماشاءاللہ۔" میں نے اس کا دل رکھنے کو سر ہلا دیا۔

"مڑی نوں وڈی نسادن اے۔" (مگر بہو بہت جھگڑالو ہے)۔

"نوں وڈی فسادن اے۔" اس کے ایک فقرے نے میرے ذہن میں ماضی کے کئی دریچے کھول دیے۔

وہ اپنی بہو کے قصے سنا رہی تھی اور میرے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

"تو وہ عارف کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے، ثمینہ سے مزاج بھی بہت ملتے ہیں ان کے۔"

"ظاہر ہے میں بڑا بیٹا ہوں۔ میرے پاس ہی آئیں گے۔"

"اچھی سزا ہے بڑا بیٹا ہونے کی..... میں آپ سے صاف کہہ رہی ہوں ایاز، میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ ہر بات پہ روک ٹوک..... ہر کام میں دخل اندازی..... پہلے کم ذمہ داریاں ہیں مجھ پر جو اب یہ بھی۔"

"دیکھو فریحہ میں کسی ملازمہ کا انتظام کر دوں گا۔" انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور اس ملازمہ کو کون دیکھے گا؟" میں شاید چپ رہتی نہیں تھی کہ کوئی راستہ نکل آئے۔

"اچھا کچھ دن گزار لو، میں عارف سے بات کر لوں گا۔"

"ایک دن بھی نہیں ایاز۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔

"آپ فیصلہ کر لیں اور کل صبح تک مجھے بتائیں۔ اگر ان لوگوں نے یہیں رہنا ہے تو میں کہیں اور انتظام کر لوں۔"

"اچھا باجی! ساڈا تاں سٹیشن آون والا اے۔"

میں اب تک یہی سمجھتی آئی تھی کہ میں نے جو کیا وہ صحیح تھا۔ زندگی میں ہر انسان کو اس کے مقام پر رکھنا چاہیے اور اتنی مروت بھی نہیں ہونی چاہیے کہ جینا مشکل ہو جائے..... مگر کیا کرتی اس انکشاف کا جس نے میرے وجود کی دیواریں چٹخا دی تھیں۔

"اچھا باجی! اللہ دی امان۔"

"اللہ دی امان۔" میرے ہونٹ تو ہلے تھے آواز شاید ہی نکلی ہو۔ وہ سامان اور بچیوں سمیت گاڑی سے اُتر

www.urdugem.com

گئی۔ آگے کا سفر تو اتنا لمبا نہ تھا مگر دائرہ در دائرہ پھیلتی سوچوں نے مجھے تھکا دیا۔ میں کھڑکی پہ سر ٹکائے سوچتی رہی کہ تو اب وہ وقت بھی دوبارہ گزرنے والا ہے..... کیا ضروری تھا کہ سارے واقعات اسی ترتیب سے ہوتے چلے جاتے۔

بچوں کی شادیوں کے اخراجات، میری بیماری، قبل از وقت ریٹائرمنٹ، ایاز کے کاروبار میں مسلسل نقصان اور ایاز پریشانیوں میں گھرے ایک رات ایسے سوئے کہ پھر نہ اُٹھے۔ احمر اصرار کرتا رہا کہ میرے پاس آجائیں۔ میں اپنا گھر چھوڑنا نہ چاہتی تھی مگر قرض اتنا چڑھ گیا کہ گھر بیچنا پڑا۔

کیا تھا اگر یہ سب نہ ہوتا؟ کیا تھا کہ اگر میرے ہاتھ میں کچھ تو باقی رہ جاتا۔ کیا تھا اگر مجھے یوں دربدر نہ ہونا پڑتا مگر اب شکایت بھی کیا کروں کہ تمام حالات کی ذمے دار میں خود ہوں۔

دل ڈوب ڈوب کے ابھر رہا تھا اور ریل چھکا چھک دوڑ رہی تھی۔

اسٹیشن پہ مجھے دور ہی سے احمر نظر آ گیا۔ بچے بھی ساتھ تھے اور یہ بھی مجھے نظر آ گیا کہ بہو ساتھ نہیں آئی۔

"بہو نہیں آئی؟" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔

"کمال کرتی ہیں اماں آپ بھی،" احمر ہنسا۔ "وہ بھی آجاتی تو آپ کی جگہ کہاں بنتی۔"

میری جگہ کہاں بنتی تھی؟ مجھے طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔ ناراض ہوگی شاید، موڈ خراب ہوگا۔ ہونہہ مجھے کیا! میں دل کو حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے بیٹے کا گھر ہے، مجھ سے زیادہ کس کا حق ہوگا؟ لیکن بیٹے نے ہی جانے کو کہہ دیا تو...؟

اتنی محبت کرتا ہے مجھ سے، ایسا کیوں کہے گا؟ ایاز بھی تو محبت کرتے تھے۔ انھیں بھی تو کہنا پڑا تھا۔

انہی سوچوں میں گھر آ گیا "پہلے ہمارے کمرے میں چلیں نا دادی۔" "ہمارا کمرا دیکھیں نا۔" میری نئی گاڑی..... میرا بیگ بچے کھینچ رہے تھے۔ کچھ بتا رہے تھے مگر میرا دل ڈرا ہوا تھا کہ جانے بہو کا رویہ کیسا ہو؟

"السلام وعلیکم امی... کیسی ہیں؟"

بہو آ کے ملی۔ موڈ خراب نہ تھا تو کچھ گرم جوشی بھی نہ تھی۔

"سفر خیریت سے گزرا؟ مشکل تو نہیں ہوئی؟" وہی رسمی سی باتیں، پھر وہ بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"چلو بھئی..... دادی تھکی ہوئی آئی ہیں۔ آرام کرلیں تو تمہارا کمرا بھی دیکھ لیں گی۔ ابھی تم لوگ کمرے میں جاؤ۔"

"ارے نہیں بہو۔ میں دیکھ....." پھر مجھے خیال آیا، اگر اسے برا لگ گیا تو؟... "اچھا ٹھیک ہے بچو جیسے مما کہہ رہی ہیں ویسا کرو۔ میں ذرا دیر آرام کر کے تمہارا کمرا دیکھتی ہوں۔"

دونوں طرح طرح کی شکلیں بناتے اٹھنے لگے۔

"امی آپ کے لیے اُوپر والا کمرا ٹھیک کر دیا ہے۔ نیچے تو چوبیس گھنٹے بچوں کا ہنگامہ جاری رہتا ہے۔ آپ کو شاید عادت نہ ہو۔"

میں نے اُوپر جاتی سیڑھیاں دیکھیں اور سوچا۔ چلو اس بڑھاپے میں یہ ورزش بھی سہی۔ "ٹھیک ہے بہو۔ اُوپر ہی ٹھیک ہے۔" مجھے ریل کی وہ سادہ سی ہم سفر یاد آئی۔ جس نے میری ہچکچاہٹ سے جان لیا تھا کہ میں کس مشکل میں ہوں۔

"آپ کہیں گی تو آپ کے لیے ایک کُل وقتی ملازمہ کا انتظام کرلوں گی۔ ورنہ میں تو گھر پہ ہوتی ہی ہوں۔" وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے موسم کا حال بتا رہی ہو۔

"جیسا تمھیں مناسب لگے۔" میں نے مختصر سا جواب

دیا۔

"جی!" وہ لمحہ بھر کو حیران ہوئی۔ اسے شاید مجھ سے اس طرح کے طرزِ عمل کی امید نہیں تھی۔

"اچھا آپ تازہ دم ہو جائیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

"چلو! میں تمہاری مدد کروا دوں۔"

"امی؟؟"..... وہ مسکرائی۔ "آج کا دن آرام کرلیں پھر مدد کروا دیجیے گا۔"

☆☆☆☆☆

مجھے آئے دوسرا مہینہ بھی ختم ہونے والا تھا۔ ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک بلکہ بہت اچھا تھا۔ بچے اسکول سے آتے تو میرے پاس آ گھستے۔ بہو بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتی، مگر جو ایک خوف دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا، وہ مجھے کھل کے سانس نہ لینے دیتا۔

سونے کے لیے لیٹتی تو نیند نہ آتی۔ اُٹھنے کی کوشش کرتی تو سارے جسم میں تھکن ڈیرے ڈال لیتی۔ اس رات بھی مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ فجر کے بعد سوئی تو بہت دیر سوتی رہی۔ دس بجے کے بعد ہی آنکھ کھلی۔ نیچے آئی تو ماحول خاصا کشیدہ لگ رہا تھا۔ بہو سخت غصے میں ملازمہ کو ڈانٹ رہی تھی۔

بارہ بجنے کو ہیں اور سارا گھر مہارانی کے انتظار میں گندا پڑا ہے۔ سارا کام میں کرلیتی ہوں تو مجھ پہ احسان کرنے تشریف لے آتی ہو۔" وہ جانے کس کس کا غصہ اس پہ نکال رہی تھی۔ باورچی خانے میں جانے کی ہمت نہ ہوئی تو میں لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔

"وہ باجی جی، قسم سے آج جی بڑا بھاری ہے۔"

"روز کے یہی بہانے ہیں تمہارے۔ نہیں کام کرنا تو صاف بتاؤ، میں کوئی اور انتظام کرلوں... اگر آئندہ تم دیر سے آئیں تو۔"

وہ بولتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔

"ارے امی! اٹھ گئیں آپ؟..... ناشتا بناؤں آپ کے لیے؟"

"نہ بہو بھوک نہیں ہے۔"

"اچھا چائے لاتی ہوں۔"

"نہیں میں بنا لیتی ہوں خود۔" میں اٹھنے لگی۔

"رہنے دیں امی! آپ کی بہو ٹھیک ٹھاک چائے بنا لیتی ہے۔" احمر میرے قریب آ کے بیٹھا تھا۔

"تم آفس نہیں گئے آج؟"

"قسم سے میرا جی بھی آج بڑا بھاری ہے۔"

اس کا لہجہ اور مسکینی دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"شکر ہے آپ ہنسیں تو سہی۔ ورنہ جب سے آپ آئی ہیں الجھی ہوئی اور پریشان رہتی ہیں۔"

"آہستہ آہستہ سیٹ ہو جاؤں گی۔" میں نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

"امی! عائزہ سمجھدار لڑکی ہے، پھر میں نے اسے سمجھا بھی دیا ہے کہ اگر میری امی ناراض ہو کر یہاں سے گئیں تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔"

میں چپ چاپ اس کا منہ دیکھتی رہی۔

"میں نے دادا دادی کو روتے ہوئے اپنے گھر سے جاتے دیکھا تھا۔" اس نے رک کے پھر بولنا شروع کیا۔ "میں وہ سب کچھ دوبارہ نہیں دیکھ سکتا۔" اس کی آواز بھاری ہونے لگی تھی۔

شیشے کی دیواریں اس طرح ٹوٹی تھیں کہ کانچ میری آنکھوں میں چبھنے لگے۔

سوچتی ہوں کہ کیا ہی اچھا ہوتا، وہ وقت بھی ایک بار پھر سے گزرتا..... کم سے کم گزر تو جاتا۔ اب تو جیسے ہر طرف وہی ایک لمحہ ٹھہرا ہوا ہے۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

محمد اکرم رانجھا

محمد یوسف لوہار

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اپنے ایک صحابی حضرت صہیبؓ جیسے جفا کش غلاموں کے کھردرے ہاتھوں کو بوسے دیتے رہے، ہمارا آج کا ہیرو تو اپنے جیسے انسانوں کی قبیل میں سے تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے خواہش ظاہر کی کہ میرے پیروکار جفا کش قسم کے انسان ہونے چاہئیں کیونکہ انبیا کرامؑ کے سرخیل حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی جفا کشی کے قصے تاریخ انسانیت میں چہار سو بکھرے ہوئے ہیں۔

حضرت ابراہیم شہر (عراق) میں پیدا ہوئے تو عراق، شام، مصر اور جزیرہ نما عرب کو کھنگال ڈالا۔ نوے فیصد سفر پاپیادہ ہی تھا۔ حضرت موسیٰؑ مصر سے چلے اور مدین آپہنچے۔ یہ فاصلہ سینکڑوں میلوں پر مشتمل تھا جو انھوں نے پاپیادہ طے کیا اور کنوئیں کا ٹھنڈا میٹھا پانی نوش فرمایا۔ ببول کے درخت کے نیچے ستائے، اپنے آقا سے مخاطب ہوئے اور کہا۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾ ترجمہ: ''اے میرے رب! یقیناً میں ہر اچھی چیز کے لیے جو تو میرے لیے اُتارے محتاج ہوں۔'' (سورۃ القصص: ۲۴)

ان پاکیزہ نفوس کے عمل و کردار یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کو جفا کش ہونا چاہیے تاکہ وہ انسانی معاشرے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکے۔

ہمارا آج کا ہیرو جسمانی لحاظ سے بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے بازو اور دبلی پتلی ٹانگیں اور چھاتی و کمر ہڈیوں کا ڈھانچہ لیے ہوئے تھی۔ لیکن اس کے کھردرے ہاتھ ہتھوڑے کی مزدوری کر کے پتھر سے سخت تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ محمد یوسف نرم و نازک ہوتا کیونکہ وہ تین لوہار بھائیوں، محمد، صالح

اور نور احمد کے خاندان میں اکلوتا لڑکا تھا۔ بھلا ہو سخت جان لوہاروں کا کہ اسے پالا پوسا تو ٹھیک طریقے سے تھا لیکن ساتھ اُسے سخت جان بھی بنا دیا۔

یوسف لوہار بچپن سے میرا ہمجولی تھا۔ بے حد خوددار اور ہنس مکھ اور دوستی کا رشتہ محلے اور گاؤں کے ہمجولیوں سے زبردستی پیدا کر لیتا۔ اس کی والدہ مکئی کے میٹھے مرونڈے موسم سرما میں بناتی تو سارے محلے بلکہ گاؤں کے اکثر گھروں میں پھیل جاتے۔ لوہاروں کا خاندان اتنا ہنس مکھ تھا کہ لڑائی جھگڑا ان کے قریب سے بھی نہ گزرتا۔

اوزار کے علاوہ گیہوں، پیتل کے چند برتن اور پلھ تولائیاں (رضائی، گدے) سارا اثاثہ ان اشیاء پر مشتمل تھا۔

ایک گائے، ایک بھینس ایک کھوتی (گدھی بھی) اور نیم ہوبلی کتا بھی ان کے گھر موجود تھا۔ نقدی کے متعلق رفیق دیندار کو علم تھا کیونکہ وہی اس کنبے کا بینک تھا جو بلاسود کاروبار کرتا تھا۔ پیسے لوہاروں کے رفیق کی تحویل میں ہوتے اور جب ضرورت ہوتی تو اصل رقم سے بڑھ کر دوگنا چار گنا، بینک سے مل جاتی۔

ضرورت صرف ایک بار پڑی جب میرے چچا میاں حیات علی رانجھا نے دو ایکڑ رقبہ بیچنا چاہا جس کی جملہ قیمت تین ہزار روپیا تھی۔ یعنی زرخیز نہری رقبہ کی قیمت صرف پندرہ سو روپیہ فی ایکڑ تھی۔ حیران ہونے کی بات نہیں۔ محمد لوہار روایت کرتا تھا کہ اس نے جوانی میں آٹھ گائے کی قیمت آٹھ آنے ادا کی اور گائے کا دودھ پورے خاندان کا کفیل تھا۔

محمد یوسف لوہار کی پیدائش جنوری ۱۹۴۰ء کی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں وہ تقریباً دس سال تھا۔ اس وقت سعودی عرب میں دولت کی ریل پیل نہ تھی اور عربی لوگ مع اہل و عیال برصغیر پاک و ہند میں دورے کرتے تھے۔ دس سالہ یوسف لوہار ان عربی نسل لوگوں پر دل و جان سے فدا ہوتا تھا۔ گائے کے دودھ کی چائے بنا کر، عربی کنبے کے پاس لے جاتا۔ بھلا ہو اس کے والدین کا کہ غربت کے باوجود وہ اس کار خیر میں مزاحم نہ ہوتے تھے۔ محمد یوسف لوہار اپنے گاؤں کے غریب غربا کی خدمت بھی کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک گائے کا دودھ اپنے کنبے سے بچا کر چند یتیم و بیوگان کے لیے مہیا کرتا تھا۔ اس کار خیر کا کھوج لگایا جائے تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے حجرے میں جا پہنچتا ہے جو سال میں ایک مرتبہ اس علاقہ میں ماہانہ دورہ کیا کرتے اور طبقہ غربا کو اسلام سے متعارف کرواتے تھے۔ وہاں سے یہ نوجوان لڑکا دین سے محبت کرنا سیکھ گیا جو عمر بھر جاری و ساری رہی۔

دو ایکڑ زمین سے محمد یوسف لوہار ٹوٹ کر محبت کرتا اور ان کی دیکھ بھال گویا اس کی زندگی کا مشن تھا۔ کرنا اللہ کا یہ ہوا کہ ۱۹۹۰ء میں گاؤں کی مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش شروع ہوئی۔ مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر عشاء کی نماز کے بعد اپیل کی جاتی کہ کار خیر میں حصہ ڈالا جائے۔ میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالنا چاہتا لیکن غربت آڑے آجاتی۔ میں لاہور سے گاؤں گیا تو سنا کہ محمد یوسف لوہار نے اپنا رہائشی مکان بیچ ڈالا ہے جو تقریباً تیس ہزار روپے میں بکا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ تیس ہزار مسجد کی مرمت میں کام آگئے۔ ابھی مسجد کا کام باقی تھا کہ زور شور سے اپیلیں کی جانے لگیں۔

اب محمد یوسف کے پاس مویشی تھے یا دو ایکڑ زمین تھی۔ اگلی دفعہ میں نے سنا کہ ڈیڑھ ہزار کی خرید ایک ایکڑ، تینتالیس ہزار روپے میں بیچ کر محمد یوسف نے اللہ کی راہ میں پیش کر دیا۔ اب محمد یوسف، اس کی والدہ اور ہمشیرہ رہ گئے تھے۔ باقی اہل خاندان عدم آباد سدھار گئے۔

میں بذریعہ کار لاہور سے گاؤں آرہا تھا کہ کوٹ مومن انٹرچینج پر میری ملاقات دُبلے پتلے اور مدقوق محمد یوسف سے ہوئی۔ وہ حج کر کے مع والدہ اور ہمشیر لوٹ رہا تھا۔

www.urdugem.com

اب گاؤں میں اس کا ٹھکانا بک چکا تھا۔ دوسرا ایکڑ والدہ اور ہمشیر کے حج اور زیارت بیت اللہ کے لیے اپنے کام آ گیا۔ میرے استفسار پر مجھے بتایا گیا کہ میاں تمہارے گاؤں کا سب کچھ جھاڑ کر کوٹ محمد سعی میں ہمشیر کے مکان میں پہنچ گیا ہوں اور طالب دعا ہوں۔ چند دنوں بعد میں نے سنا کہ ہمارا ہیرو اگلے جہان روانہ ہو گیا ہے اور جس کسی سے بات ہوئی تو ہر کسی نے یہی کہا:

شالا ہونی وچ بہتاں دے ڈیرے۔

میں یہ سنتے ہی اس کے بہنوئی اور بہن کے پاس پہنچا اور تعزیت کی۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ دو قدم مجھے بڑے محبوب ہیں، ایک فرض نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد جانا اور دوسرا بندۂ مومن کے لیے تعزیت اور عبادت کے لیے۔

میں نے محمد یوسف کے آخری لمحات کے متعلق اس کی بہن سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ جتنا وقت ہوش میں رہا وہ یہی گنگناتا رہا۔

میں تے بُلبل باغ مدینے دی آں
کی کرنا میں گلزاراں نوں

میں تے وچھڑی محمدؐ پیارے دی
میں بھاہ لاواں گلزاراں نوں ●●●

جانچ پڑتال کرنا عادت بناؤ!

میں نے دیکھا کہ چند سیاح اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ مجھے ان کی صحبت و مجلس پسند آئی۔ میں نے سوچا کہ میں بھی ان کے سفر میں شریک بن جاؤں۔ میں نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا مگر وہ مجھے اپنے ہمراہ رکھنے کے لیے نہ مانے۔ میں نے کہا کہ ایسا انکار بزرگوں کے اخلاق اور شرافت سے دور ہے۔ فقیر تو دوسروں کو فائدہ دیتے ہیں اور آپ کو یہ انکار زیب نہیں دیتا۔ میں نے اپنی طبع، خاکساری، خواہش، انکساری کے بارے میں کہا، وہ نہ مانے۔ تب ان میں سے ایک نے قصہ بیان کیا کہ فقیروں کی طبع میں سلامتی اور عاجزی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہماری جماعت میں ایک چور درویشی کے رُوپ میں شامل ہو گیا۔ ہم سفر میں رہے۔ ایک دن ہم نے رات کا سفر کیا اور ایک شہر کے شاہی قلعہ کی دیوار کے نیچے سو گئے۔ ہمارا وہ بدتمیز چور ساتھی آدھی رات کے بعد اٹھا۔ اس نے ایک دوست کا لوٹا اٹھایا اور بہانہ کیا کہ وہ استنجا کرنے جا رہا ہے۔ وہاں سے وہ قلعہ کی دیوار پر چڑھ گیا اور شاہی محل کے ایک کمرے سے جواہرات سے بھرا ہوا ایک ڈبہ چوری کر کے کہیں نکل گیا۔ جب دن نکلا تو وہ بہت دور جا چکا تھا۔ صبح پہرے داروں نے ہمیں دیوار کے پاس سوئے ہوئے چور ہونے کے شبہ میں آن پکڑا۔ بادشاہ کے حکم سے ہماری سخت پٹائی ہوئی۔ جیل بھیج دیے گئے اور کئی ہفتوں تک تحقیق ہوتی رہی آخر ہم نے رہائی پائی۔ اس دن سے ہم نے یار باشی کو الوداع کہہ دیا ہے۔

سچ ہے کہ درویشی دنیا، ہوس اور شہوت کے چھوڑنے کا نام ہے۔ درویشی، گودڑی پہن لینے کا نام نہیں بلکہ دل کا میل صاف کرنے کا نام ہے۔ اگر کسی جماعت کا ایک آدمی بھی کوئی کمزوری دکھائے یا خرابی کرے تو ساری جماعت بدنام ہوتی ہے۔ ایک کی خرابی کی وجہ سے سب کی عزت جاتی رہتی ہے۔ محفل کے ایک فرد کی غلط حرکت سے دوسروں کے دل کو غم ملتا ہے۔ جیسے عطر سے بھرے حوض میں چوہے کے گرنے سے سارا عطر ناپاک اور پلید ہو جاتا ہے۔ پس کسی کے ظاہر پر بھی اتنا اعتبار نہ کریں۔ عمل و کردار کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جیسا کہ نہایت صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس ایک کتے کے چھو جانے سے پلید و ناپاک ہو جاتا ہے۔

حکایاتِ سعدیؒ

دلیپ سنگھ

اپنا کندھا اپنی لاش

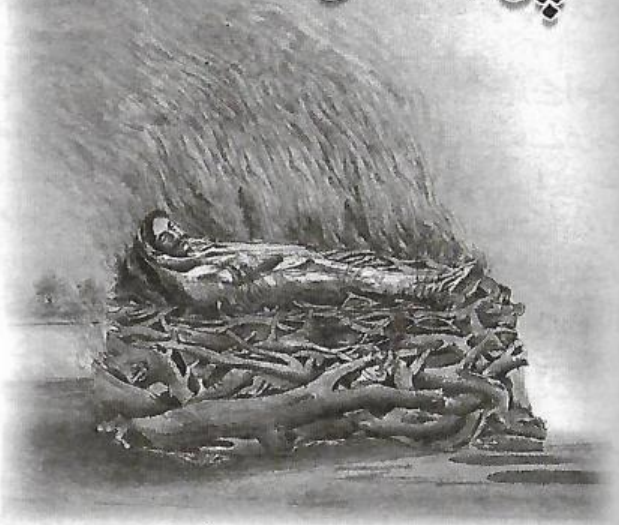

ایک متوحش آدمی کا انوکھا ماجرا
وہ جیتے جی کفن دفن کی تیاری کرنا چاہتا تھا

میرے دفتر میں ایک افسر تھے چکرورتی۔ آج سے چھ سال پہلے جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ میرا تقرر ہو گیا۔ انھوں نے سبکدوشی کے بعد ایک سرکاری کالونی میں چھوٹا سا مکان بنایا جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ میری اکثر ان سے فون پر بات چیت رہتی ہے۔ جب کبھی کوئی پرانی فائل نہ ملے تو میں انھی سے پوچھا کرتا ہوں۔ کسی کیس کی نوعیت سمجھ میں نہ آئے تو ان سے مشورہ کرتا ہوں۔ انھیں بھی پنشن کے سلسلے میں اپنے پرانے دفتر سے کچھ کہنا سننا ہو تو مجھے فون کرتے ہیں۔ باہمی مفاد کی وجہ سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے۔

ایک دن انھوں نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ ان کی بوڑھی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے فوراً وہ تمام جملے جو ایسے موقع پر بولے جاتے ہیں، بولنا شروع کر دیے یعنی ان کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں، ماں کے سایے سے محروم ہو کر زندگی کی دھوپ برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ بھگوان مرحومہ کو سورگ میں جگہ دے وغیرہ۔

انھوں نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا ''یار جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن اس وقت یہ کہنے کا موقع نہیں۔ میں نے فون تمہیں تہنیت وصول کرنے نہیں بلکہ مدد حاصل کرنے کے لیے کیا ہے۔''

www.urdugem.com

میں نے کہا: ”فرمائیے“۔

کہنے لگے۔ ”یار دفتر سے تین چار کلرک بھیج دو، ماتا جی کو شمشان لے جانا ہے“۔

میں ان کی درخواست سن کر چکرا گیا۔ جب ذرا سنبھلا تو کہا ”سر، مرنے والے کو شمشان لے جانے کے لیے تو عام طور پر رشتے دار کام میں لائے جاتے ہیں“۔

کہنے لگے ”جانتا ہوں لیکن دلی میں میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے“۔

”اور پڑوسی؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگے: ”ماتا جی کچھ ایسے بے وقت پر لوک سدھاریں کہ سب پڑوسی دفتروں کے لیے نکل چکے۔ اس وقت پوری کالونی میں میں اکیلا مرد ہوں اور ماں کو شمشان لے جانے کے لیے کم از کم چار مردوں کی ضرورت ہے۔ اسی لیے تم سے درخواست کر رہا ہوں۔ یوں تو ماں کا وزن اتنا کم ہے کہ میں اکیلا بھی انھیں اٹھا کر لے جا سکتا ہوں لیکن ایسے کوئی لاش شمشان پہلے لے جائی نہیں گئی۔ اسی لیے شاید مناسب نہ لگے“۔

میں نے کلرک بھیج کر چکرورتی صاحب کا کام کروا دیا، لیکن میرے دل میں ایک خیال سا بیٹھ گیا کہ جب ہمارا شمشان جانے کا وقت آئے گا اور اگر کسی وجہ سے کلرک نہ ملے تو ہماری لاش شمشان کیسے پہنچے گی؟

میں نے چکرورتی صاحب سے اس مسئلے پر بات کی تو کہنے لگے ”بدلتے ہوئے حالات میں تمہیں خود چل کر شمشان جانا ہوگا“۔

میں نے کہا۔ ”یہ تو ناممکن ہے۔“

وہ بولے ”تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ اس مسئلے پر پوری طرح غور نہیں کیا۔ غور کرو گے تو کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے بھیا۔ یہ سیلف سروس یعنی اپنا کام خود کرنے کا زمانہ ہے۔ ہوٹلوں میں گاہک خود اپنی پلیٹوں میں کھانا ڈال کر کھا رہے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں خود ہی نل خراب کرتے اور خود ہی ٹھیک کر رہے ہیں۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی اپنے بر خود تلاش کر رہی ہیں، تو مردہ شمشان تک خود کیوں نہیں جا سکتا۔ مجھے تو افسوس ہے کہ یہ میرے زمانے میں نہ ہوا“۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا آپ کئی سال پہلے شمشان جانے کی سوچ رہے تھے“۔

کہنے لگے۔ ”میں شمشان جانے نہیں، رشتے ڈھونڈنے کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھیے نا ہمارے زمانے میں رشتہ ڈھونڈنا والدین کا کام تھا۔ چونکہ میرے والدین یہ فرض نبھانے میں نااہل ثابت ہوئے اس لیے میں کنوارا رہ گیا“۔

میں نے کہا ”چکرورتی صاحب، رشتے کی بات تو اس وقت نہ چھیڑیے کہ آپ عمر کی جس منزل پر ہیں، رشتے کی بات بے وقت کی راگنی سنائی دیتی ہے۔ اب تو آپ اپنے مردے کو شمشان پہنچانے کی فکر کیجیے“۔

کہنے لگے۔ ”وہ تو میں کر ہی رہا ہوں۔ آپ بھی ادھر دھیان دیجیے ورنہ آپ کا مردہ گھر میں ہی پڑا رہ جائے گا اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے“۔

میں نے بہتیرا دھیان دیا لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنے مردے کو خود شمشان تک کیسے پہنچایا جا سکتا ہے؟ کسی نے مشورہ دیا کہ جب آپ کو موت کا فرشتہ دکھائی دینے لگے تو شمشان کی طرف دوڑ پڑیں۔ اس تجویز میں قباحت یہ نظر آئی کہ موت کا فرشتہ پولیس انسپکٹر تو ہے نہیں کہ آپ نے کہا، ”حضور ذرا سی مہلت دیجیے میں کپڑے بدل کر آپ کے ساتھ چلتا ہوں“۔ عام طور پر وہ مان جاتا ہے اور اگر نہ مانے تو اسے منانے کا ایک ایسا نسخہ ہے جو سب کو معلوم ہے لیکن ملک الموت تو کہتے ہیں ایک سیکنڈ کی مہلت بھی نہیں دیتا۔

کسی نے مشورہ دیا: ”شمشان والوں سے بات کرو، وہ ضرور کوئی راستہ بتا دیں گے“۔

میں جب شمشان پہنچا تو وہاں ایک کونے میں چار پانچ پنڈے سلفہ پی رہے تھے۔ ”پورے علاقے میں شمشان کی سی خاموشی تھی۔

میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ ”میں اپنے کندھوں پر سوار ہو کر شمشان پہنچنا چاہتا ہوں، کوئی نسخہ بتائیے“۔

ایک پنڈے نے پوچھا۔ ”آپ کی موت کب تک واقع ہوگی“۔

میں نے کہا: ”موت کا کیا ہے کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ شاید کل ہی آ جائے“۔

کہنے لگا ”اگر یہ بات ہے تو اپنے کریا کرم کا خرچ ہمارے پاس جمع کروا دیجیے اور رات یہیں ہمارے ساتھ گزاریے۔ کل بھگوان کی دیا سے آپ کا کریا کرم اس طرح کریں گے کہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی“۔

میں نے پوچھا ”کتنا خرچ؟“ کہنے لگا۔ ”یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ کریا کرم پانچ سو روپوں میں بھی ہو سکتا ہے اور پانچ ہزار میں بھی۔ صرف اتنا یاد رکھیے کہ جتنا گڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا“۔

مجھے یہ مثال کچھ غیر مناسب سی لگی لیکن اس وقت ادب کے مسائل پر بحث کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں نے پوچھا ”اگر میری موت کل تک نہ ہوئی تو؟“

کہنے لگے۔ ”ایک آدھ دن اور صبر کر لیں گے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ یہ شمشان ہے کوئی دھرم شالہ نہیں“۔

میں نے کہا۔ ”آپ غلط سمجھے۔ میرا ارادہ شمشان میں پڑے رہنے کا بالکل نہیں۔ میرا تو مطلب صرف اتنا ہے کہ مجھے اپنے کریا کرم میں کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے۔ یوں لگنا چاہیے جیسے میں اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھا کر لایا ہوں۔ میں نے ہی اپنی چتا کو آگ دی ہے۔ میں نے ہی منتر پڑھے ہیں۔ میں نے ہی اپنی موت پر آنسو بہائے ہیں اور میں ہی اپنے پھول گنگا جل میں بہا کر آیا ہوں“۔

ایک اور پنڈا سلفے کے نشے سے ایک منٹ کے لیے ابھرا اور کہنے لگا ”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ آپ اپنی مرضی کا کریا کرم چاہتے ہیں، جیسے کہ آج کل امریکا میں ہو رہا ہے“۔

میں نے پوچھا۔ ”مہنت جی، آپ کبھی امریکا گئے ہیں؟“

کہنے لگا ”گیا ہوں تبھی تو جانتا ہوں“۔

میں نے پوچھا ”کس سلسلے میں گئے تھے؟“

کہنے لگے۔ ”مردہ ہی جلانے گیا تھا، کوئی کمپیوٹر بنانے تھوڑے ہی گیا تھا۔ کوئی امیر ہندوستانی وہاں مر گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب وہ سورگ کے سفر پر روانہ ہو تو کوئی ہندوستانی پنڈا ہی اسے رخصت کرے، چنانچہ ٹکٹ بھیج کر مجھے بلوایا گیا۔ وہیں پتا چلا کہ امریکا میں آج کل سیلف سروس فیونرل، کارواج چل پڑا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ مرنے والا کفن دفن کی فرم میں طے شدہ رقم جمع کروا دیتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد فرم والے اس کے کفن دفن کی مکمل ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں۔ قبر وہ کھدوائیں گے، کفن وہ سلوائیں گے، مرحوم کی خوبیاں گنوانے والی تقریریں وہ لکھوائیں گے، وہی پڑھوائیں گے۔ آپ اپنے بارے میں کچھ اس طرح کا انتظام کرنے کا تو نہیں سوچ رہے؟“

”بالکل یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا یہاں کوئی ایسی فرم ہے؟“

”فرم تو شاید نہیں لیکن کھولنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ مردے تو ہم نے بہت جلائے ہیں لیکن مردے جلانے کا بزنس آج تک نہیں کیا۔ اب یہ بھی کر دیکھتے ہیں“۔

میں نے پوچھا ”خرچ کیا ہوگا؟“

کہنے لگا۔ ”پانچ ہزار روپے جمع کروا دیجیے۔ آپ پہلے گاہک ہیں۔ بونی کے وقت میں زیادہ نہیں مانگوں گا“۔

www.urdugem.com

میں نے پوچھا ”پانچ ہزار روپے میں کیا کیا ہوگا؟“
کہنے لگا ”آپ کی لاش کو یہاں تک لانا، کفن سلوانا، لاش پر ایک قیمتی شال ڈالنا، جلانے کے لیے لکڑی خریدنا، رونے اور بین کرنے کے لیے عورتوں کا بندوبست کرنا اور جلانے کے بعد آپ کے متعلق ایک تعریفی تقریر“۔

میں نے کہا ”رونے پیٹنے کے لیے پرائی عورتیں کچھ اچھی نہیں لگیں گی“۔

کہنے لگے ”نہیں صاحب، یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ کی بیوی آپ سے لاکھ محبت کرے لیکن سری دیوی کی طرح محبت کا اظہار نہیں کرسکتی۔ اپنی عورتوں میں وہ سر تال کہاں جو کرائے کی عورتوں میں ہوگا۔ ہم جو عورتیں آپ کا بین کرنے کے لیے لائیں گے، وہ بین کریں گی تو آپ کو یوں لگے گا جیسے راگ کیدارا گایا جارہا ہے۔ چھاتی پیٹیں گی تو کچھ اس طرح لگے گا جیسے طبلے پر تین تال بج رہا ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شکل وصورت ان کی ایسی ہوگی کہ وہ بالکل رشتے دار عورتیں لگیں گی“۔

میں نے سوچا تو پانچ ہزار کا خرچ مجھے کچھ زیادہ نہیں لگا۔
میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے یہ سودا منظور ہے لیکن یہ بتائیے آپ معلوم کیسے کریں گے کہ میں مرگیا“۔

کہنے لگا: ”صاحب جب کاروبار شروع کیا ہے تو کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہر روز میرا آدمی آپ کے گھر جا کر دیکھ آیا کرے گا آپ کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا یا نہیں“۔

چنانچہ اس کا آدمی باقاعدہ صبح آکر مجھے دیکھ جایا کرتا۔ اس طرح پندرہ دن گزر گئے۔ ایک دن ملازم کی جگہ پنڈا خود آیا۔ اس وقت میں یوگا کر رہا تھا۔ پنڈا پوچھنے لگا۔

”کہیے جناب کیا حال ہے؟“
میں نے کہا ”بھگوان کی کرپا ہے“۔
کہنے لگا ”آپ پر تو بھگوان کی کرپا ہے لیکن ہمارا دیوالیہ پٹ رہا ہے“۔

میں نے پوچھا ”کیسے؟“
کہنے لگا ”کچھ آپ کو پتا ہے کہ لٹھا کتنا مہنگا ہو رہا ہے؟“
”لٹھے سے میری موت کا کیا تعلق ہے؟“
”آپ کی لاش کو لپیٹنا نہیں ہے لٹھے میں کیا؟ لکڑی دن بہ دن مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ گھی کل تک چھیانوے روپے کلو تھا، آج سو روپے کلو ہوگیا ہے۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے اور آپ ہیں کہ جیے چلے جارہے ہیں“۔
”اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں خودکشی کرلوں“۔
”خودکشی نہ کریے لیکن یہ یوگا ووگا تو بند کردیں۔ اس سے عمر بڑھتی ہے۔ آپ تو بھگوان کے کام میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں“۔

اس کے بعد تو ہم دونوں کی آپس میں خوب تو تو میں میں ہوئی۔ وہ کہتا تھا ”اگر مرنا ہی نہیں ہے تو پھر کفن دفن بک ہی کیوں کیا؟“ میں کہتا تھا ”آپ نے میری لاش ٹھکانے لگانے کا ٹھیکا لیا ہے۔ لاش میں تبدیل ہونے سے پہلے آپ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے“۔

مختصر یہ کہ میں جیتا چلا گیا اور لکڑی، گھی، لٹھا، رونے پیٹنے والی عورتوں کا ریٹ بڑھتا چلا گیا۔ ایک دن پنڈے جی آئے تو چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ تقریباً روتے ہوئے پوچھا: ”طبیعت کیسی ہے؟“
”ایک دم بڑھیا“۔ میں نے جواب دیا۔

انھوں نے جیب سے پانچ ہزار روپے نکالے اور میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیجیے اپنے پیسے۔ آج کی قیمتوں کے حساب سے تو اس میں ایک لاوارث لاش بھی جلائی نہیں جاسکتی۔ ہمیں نہیں کرنا گھاٹے کا بزنس۔ خود ہی چلے جانا شمشان۔ خود ہی لکڑیاں خریدنا اور اپنے آپ کو جلا لینا اور اگر ممکن ہو تو جل جانے کے بعد خود ہی غالب کا یہ مصرع دہرا لینا۔

؎ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

الطاف حسن قریشی

جو بادہ کش تھے پُرانے!

غیر معمولی کارنامے دکھلانے والی مرحوم شخصیات کا فکر انگیز تذکرہ

وہ لوگ جو دوسروں کے کام آتے ہیں اور جن کے اعمال کہکشاں کی طرح جھلملاتے رہتے ہیں، اُن کے اٹھنے سے بہت بڑا خلا قحط الرجال کا شدید احساس دلاتا ہے۔ گیارہ فروری کو تین بڑی شخصیتوں کی زندگی کے چراغ گل ہونے کی خبر آئی، تو دل بیٹھنے لگا کہ پرانے بادہ کش اُٹھتے جاتے ہیں۔ عاصمہ جہانگیر کی آواز جو یک لخت بند ہوئی، تو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اور ڈاکٹر حنیف شاہد کی رحلت پر کلیجہ کٹنے لگا کہ انہوں نے بے پناہ ریاضت اور جدوجہد سے علم و تحقیق کا ایک چمن آباد کیا تھا۔ اسی روز ڈراموں کے ایک شائستہ اور نامور اداکار قاضی واجد دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔

موت اٹل ہے، اِسی لیے سمجھ دار قومیں اِس امر کا اہتمام کرتی ہیں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ایسے مردانِ کار تیار ہوتے رہیں جن میں خلا پُر کرنے کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہو۔ دکھ یہ ہے کہ ہمارے منصوبہ ساز اور قومی قیادتیں اِس انتہائی اہم ضرورت پر بہت کم توجہ دیتی ہیں۔ ہمارے بیشتر سیاست دان حالات کی سنگینی سے یکسر غافل ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ بڑھتے ہوئے قحط الرجال کے باعث ریاستی ادارے، اعلیٰ منتظمین اور دور اندیش منصب داروں سے خالی ہوتے جارہے ہیں جبکہ ریاستی ادارے مسائل حل کرنے کے بجائے گمبھیر مسائل پیدا کر رہے ہیں۔

لودھراں کا ضمنی انتخاب اس اداس ماحول میں ایک نئی تعبیر کے ساتھ نمودار ہوا ہے جس میں ہمارے سیاسی مستقبل کے لیے مثبت اشارے مضمر ہیں، مگر اُن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی فرصت اربابِ سیاست کو میسر ہی نہیں۔

عاصمہ جہانگیر کی زندگی عام روش سے ہٹ کر تھی۔ اسی طرح ان کا انتقال بھی اُن کی افتادِ طبع کے مطابق آناً فاناً ہوا اور نمازِ جنازہ بھی غیر روایتی انداز میں ادا ہوئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق وہ جناب نواز شریف کی طرف سے اُن کے وکیل اعظم نذیر تارڑ سے ٹیلی فون پر طویل گفتگو کر رہی تھیں جس میں انہیں وزیر مملکت جناب طلال چودھری کا مقدمہ لینے پر آمادہ کیا جارہا تھا۔ چودھری صاحب کو فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار کی طرف سے توہینِ عدالت کا نوٹس دیا

گیا تھا اور انہیں ایک ہفتے میں وکیل کرنے کی مہلت ملی تھی۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر یہ ذمہ داری اُٹھانے کے لیے تقریباً تیار ہوگئی تھیں کہ اچانک اُن کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ دل کے دورے سے جانبر نہ ہوسکیں۔

www.urdugem.com

اُن کی نمازِ جنازہ میں بہت لوگ آئے اور اس میں روایت سے ہٹ کر خواتین بھی شامل ہوئیں جن کو نماز کے تمام آداب معلوم نہیں تھے۔ محترمہ عاصمہ کی وصیت کے مطابق اُنہیں اُن کے فارم ہاؤس میں دفنایا گیا۔ اُن کی وفات پر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے لے کر ملکی اور غیر ملکی سربراہوں کے پیغامات آئے اور اُن کے گھر پر تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ وہ اس اعتبار سے بڑی خوش نصیب خاتون تھیں کہ اُن کے مخالفین کی طرف سے بھی اُنہیں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

محنت کشوں کے نمائندوں نے کہا کہ ہم ایک پُرجوش اور طاقتور آواز سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ شرفِ آدمیت اور حقوقِ نسواں کی بہت بڑی علمبردار اور نہایت سرگرم لیڈر تھیں۔ بے خوفی، بے باکی اور قوتِ ارادی اُنہیں وراثت میں ملی تھی۔ اُن کی والدہ 'ادبی دنیا' کے دبنگ ایڈیٹر کی صاحبزادی تھیں جو حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے والد ملک غلام جیلانی ایوب خاں کے عہد میں قومی اسمبلی کے رکن تھے اور آمریت کے خلاف جدوجہد کی علامت بنے ہوئے تھے۔ اُن کا گھر مرجع خلائق تھا۔ ایوب خاں، یحییٰ خاں اور مسٹر بھٹو کے زمانوں میں میرے اُن سے رابطے رہے۔ عاصمہ کی عمر یہی کوئی اٹھارہ بیس سال ہوگی۔ بعد ازاں اُن کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

عاصمہ جہانگیر نے اپنی زندگی خود بسر کی اور زیادہ تر فیصلے بھی خود کیے۔ سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے دسمبر 1971ء کے آخری دنوں میں جیلانی صاحب کو اُن کی طرف سے کی گئی شدید تنقید کی پاداش پر ڈی پی آر کے تحت گرفتار کر لیا۔ عاصمہ غالباً اُس وقت قانون کی تعلیم سے فارغ ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے گرفتاری کے خلاف ہائی کورٹ میں رِٹ پٹیشن دائر کی جسے مارشل لا کے تحت اس کی سماعت کا اختیار نہیں تھا، اِس لیے مسترد کر دی گئی۔

لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی جس کی سماعت پانچ رکنی بنچ نے کی۔ اس کے سربراہ چیف جسٹس، جسٹس حمود الرحمٰن اور ارکان جسٹس یعقوب علی، جسٹس وحید الدین، جسٹس سجاد احمد جان اور جسٹس صلاح الدین تھے۔ اس بنچ نے تاریخ ساز فیصلہ دیتے ہوئے جنرل یحییٰ کو غاصب اور اس کے مارشل لا کو غیر آئینی قرار دے کر نظریۂ ضرورت کو دفن کر دیا تھا۔ چنانچہ پی ایل ڈی میں یہ فیصلہ عاصمہ جیلانی کے نام سے محفوظ ہے۔

وہ ایک بے دھڑک اور نڈر خاتون تھیں جو قانون کی حکمرانی اور جمہوریت کی بقا کی جدوجہد میں پیش پیش رہیں۔ اُن میں حکمرانوں کو للکارنے اور پولیس کی لاٹھیاں کھانے کا زبردست حوصلہ اور بے سہارا اور ناداروں کی قسمت سنوارنے کا زبردست داعیہ موجود تھا۔ وہ مذہب کے بارے میں کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھیں جس پر مذہبی اور روایت پسند طبقے اُن کے نکتہ چیں رہے۔ برہان الدین وانی کی شہادت کے بعد وہ اقوامِ متحدہ کے ممبر کی حیثیت سے سری نگر گئیں اور بھارت کی درندگی پر ایک مفصل رپورٹ مرتب کی جس نے دنیا کی آنکھیں کھولنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

پاکستان کے عظیم المرتبت شاعر جناب شورش کاشمیری نے اُن پر ایک لاجواب نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

ایسی چنگاری ابھی تک اپنی خاکستر میں ہے
تیز رو، شمشیرِ براں، بے نظیر و باکمال
ایک تتلی جس میں شیروں کے تہوّر کی جھلک
ایک کونپل جس کی آب و تاب میں سحر و جلال
اپنی امی کی جگر داری کا نقشِ دل پزیر
اپنے ابا کے سیاسی ولولوں سے مالامال

ہم اس عظیم خاتون کو سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اُن کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔

ہمارے ڈاکٹر حنیف شاہد بھی علم و تحقیق کے میدان میں ایک جداگانہ مقام رکھتے تھے۔ مجھے اُن کا وہ عہد یاد ہے جب وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اسٹینو گرافر کے طور پر کام کرتے تھے۔ اُردو ڈائجسٹ کی اشاعت شروع ہوئی، تو وہ وقتی طور پر میرے ساتھ منسلک ہو گئے۔ وہ صبح میری طرف آتے اور میں روزانہ اُنہیں خطوط کے جوابات ڈکٹیٹ کراتا جو میرے نام آتے تھے۔ یہ سلسلہ تین چار سال جاری رہا۔

اُنہیں مطالعے کا شوق بہت تھا۔ اُن کی خداداد صلاحیتوں

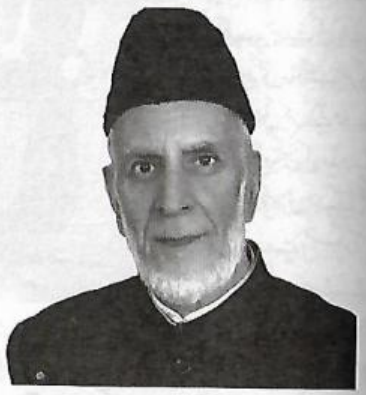

کی بدولت اُنہیں ریاض یونیورسٹی (سعودی عرب) کی لائبریری میں نہایت اچھی ملازمت مل گئی۔ اس دوران انہوں نے علامہ اقبال اور قائداعظم پر ایسی نادر کتابیں تصنیف کیں جو ہماری تاریخ کا گنج ہائے گراں مایہ ہے۔ ان میں دونوں عظیم قائدین کی زندگی کے نہایت فکر انگیز اور غیر معمولی اہمیت کے پہلو سامنے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مرقد پر شبنم افشانی کرے!

(بشکریہ روزنامہ جنگ)

☆☆

قاضی واجد ریڈیو، تھیٹر اور فلم کے راستے سے قاضی واجد ٹیلی ویژن تک پہنچے جو ان کی پہچان کا سب سے مضبوط اور مستقل حوالہ بنا لیکن ان کا شمار فن اداکاری اور صداکاری کے حوالے سے ان لوگوں میں ہوتا ہے جو جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔ کراچی ریڈیو ہو یا خواجہ معین الدین کے تاریخ ساز سٹیج ڈرامے، قاضی واجد کا ان سے عمر بھر کا ساتھ رہا ہے اور جن لوگوں نے بھی ان سے کام کیا یا ان کو دیکھا اور سنا وہ سب کے سب یہ فیصلہ کرنے میں مشکل کا شکار نظر آتے ہیں کہ وہ فن کار زیادہ بڑے تھے یا انسان۔

ہمہ وقت ایک مسکراتا ہوا چہرہ، ہر کام میں لگن اور ذمہ داری کا احساس۔ مؤدب اور مشفق، اپنی کامیابیوں پر عجز اور دوستوں کی ترقی پر خوشی کا اظہار کرنے والے قاضی واجد بلاشبہ ہر دلعزیز اور ورسٹائل فن کار تھے۔ ان سے آخری ملاقات گزشتہ دسمبر میں کراچی آرٹس کونسل کی عالمی اردو کانفرنس کے دوران ہوئی۔ عمر اور بیماری کے مسائل کے باوجود ان کی مخصوص مسکراہٹ کی تازگی اور گرمجوشی حسب معمول تھی۔

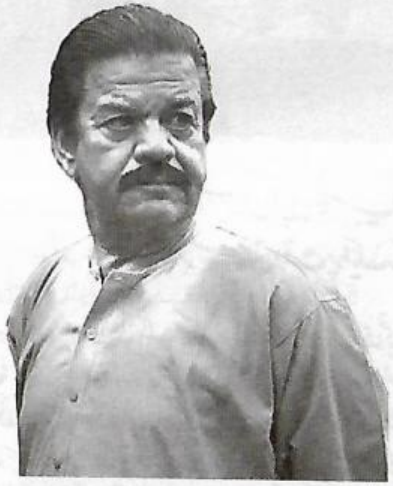

اس پرآشوب زمانے میں ایسی طویل، نیک نام اور ہر دلعزیزی کی حامل زندگی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ قاضی واجد کی روح پر بھی رب کریم کا فضل اسی طرح جاری رہے گا جو ان کی زندگی میں تھا اور وہ مجھ سمیت لاکھوں لوگوں کے دلوں میں دیر تک زندہ رہیں گے۔

(امجد اسلام امجد۔ بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

www.urdugem.com

تیسری چوری

شاکر لطیف

اُنھیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا مگر عین وقت پر ایک رکاوٹ آڑے آگئی

ٹی وی پر کسی ایشیائی ملک کے بارے میں خبر چل رہی تھی جہاں بینک لوٹنے کی ایک انوکھی اور منفرد واردات رونما ہوئی تھی۔ یہ انوکھی واردات بالکل فلمی طرز کی تھی۔ خبروں کے مطابق چوروں نے بینک سے کچھ فاصلے پر ایک مکان حاصل کیا پھر اُس کے اندر سے باقاعدہ سرنگ کھود کر بینک کے اندر داخل ہوئے تھے۔ انھیں یہ سرنگ کھودنے میں کئی ماہ لگے۔ بینک میں سرنگ کے ذریعے وہ چھٹی کے دن داخل ہوئے۔ چھٹی کی وجہ سے بینک بند تھا اس لیے اُنھوں نے آسانی سے ایک گیس کٹر کی مدد سے تجوری کاٹی اور ساری رقم لے کر سرنگ کے راستے فرار ہوگئے۔ وہ گھر بھی انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔

پولیس اُن کی تلاش میں سرگرداں تھی مگر وہ چور تو ایسے غائب ہوئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ حیرت کی بات یہ کہ چور کئی ماہ تک سرنگ کی کھدائی کرتے ہوئے ایک بند ویگن کی مدد سے مٹی بھی دوسری جگہ منتقل کرتے رہے، مگر آس پاس کے کسی ہمسائے کو بھنک بھی نہ پڑی کہ وہاں کوئی غیر قانونی کام ہو رہا ہے۔ انھیں بھی خبروں ہی سے اس چوری کا علم ہوا۔

میرا نام مورگن ہے، آرتھر، جورڈی اور ہوتھم میرے سگے بھائی ہیں۔ ہم امریکی شہری ہیں۔ ہمارے والدین کو دنیا سے رخصت ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ شادی بھی ہم نے کی نہیں تھی اس لیے زندگی کافی بے فکری سے گزر رہی تھی۔ تاہم زندگی کا کچھ حصہ جیل یاترا میں بھی گزرا تھا، کیونکہ ہم چاروں بھائی پیشہ ور چور تھے۔ ہم نے چوری کی وارداتوں کا آغاز بچپن سے ہی کر دیا تھا۔ شروع شروع میں ہم مختلف سٹورز اور دکانوں وغیرہ سے چھوٹی چھوٹی اشیاء چوری کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہم نے راہ چلتی خواتین سے پرس چھیننے کا آغاز کر دیا

وارادات کا یہ طریقہ خاصا کامیاب رہا۔ صنف نازک ہونے کی وجہ سے خواتین زیادہ مزاحمت نہیں کرتی تھیں اور بعض اوقات خاصی رقم بھی حاصل ہو جاتی۔ خواتین کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہم خنجر کا استعمال کرتے تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ خنجر کا استعمال محض انھیں خوفزدہ کرنے تک ہی محدود تھا۔ نہ ہم اس ہتھیار کا عملی استعمال کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی اس کی کبھی نوبت آئی تھی۔

پہلی بار ہم چاروں پولیس کے ہتھے اُس وقت چڑھے جب میں نے اپنے بھائیوں کو ایک گھر میں گُھس کر وارادات کرنے کا دانشمندانہ مشورہ دیا۔ میں تمام معلومات اکٹھی کر چکا تھا۔ اُس گھر میں صرف دو میاں بیوی رہائش پزیر تھے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی اور انہوں نے گھر کی حفاظت کے لیے کوئی چوکیدار بھی نہیں رکھا ہوا تھا۔

چوری کی وارادات انجام دینے کے لیے یہ گھر موزوں تھا۔ دونوں میاں بیوی صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک گھر نہیں ہوتے تھے۔ وہ کسی دفتر میں ملازمت کرتے اور شام کو واپس آتے تھے۔ ہمارے لیے اتنی معلومات ہی کافی تھیں کہ اُن کا گھر روزانہ آٹھ سے نو گھنٹے خالی رہتا ہے۔ گویا اگر ہم اس دوران اُس گھر میں داخل ہوتے تو کسی ذی روح سے سامنا ہونے کا امکان نہیں تھا۔ ہم آسانی سے اُس گھر میں موجود قیمتی سامان اور رقم چوری کر سکتے تھے۔

آج تک ہماری وارداتوں کا دائرہ کار اسٹریٹ کرائم تک ہی محدود تھا۔ کسی کے گھر میں گھس کر چوری کرنے کی یہ ہماری پہلی واردات تھی۔ ہم اُس گھر میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر گھسنے میں بھی کامیاب رہے، مگر اسے اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی کہ عین اُس دن مالکان نے دو بلڈاگ نسل کے کتے خرید لیے تھے۔ ہم چاروں جیسے ہی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے، کتوں نے ہمارا بھرپور استقبال کیا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ اندر داخل ہوتے وقت وہ کتے بھونکے بھی نہیں ورنہ شاید اُن کی آواز سُن کر ہم اندر داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیتے اور بچ جاتے۔

بہر حال ہم اندر داخل ہو چکے تھے۔ کتوں نے اپنے نوکیلے دانتوں سے ہم چاروں بھائیوں کو بلا تکلف جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہماری چیخوں کی آواز سُن کر کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی۔ پولیس نے ہی آ کر اُن کتوں سے ہماری جان چھڑائی۔

ہم خاصے پرانے چور تھے مگر پولیس کی گرفت میں پہلی بار آئے تھے۔ پہلی بار پکڑے جانے کی وجہ سے قانون نے بھی ہمارے ساتھ نرمی برتی اور ہمیں صرف چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔

جیل کی زندگی بہت مشکل اور سخت تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم چاروں بھائیوں کے لیے یہ خوفناک تجربہ تھا۔ ہمیں صبح سے لے کر شام تک کام کرنا پڑتا اور بعض اوقات اپنے ساتھ ساتھ دیگر قیدیوں کا بھی۔ ایسے قیدی جو جیل میں لڑائی بھڑائی میں خاصے بدنام تھے، کے شر سے بچنے کے لیے ہم جیسے نووارد قیدی اُن کے کام کرنے پر مجبور تھے، ورنہ اُن کی مار کھانی پڑتی۔ میں تو دوگنی مشکل میں گرفتار تھا۔ مجھے قیدیوں کے ساتھ ساتھ اپنے تینوں بھائیوں سے بھی مار پڑتی۔

بقول اُن کے وہ میری وجہ سے ہی زندگی میں پہلی بار پابند سلاسل ہوئے تھے۔ مجھے تشدد کا نشانہ بناتے وقت میرے تینوں بھائی یہ بھی نہ سوچتے کہ میں اُن کا بڑا بھائی تھا۔ بس جسمانی طور پر خاصا کمزور تھا۔ جس کا وہ تینوں بھرپور فائدہ اُٹھاتے۔ اگر میں جسمانی طور پر کڑیل ہوتا بھی، تو اُن سے بیک وقت مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

چھ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ہمیں پروانۂ آزادی ملا۔ واپس آتے ہی ہم نے پھر سے راہگیر خواتین کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اُن تینوں نے اس بار قسم کھائی تھی کہ آئندہ کوئی بھی واردات انجام دیتے ہوئے اپنی اوقات میں رہیں گے۔ اُن کی اوقات چھوٹے موٹے سٹریٹ

www.urdugem.com

کرائمز ہی تھے۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اب وہ میری باتوں میں آ کر کسی گھر میں چوری نہیں کریں گے، مگر جلد ہی انھوں نے اپنی قسم توڑ ڈالی۔ میرے دلائل سے متاثر ہو کر وہ ایک بار پھر اپنی اوقات سے باہر ہونے پر رضامند ہو گئے۔ میں پُر اثر گفتگو سے انھیں قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ اب ہم ناکام نہیں ہوں گے کیونکہ اس بار میں پوری تسلی کر چکا کہ جس گھر میں ہم داخل ہونے والے ہیں وہاں کتے نہیں اور نہ ہی آئیں گے کیونکہ مالک کو کتوں سے نفرت تھی۔

میری معلومات کے مطابق اُس گھر میں صرف ایک کروڑ پتی بوڑھا تنہا رہتا تھا۔ اُس کی بیوی وفات پا چکی تھی اور بچے کسی اور شہر میں رہائش پزیر تھے۔ وہ اکیلا شخص ہمارے لیے بہت آسان حدف تھا شاید اسی لیے میرے بھائی اس واردات کے لیے تیار ہوئے۔ ہم کامیابی کی امید لیے بُوڑھے کے گھر کی دیواریں پھاند کر اندر داخل ہوئے مگر ہمیں پہلے ہی مرحلے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بوڑھے کے گھر میں خفیہ کیمرے نصب تھے جن کی وجہ سے وہ ہماری آمد سے باخبر ہو چکا تھا۔

وہ گھر کے لان میں اپنی رائفل کے ہمراہ ہمارا منتظر تھا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، ہالٹ کی زوردار آواز نے ہمیں ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے پولیس کو بھی مطلع کر دیا اور گن پوائنٹ پر ہمیں اُس وقت تک ہاتھ اٹھانے پر مجبور رکھا جب تک پولیس نہیں پہنچ گئی۔ میرا دوسرا منصوبہ بھی ناکامی سے دوچار ہو چکا تھا۔ پولیس نے ہم چاروں کو گرفتار کر لیا۔ ہمارا کریمنل ریکارڈ پولیس کے پاس موجود تھا اس لیے اس بار عدالت نے کوئی نرمی نہیں برتی اور ہمیں ایک سال کی قید سنائی گئی۔

جیل میں ایک بار پھر ہماری زندگی کے مشکل اور کٹھن دور کا آغاز ہوا۔ خاص کر میرے لیے تو بہت مشکل صورتحال تھی۔ مجھے اپنے تینوں بھائیوں کی صورت ایک مصیبت کا سامنا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ میری وجہ سے ہی وہ دوبارہ پھنسے۔

جیل میں اُن پر غصے اور جھنجلاہٹ کا دورہ سا پڑا رہتا تھا اور اُن کا غصہ کم اُسی وقت ہوتا جب وہ میری اچھی طرح دُھلائی کر لیتے۔ اُنھوں نے میرے تین دانت بھی توڑ ڈالے تھے۔

وقت جتنا بھی مشکل ہو، کٹ ہی جاتا ہے۔ یہ ایک سال بھی گزر گیا اور ہم جیل سے رہا ہو کر واپس آ گئے۔ ان دنوں سٹریٹ کرائم کی روم تھام کے سلسلے میں حکومتی سطح پر خاصے سخت اقدام اٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ہم نے خواتین سے پرس چھیننے کا کام بھی ترک کر دیا اور آج کل اپنی فطرت کے برعکس محنت مزدوری کر رہے تھے۔ تاہم ٹی وی پر چلنے والی اس انوکھی واردات کی خبریں دیکھ کر میرے اندر کا سویا ہوا چور پھر سے بیدار ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں بول پڑا۔ ''میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے جس پر عمل کر کے ہمارے وارے نیارے اور ہم کروڑ پتی بن جائیں گے۔''

میری بات سُن کر تینوں نے کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ بدستور ٹی وی دیکھنے میں منہمک رہے۔ تاہم میں جانتا تھا کہ اُنھوں نے میری بات سن لی ہے۔ ''قسمت ہمیں دولت مند بننے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔'' میں نے پہلے سے بلند آواز میں کہا۔

''لگتا ہے بڑے بھائی کا مار کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' جورڈی نے کسل مندی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''تم ایک بار منصوبے کے بارے میں سُن تو لو۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''چلو بھائیو! جیل جانے کی تیاری کرو۔ بڑے بھائی کے ذہن میں پھر کوئی منصوبہ زیرِ گردش ہے۔'' اس بار آرتھر بولا۔

''تم سُنے بغیر میرا پلان رد نہیں کر سکتے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''اور یہ بھی بتا دو کہ اس بار ہم کتنے عرصے کے لیے جیل جا رہے ہیں؟'' بوتھم نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ تاہم دوسرے بھائیوں کی طرح اُس کا لہجہ بھی استہزائیہ ہی تھا۔

''اس بار ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے مفاہمانہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ اس بار ہمیں کسی کے گھر میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' بوتھم نے حیرانی سے پوچھا۔

میری بات سُن کر آرتھر اور جورڈی کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات اُمنڈ آئے تھے۔

''مطلب بڑا صاف اور واضح ہے'' میں نے ذومعنی لہجے میں جواب دیا۔

''ہم اپنے ہی گھر میں یہ واردات انجام دیں گے۔''

میرا جواب سُن کر اُنھوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اُنھیں میری ذہنی صحت پر شُبہ ہو۔ جورڈی اس شُبہے کو زبان پر بھی لے آیا۔

''مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو چکا۔''

''بالکل نہیں'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ جس گھر میں ہم رہ رہے ہیں اس کے محلِ وقوع کی کیا قدر و قیمت ہے۔ یہ گھر ہمارے باپ کی طرف سے ہمیں وراثت میں ملا تھا۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہم نے آج تک اسے فروخت نہیں کیا۔ اب یہی گھر ہمیں کروڑ پتی بنائے گا۔''

''میری برداشت اب جواب دیتی جا رہی ہے۔'' جورڈی نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''سیدھی طرح بکو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''میں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی تم نے ٹی وی پر کسی ایشائی ملک میں ہونے والی واردات کے بارے میں خبریں سُنیں۔ چوروں نے سرنگ لگا کر بینک کا سارا کیش لوٹ لیا۔ کیا ہم لوگ خوش قسمت نہیں کہ ہمارا گھر اس شہر کے ایک بڑے بینک کے عقبی جانب کچھ ہی دور واقع ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم بھی ایسی ہی کوئی واردات انجام دے سکتے ہیں؟'' جورڈی نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ مدعا سمجھ میں آتے ہی آرتھر اور بوتھم کے چہروں پر بھی دلچسپی کے تاثرات عود کر آئے تھے۔

''تم سب ٹھنڈے دماغ سے غور کرو۔ کیا میں نے کوئی انہونی بات کر دی؟'' میں نے جواب دیا۔

''مگر بینک ہمارے گھر کے بالکل قریب بھی واقع نہیں۔'' بوتھم نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''وہاں تک سرنگ بنانے میں کافی عرصہ لگ جائے گا۔''

''ہاں!'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''بینک اور ہمارے گھر کے درمیان فاصلہ مدِنظر رکھتے ہوئے میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ہمیں بینک تک سرنگ کھودنے میں پانچ سے چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوگا۔ اگر ہم درمیان میں موجود دوسرے گھروں کے نیچے سے بینک تک سرنگ کھودنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر ہم چھٹی کے دن سرنگ کا رخ اُوپر کی جانب کریں گے اور بینک کا فرش توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے۔ بینک کی تجوری کاٹنے کے لیے ہم بھی جدید گیس کٹر کا استعمال کریں گے اور ساری رقم لوٹ کر اُسی سرنگ کے راستے سے واپس آ جائیں گے۔''

''اُس کے بعد کیا ہوگا؟'' آرتھر نے پوچھا۔ ''کیا امریکی پولیس ہمارا پیچھا چھوڑ دے گی؟ اُسے جیسے ہی معلوم ہوگا کہ یہ سرنگ ہم نے نکالی ہے، وہ فوراً ہماری تلاش میں سرگرداں ہو جائے گی۔ ہم کب تک بھاگتے رہیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے پولیس سے بچنے کا حل بھی سوچ لیا ہے۔ رقم ہاتھ میں آتے ہی ہمیں امریکا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا ہوگا۔ ہم ہمسایہ ریاست میکسیکو چلے جائیں گے۔ یہ سفر ہم ہائی روڈ طے کریں گے ہر روز ہزاروں افراد امریکا سے ہائی روڈ میکسیکو کا سفر کرتے ہیں کیونکہ حکومت کی جانب سے اس کی اجازت

www.urdugem.com

دی گئی۔ اگر سرحدی گارڈز کی طرف سے ہمیں روکا بھی گیا تو ہم انھیں رشوت دے کر اپنا کام نکلوالیں گے۔ جیب میں پیسا ہو تو بظاہر مشکل بلکہ ناممکن نظر آنے والے کام بھی آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم میکسیکو داخل ہو گئے تو پھر امریکی پولیس کی دسترس سے بھی باہر ہو جائیں گے۔

''ہم نے قسم کھائی تھی کہ اب تمہاری باتوں میں نہیں آئیں گے، مگر تم ہمیشہ ہمیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو۔'' جورڈی نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''اس بار میرے منصوبے میں کوئی سقم یا جھول نہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مگر یاد رکھو! اتنی لمبی سرنگ کھودنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ سخت مشکل اور جاں گسل کام ثابت ہوگا۔ ہم مستقل مزاجی سے کام کریں گے تبھی کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔''

''ہم یہ سرنگ کھودیں گے۔'' آرتھر نے جورڈی اور ہوتھم کی آنکھوں میں رضامندی کا عندیہ پا کر مجھے مخاطب کیا، ''مگر یاد رکھنا.. تمہاری وجہ سے ہم نے پہلے بھی دو بار ناکامی کا منہ دیکھا ہے۔ اگر اس بار ایسا ہوا، تو ہم تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تم برسوں تک کسی نئے منصوبے کا نام تک نہیں لو گے۔''

''میں ہر طرح کی ذمے داری اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔'' میں نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار میرا منصوبہ سو فیصد کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔''

''بہرحال اب تم رضامند ہو ہی گئے ہو تو کل سے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ کل سے محنت مزدوری بند اور کام شروع۔''

میری بات سُن کر تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں دل ہی دل میں اپنی ذہانت کو داد دینے لگا۔ آخر میں نے دولت مند بننے کے لیے اتنا شاندار منصوبہ بھی تو سوچا تھا۔ اس لیے داد تو بنتی تھی۔ اگلے دو دن خاصے مصروف گزرے۔ ہم نے کھدائی کے لیے کدالوں وغیرہ کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پاس موجود تمام جمع پونجی سے ایک چھوٹی سی بند ویگن بھی خرید لی۔ مٹی پھینکنے کے لیے ویگن بہت ضروری تھی۔

ان دو دن میں، میں نے بینک اور اپنے گھر کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لے کر باقاعدہ ایک نقشہ بھی ترتیب دے دیا تھا۔ ہمیں کھدائی کا آغاز اپنے گھر کے سٹور سے کرنا تھا اور کھدائی کے دوران اس بات کو بھی مدنظر رکھنا تھا کہ آس پاس کے کسی ہمسایے کو اس کی بھنک نہ پڑے ورنہ میرا یہ منصوبہ بھی چوپٹ ہو جاتا۔

ویسے ہم سے ملنے آس پاس سے کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ اپنے علاقے میں ہم خاصے بدنام تھے۔ اس لیے کوئی بھی ہم جیسے چوروں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم نے بہت احتیاط سے اپنے گھر کے سٹور روم کا فرش توڑا اور کوشش کی کہ زیادہ آواز بھی پیدا نہ ہو۔ نیچے سے برآمد ہونے والے کچے فرش کو پہلے پانی سے تر کیا اور پھر باقاعدہ کھدائی کا آغاز کر دیا۔ پانی لگانے کے دو فائدے تھے۔ پہلا یہ کہ زیادہ گرد و غبار نہیں اُڑتا تھا اور دوسرا گیلی مٹی کو کھودنا بھی آسان تھا۔

پہلے ہفتے میں ہم صرف گہرائی میں گڑھا کھودتے رہے اور جب ہمیں یقین ہو گیا کہ آس پاس کے مکانوں کی بنیادوں سے زیادہ گہرائی میں کھدائی ہو چکی، تو ہم نے بینک کی طرف سرنگ نکالنا شروع کر دی۔ ہم تین مہینے تک پوری محنت اور جاں فشانی سے کام کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً سرنگ سے نکالی جانے والی مٹی کو بھی اپنی بند ویگن کے ذریعے شہر سے باہر ٹھکانے لگاتے رہے۔

تین مہینے کی جاں گسل جدوجہد کے بعد ہم صرف آدھی سرنگ ہی کھود پائے تھے۔ ہم نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے بہت گہرائی میں سرنگ بنائی تھی، ورنہ اس کے بیٹھنے کا خطرہ بڑھ جاتا۔ ہم صبح سے شام تک روزانہ کام کرتے۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ ہم سب دن بھر سرنگ میں کھدائی کرنے کے بعد اب نہا دھو کر اپنے ڈرائنگ روم

میں بیٹھے تھے۔ کیونکہ ہم تین مہینے سے سرنگ کی کھدائی کرنے کی وجہ سے کوئی کام دھندہ نہیں کر رہے تھے، اس لیے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہم نے وقتاً فوقتاً گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وجہ سے میرے تینوں بھائی مجھ سے کچھ متنفر بھی ہو گئے تھے۔ مجھے اب اُن کا کھویا ہوا اعتماد ہر صورت بحال کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مایوس ہو کر سرنگ کھودنا ہی بند کر دیں۔

تین مہینے گزر گئے، ابھی تک ہم صرف آدھا کام ہی مکمل کر پائے ہیں۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے آج ہم نے اپنا ٹی وی بھی فروخت کر دیا۔

''آخر اس طرح کب تک چلے گا؟'' آرتھر نے غصیلے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ جورڈی اور ہوتھم بھی خاصے غصے میں تھے۔

''بس ہمیں چند ماہ ہی تو کوفت اٹھانی ہے۔'' میں نے انھیں تسلی دی۔ ''اس کے بعد بینک کا سارا کیش ہمارے قبضے میں ہوگا۔''

''مگر ہمیں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنا سامان فروخت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح تو گھر کا سارا سامان بک جائے گا۔'' آرتھر نے متذبذب لہجے میں کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''کیش حاصل کرنے کے بعد بھی تو ہمیں یہ سامان یہیں چھوڑ کر فرار ہونا ہے۔ تم ان باتوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے کام پر دھیان دو۔ ابھی تک ہمارا سارا کام منصوبے کے عین مطابق چل رہا ہے۔ بس تمہیں صبر تحمل اور مستقل مزاجی سے کام لینا ہے۔ کامیابی اب ہم سے زیادہ دور نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' آرتھر نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''مگر یاد رکھنا! ہم نے اس بار تمہارے کہنے پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ اگر ہم ناکام ہوئے تو اپنا انجام تم خود ہی طے کر لینا۔''

''ایک تو تم تینوں میں بہت بُری عادت ہے کہ مایوس بڑی جلدی ہو جاتے ہو۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اگر تم باتوں کے بجائے کام پر توجہ دو تو ہم اپنا مطلوبہ ہدف جلدی حاصل کر لیں گے۔''

اس بار اُن میں سے کوئی نہ بولا۔ شاید میری باتیں اُن پر اثر کر گئی تھیں۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس سرنگ کو مکمل کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگلے دن ہم نے نئے جوش اور ولولے سے کام شروع کر دیا۔ روزانہ سرنگ کی کھدائی کرتے مزید ایک ماہ گزر گیا۔ جیسے جیسے سرنگ کی طوالت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، آکسیجن میں بھی کمی واقع ہونے لگی۔ اس وجہ سے سرنگ میں سانس لینا بھی دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔ اب ہماری دیوانگی اور ولولہ عروج پر تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جلد ہمیں ہماری محنت کا صلہ ملنے والا ہے۔ اس لیے ہم اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر مشکل سے نمٹتے جا رہے تھے۔

میں جب دوپہر کا کھانا لینے بازار جاتا تو بینک کے سامنے سے بھی گزرتا۔ وہاں کیش لانے والی گاڑیاں دیکھ کر سوچتا کہ جلد ہی میرا شمار بھی دولت مندوں میں ہونے لگے گا۔ میرے اکھڑ اور بدتمیز بھائی بھی میری عزت کریں گے کہ میری وجہ سے ہی انھیں دولت نصیب ہوئی۔ وہ اپنے ذہین بھائی پر فخر کیا کریں گے۔

انسان جب کسی مقصد کو پا لینے کا مصمم ارادہ کر لے تو پھر کامیابی بھی اُس کے قدم چومتی ہے۔ مزید دو ماہ تک کھدائی کے بعد ہم سرنگ کو بینک کی بنیادوں کے نیچے لے جانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اب ہم پانچ چھ گھنٹے کی اُوپر کی جانب کھدائی سے اس سرنگ کو بینک کے اندر کھول سکتے تھے، مگر یہ کام ہمیں ویک اینڈ کے دن شروع کرنا تھا تاکہ دو چھٹیوں کی وجہ سے بینک کے اندر کوئی موجود نہ ہو اور ہم بآسانی تجوری کاٹ سکیں۔

چھٹی کے دن بھی بینک کے باہر سیکورٹی موجود رہتی

www.urdugem.com

تھی۔ میں اس کا بھی جائزہ لے چکا تھا۔ سیکورٹی بینک کے مین گیٹ پر ہوتی۔ سرنگ کھول کر ہم اپنے کام کا آغاز کرتے تو مین گیٹ پر موجود عملہ عمارت کے اندر ہونے والی کسی تبدیلی کو محسوس نہیں کر پاتا۔ پھر گیس کٹر سے آواز پیدا ہوتی تھی مگر کنکریٹ کی مضبوط دیواروں سے آواز کے باہر سنے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا اور کل ہمیں بینک کے اندر داخل ہونا تھا۔ ہمارا ارادہ رقم لوٹ کر اپنی کھٹارا ویگن پر ہی فرار ہونے کا تھا۔ ہم نے ویگن کے اندر ایسے خفیہ خانے بنا لیے تھے جہاں رقم چھپا سکتے تھے۔ رقم حاصل کرنے کے بعد ہماری سب سے پہلی ترجیح امریکی سرحد عبور کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا یہ کام بھی آسانی سے ہو جائے گا۔

تجوری کاٹنے کے لیے جدید گیس کٹر کا انتظام بھی ہم کر چکے تھے۔ ساری تیاری مکمل تھی بس اب اگلے دن کا انتظار تھا۔ اُس کے بعد چند فٹ کی مزید کھدائی ہمیں بینک میں داخل کر دیتی۔ میں نے اندازے سے سرنگ اور بینک کے فرش کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ ہی رکھا تھا، کیونکہ اگر یہ فاصلہ کم کر دیا جاتا تو فرش بیٹھ کر سرنگ میں آ جاتا اور ہم چھٹی کے دن سے پہلے اس تباہی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

میں دوپہر کا کھانا لینے بازار جانے نکلا تو جورڈی بھی میرے ساتھ چل پڑا۔

"کافی کا سامان بھی لیتے آنا۔" ہمیں جاتے دیکھ کر بوتھم نے ہانک لگائی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بازار جاتے ہوئے ہم بینک کے سامنے سے گزرے تو مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ عام طور پر بینک کے سامنے بڑا ہجوم ہوتا تھا مگر اس وقت گویا وہاں ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ شاید کھانے کا وقفہ ہے۔ میں نے سوچا۔

میری طرح یہ تبدیلی جورڈی نے بھی محسوس کر لی۔

"کیا آج بینک میں تعطیل ہے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے کسی تعطیل کے بارے میں علم نہیں۔" میں نے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "بہرحال پوچھ لیتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے میں مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا، جہاں ایک سیکورٹی گارڈ موجود تھا۔

مجھے اور جورڈی کو دیکھ کر اُس سیکورٹی گارڈ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاید وہ ہمیں بینک کا کوئی گاہک سمجھا تھا۔ اس لیے ہمارے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"معاف کیجیے۔ بینک یہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ کو کوئی کام ہے تو یہاں سے پانچ کلومیٹر سُپر مارکیٹ تشریف لے جائیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ بینک تو یہ ہے۔" میں نے عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سیکورٹی گارڈ کی بات سُن کر میری طرح جورڈی کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات اُمنڈ آئے۔

"محترم کسٹمر! یہ منتقلی آج صبح سویرے ہی شروع کی گئی ہے۔ اسی لیے شاید آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔" سیکورٹی گارڈ نے خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "دراصل یہ عمارت بینک نے کرایے پر حاصل کر رکھی تھی۔ اب اسے خالی کر دیا گیا ہے۔ یہاں سے صرف پانچ کلومیٹر دوری پر واقع سپر مارکیٹ میں ایک بڑی عمارت کرایے پر حاصل کر کے آج صبح ہی بینک وہاں منتقل کیا گیا ہے۔ ویسے اگر آپ کو کوئی چیک وغیرہ کیش کروانا ہے تو وہاں تشریف لے جائیں۔ بینک سے سارا کیش اُس نئی عمارت میں منتقل کیا جا چکا۔ میں تو اُن لوگوں کی نگرانی کر رہا ہوں جو اندر بینک کا باقی ماندہ فرنیچر اور دیگر سامان اُٹھانے آئے ہیں۔ اصل میں یہ منتقلی انتہائی عجلت میں کی گئی۔ اس باعث ہم اپنے تمام کسٹمرز سے معذرت خواہ ہیں۔"

علی اکمل تصور

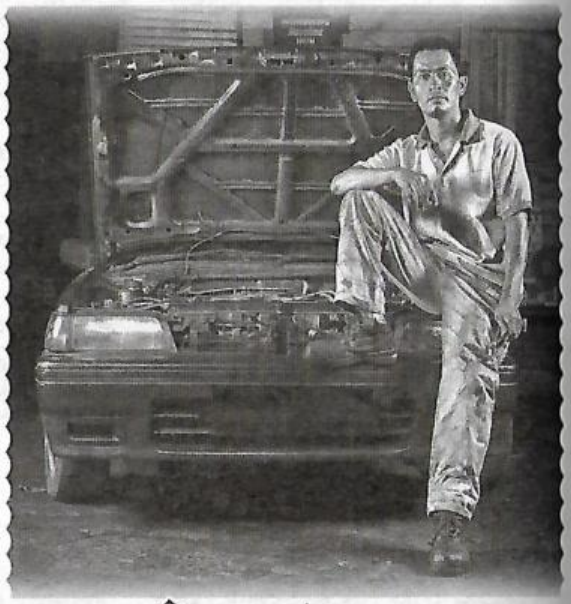

سیاہ و سفید

ایک اُستاد کی عبرت اثر کہانی،
وہ آنکھوں پر بندھی پٹی کے باعث ہیرے کو نہ دیکھ سکا

خوف کی وجہ سے اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ عالم یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دلوں کی دھڑکن بے ترتیب ہو چکی تھی۔ خاموشی ایسی تھی کہ کمرے میں سوئی بھی گرے تو آواز آئے۔ ایسے میں انھوں نے قدموں کی چاپ سنی۔ یہ چاپ قیامت کی آمد جیسی ہولناک تھی۔ اس لمحے ان سب کی خواہش تھی کاش کوئی ایسا جادو ہو جائے کہ وہ سب کے سب منظر سے غائب ہو جائیں مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔

ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ شدید غصے کی وجہ سے اُس کے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ اُس کے احترام میں سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب کو نظر انداز کرتے بڑھتا چلا گیا پھر دیوار کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ دیوار میں ایک الماری موجود تھی۔ اُس نے الماری کا ایک پٹ کھولا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا نظر آ رہا تھا۔ یہ ڈنڈا دیکھ کر دیکھنے والوں کی روح تک فنا ہو کر رہ گئی۔ اب وہ میز کے پاس آ کھڑا ہوا اور پھر سخت آواز میں بولا:

"کل جماعت سے جو طالب علم غیر حاضر تھے۔ وہ کھڑے ہو جائیں۔"

یہ بات سن کر دانش کو چکر آ گیا۔ جماعت تو کیا وہ تو کل سکول سے ہی غیر حاضر تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر اُس کی ٹانگوں میں جان نہیں تھی۔

"باہر آؤ۔" اُسے نیا حکم ملا۔

اب اُس نے ترچھی نگاہوں سے جماعت کا ماحول

www.urdugem.com

دیکھا۔ وہ اکیلا طالب علم تھا جو کل غیر حاضر تھا۔ اُس کے تمام دوست ہمدردی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اب وہ بے جان جسم کے ساتھ اُستاد جی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''بولو دانش کل سکول کیوں نہیں آئے؟'' استاد جی کا لہجہ دبنگ تھا۔

''وہ... سر... وہ... میں... سر... خوف کی وجہ سے دانش بول نہیں پا رہا تھا۔''

کیا مشکل تھی... بتاؤ نا۔'' استاد جی کی آواز کمرے میں گونجی۔

''ابو جی کی طبیعت خراب تھی... میں اُن کے ساتھ اسپتال گیا تھا۔ دانش کا چہرہ دھواں، دھواں ہو رہا تھا۔

''جھوٹ..... سفید جھوٹ.....'' استاد جی آگ بگولا ہو گئے۔ ''ہاتھ آگے کرو... ہاتھ...''

دانش کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنا لرزتا ہاتھ آگے کیا۔ استاد جی کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوا میں لہرایا اور پھر جیسے بجلی کوندی ہو۔ درد کی ایک تیز لہر دانش کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ ہتھیلی پر جیسے مرچی کا پودا اُگ آیا ہو۔ اُس نے سی، سی کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بغل میں دبا لیا۔

سر بشارت کی جماعت میں ایسے مناظر دن میں کئی بار نظر آتے۔ ''مولا بخش'' ایک ہی تھا مگر ہتھیلیاں بدلتی رہتی تھیں۔ سر بشارت کی جماعت کے تمام لڑکے ہر سال نمایاں پوزیشن لیتے تھے۔ اس کی وجہ سر بشارت کا ایک ہی اصول تھا! پیار نہیں... مار... سب سے زیادہ زیرِ عتاب دانش ہی آتا تھا۔ بہتر مستقبل کی تلاش میں دانش کے والدین گاؤں سے شہر آئے ہوئے تھے۔ یوں دانش کا سکول بھی تبدیل ہو گیا۔ اب وہ نئے سکول کا حصہ نہیں بن پا رہا تھا۔ روز روز کی مار سے دانش کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد وہ گھر واپس لوٹا اور پھر اُس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ماں پر نظر پڑتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ابو چارپائی پر لیٹے تھے۔

دانش نے جھوٹ نہیں بولا تھا، اُن کی طبیعت خراب تھی۔ دانش کو یوں روتا دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے۔

''کیا ہوا میرے بچے.....؟ امی نے اُسے آغوش میں لے لیا۔ دانش نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ امی ساری بات سمجھ گئی تھی۔

''ابو جی میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا، مگر اب میں اسکول نہیں جاؤں گا۔'' دانش نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''کوئی بات نہیں دانش... اسکول بدل لیتے ہیں... ابو نے اُسے مطمئن کرنے کے لیے ترکیب بتائی۔

''نہیں ابو... ہر اسکول میں سر بشارت جیسے استاد موجود ہوں گے۔ یہ اپنا گاؤں نہیں ہے۔ یہاں تو نمبروں کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ میں اس ''دوڑ'' میں کبھی جیت نہیں سکتا۔

ابو سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے۔ وہ دانش کی ذہنی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ اسی لیے دانش پر اس کے مزاج کے خلاف دباؤ ڈالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسری طرف دانش بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ ابو نے تھوڑے دن انتظار کیا مگر دانش نے اسکول جانے کا نام ہی نہیں لیا۔ آخر کار ابو جان زچ ہو گئے۔ ایک صبح انھوں نے دانش کو اپنے پاس بلا لیا۔

''ہاں تو دانش بیٹا..... پھر کیا سوچا ہے تم نے.....؟ وہ آخری مرتبہ تعلیم حاصل کرنے کے حوالے سے اپنے بیٹے کو قائل کرنا چاہتے تھے۔ دانش کے لیے ہی تو انھوں نے گاؤں چھوڑا تھا۔ اگر دانش تعلیم سے بھاگ جاتا تو اُن کا مقصد فوت ہو جاتا۔ دانش سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں بیٹا...'' ابو جی نے اُسے متوجہ کیا۔

''ابو جی..... آپ کیا کام کرتے ہیں.....؟'' دانش اچانک بولا۔

''یہ کیسا احمقانہ سوال ہے... ابو جی حیرت سے بول پڑے۔

''بتائیے نا ابو...'' دانش نے اصرار کیا۔

''میں کپڑے سلائی کرتا ہوں اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔

''آپ کو یہ کام پہلے سے آتا تھا یا کسی سے سیکھا تھا؟'' دانش نے دوسرا سوال داغ دیا۔

''حد ہے حماقت کی۔'' ابو جی کا مزاج خراب ہونے لگا تھا۔

''بتائیے نا...؟''

''گاؤں کے ماحول میں، میں پڑھ نہیں پایا، تو تمہارے دادا جی مجھے سلیم درزی کے پاس چھوڑ آئے تھے۔''

''سلیم درزی...؟ وہ سلیم لنگڑا.....'' دانش ایک جھٹکے سے بولا۔

''خبردار... منہ توڑ دوں گا..... وہ میرے استاد ہیں۔ اب سے اُن کا نام لو...'' ابو جی کا بلڈ پریشر ہائی ہو چکا تھا۔

''مجھے معاف کر دیجیے ابو جی...'' دانش ابو کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''ابو جی..... جو ہمیں تعلیم دے، وہ اُستاد کہلاتا ہے۔ ہنر سکھانے والا بھی اُستاد ہی ہوتا ہے۔ اس ماحول میں میں پڑھ نہیں پاؤں گا۔ میں ہنر سیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ضد کریں گے تو میں سکول چلا جاؤں گا مگر...'' اس سے آگے دانش کچھ نہیں بول پایا۔ وہ سسک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دیکھ کر ابو جی تڑپ کر رہ گئے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔

دانش نے سارا دن پریشانی کے عالم میں گزار دیا! رات کو ابو جی کی واپسی ہوئی۔ انھیں جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ ساتھ ہی وہ رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ دانش کے دل کو دھڑکا لگ گیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ ابو جی کے پاس آتا۔ ساری رات سونے جاگنے کی کیفیت میں گزر گئی۔ اگلی صبح ابو نے دانش کو آواز دی۔ ''دانش...''

''جی ابو جی...'' دانش لپک کر آیا۔

''اپنا اسکول بیگ اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو...'' ابو جی کا یہ حکم سن کر دانش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا مگر اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ خاموشی سے اسکول بیگ اٹھایا اور ابو کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سر جھکائے بس چلا جا رہا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت عجیب سی تھی۔ وہ خود کہیں اور تھا، دل کہیں اور تھا اور دماغ کہیں اور۔

''دانش...''

ابو کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا اور پھر چونک پڑا۔ وہ کسی اسکول کے سامنے نہیں کھڑا تھا۔ یہ تو ایک ورکشاپ تھی۔ ورکشاپ کے مالک نے انھیں خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔

''سنو بیٹا... میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تم میری اُمیدوں کا مرکز ہو۔ خواجہ صاحب میرے پرانے جاننے والے ہیں...'' ابو نے ورکشاپ کے مالک کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ پھر میں خواجہ صاحب سے ملا۔ ان کے پاس میری اور تمہاری مشکل کا حل موجود تھا۔ اس ورکشاپ میں تم ہنر سیکھو گے۔ ساتھ ہی تم یہاں اپنی تعلیم بھی جاری رکھ سکو گے۔ خواجہ صاحب تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ فرصت کے وقت میں وہ تمہیں ٹیوشن دیں گے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے طالب علم کا ریگولر ہونا تو ضروری نہیں ہے۔'' ابو جی سسک پڑے۔ دانش بھی روتے ہوئے اُن سے لپٹ گیا۔ عجیب منظر تھا۔ خواجہ صاحب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ پہلی ملاقات میں ہی خواجہ صاحب نے دانش کو اپنا لیا تھا۔ یہاں سے دانش کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ منزلوں پر منزلیں سر کرتا چلا گیا۔ دس سال گزر گئے۔ اب خواجہ صاحب کے بعد ورکشاپ کا سارا انظام دانش کے ہاتھ ہی میں ہوتا تھا۔

آج ہفتہ وار تعطیل تھی۔ لاہور میں ایک بڑی کمپنی کی طرف سے کار میلے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب کی طرف سے دانش اس کار میلے میں ان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ خواجہ

www.urdugem.com

صاحب نے سفر کے لیے کار دانش کے حوالے کی۔ مگر دانش نے موٹر سائیکل پر سفر کرنا پسند کیا۔ ویسے بھی مشکل سے چالیس کلومیٹر کا سفر ہی تو تھا۔ دانش چم چماتی بائیک پر بیٹھا مزے سے مگر محتاط انداز میں لاہور کی طرف سفر کر رہا تھا۔

اچانک اس نے موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ کر دی۔ اُس نے سڑک کنارے ایک بزرگ کو دیکھ لیا۔ وہ ایک کار کے پاس کھڑے تھے۔ بزرگ کے انداز سے بے چینی اور بے تابی کے تاثرات جھلک رہے تھے۔ دانش نے بائیک ان کے پاس روک لی۔ ''جناب..... خیریت تو ہے نا.....'' دانش نے ادب سے پوچھا۔

''ہاں... ہاں... خیریت ہے مگر...'' وہ بزرگ اپنی سوچ کے سفر سے واپس آچکے تھے۔

''مگر کیا...'' دانش نے پوچھا۔

''میں ایک کام سے لاہور جا رہا تھا مگر کار خراب ہو چکی ہے اور میرا وقت پر پہنچنا ضروری ہے.....'' بے چینی اس بزرگ کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں.....'' دانش نے موٹر سائیکل ایک طرف لگا دی اور پھر کار کے انجن کے ساتھ الجھ گیا۔ وہ اپنے ہنر میں ماہر تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ انجن سٹارٹ نہ ہوتا۔ بس پانچ منٹ لگے تھے اور کار سفر کرنے کے لیے تیار تھی مگر دانش کے ہاتھ کالے ہو چکے تھے۔ اس کے لباس پر بھی چند دھبے نظر آ رہے تھے۔

''بیٹا... اُجرت کیا ہے.....؟'' اس بار وہ بزرگ پیار سے بولے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی جیب میں سے پرس نکال لیا۔

''میں اپنے اُستاد سے پیسے نہیں لے سکتا...'' دانش مسکرا کر بولا۔

بزرگ نے غور سے دانش کی طرف دیکھا مگر پہچان نہ پائے۔ دانش اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ بزرگ کار کی اگلی نشست پر آبیٹھے۔ ڈرائیونگ ایک نوجوان کر رہا تھا۔

''اچھا کاریگر تھا، وہ نوجوان بولا۔'' ''ہاں..... اور باادب بھی...'' بزرگ بولے۔ مگر اُن کا ذہن ابھی تک دانش میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ ''کون تھا وہ.....؟ کون تھا وہ.....؟ وہ سوچ رہے تھے۔ اتنے میں پٹرول پمپ آ گیا۔ نوجوان نے گاڑی روکی اور پٹرول پمپ پر موجود لڑکے سے کہا۔ ''پندرہ سو روپے کا پٹرول ڈال دو...''۔

''استاد جی شرمندہ مت کریں۔ پٹرول کی قیمت میں ادا کروں گا...'' نوجوان نے بزرگ کو پرس نکالتے دیکھا تو بولا۔

بزرگ پیار سے بولے ''نہیں بیٹا...'' میرے لیے اتنا ہی بہت کافی ہے کہ تم نے لفٹ دی...'' یہ سن کر نوجوان کچھ نہ بولا۔ پٹرول کی قیمت بزرگ نے ادا کی۔ کار ایک بار پھر منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ جانے کیوں بزرگ کا دل اب بجھ چکا تھا۔ اب وہ ان دونوں نوجوانوں کا تقابلی جائزہ لے رہے تھے۔ ایک وہ تھا جس کے ہاتھ کالے تھے۔ ایک اُن کے ساتھ بیٹھا تھا جس کے ہاتھ سفید تھے۔ ''کون تھا وہ.....'' وہ اب بھی سوچ رہے تھے۔ پھر جیسے بجلی سی کوندی ''میں اپنے استاد سے پیسے نہیں لے سکتا...''

''امی جی کی طبیعت خراب تھی... میں اُن کے ساتھ اسپتال گیا تھا...''

'دانش... دانش...'' وہ بزرگ چلا اٹھے۔

''دانش... کون دانش...'' نوجوان نے پوچھا۔

''میرا شاگرد..... افسوس میں ہیرے کی شناخت نہیں کر پایا...'' ان کی آنکھوں سے آنسو پھسلنے لگے۔ یہ بزرگ سر بشارت ہی تھے۔ جن کا ایمان پیار نہیں مار تھا، لیکن آج ایک مظلوم کی مار نے انھیں تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ آج انھیں چراغ ہوتے ہوئے بھی گہرے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس ایک پل انھوں نے گہرے اندھیرے کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آنے والی زندگی میں وہ کسی بچے کے کالے ہاتھ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ●●●

ڈاکٹر فیاض ہرل

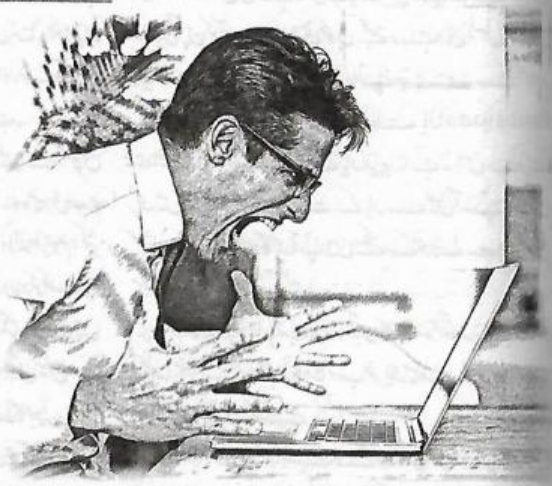

غُصہ جب وبالِ جان بن جائے

ایک منفی جذبے سے چھٹکارا دلانے والے مثبت طریقوں کا بیان

سوال: ڈاکٹر صاحب، اسلام علیکم

میں آپ سے ایک بہت اہم مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ انسان دوسرے لوگوں سے تعلقات کیسے بہتر بنا سکتا ہے؟ میرا نام خواجہ بشیر ہے۔ میں ایک سرکاری محکمے میں گزیٹیڈ افسر ہوں۔ اپنی پچاس سالہ زندگی میں، میں نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے اور مسلسل محنت سے اِس مقام تک پہنچا ہوں۔ اِس ظاہری کامیابی کے باوجود حلقۂ احباب نہیں، حالانکہ زندگی کے ہر مرحلے پر میرے بہت سے لوگوں سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔

میں جب اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ میں مزاجاً زُود رنج ہوں۔ ممکن ہے کہ اِس میں میرے بچپن اور لڑکپن کے ابتدائی تلخ حالات کا بھی دخل ہو۔ میرے والد مرحوم بہت مغلوب الغضب انسان تھے اور بچوں میں بڑا ہونے کے ناتے اِس کا سب سے زیادہ اثر میری طبیعت پر ہوا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ بیٹھنا اور تادیر روٹھے رہنا میری عادت بن گئی۔ والدہ مجھے مناتے مناتے تھک جاتیں لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔

بعد کی زندگی میں میری بہت سے لوگوں سے دوستی ہوئی لیکن افسوس یہ ہے کہ کوئی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ میں دوستوں کے لیے اپنا تن من دھن وار نے پر بھی تیار رہتا لیکن مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ وقت پڑنے پر اُن کی طرف سے ویسا ردِعمل (Response) نہیں ملتا تھا جس کی مجھے توقع ہوتی تھی۔ میرے حلقۂ احباب کے لوگ میرے غصّے اور جذباتی پن کی وجہ سے مجھے ''شہنشاہِ جذبات'' کہتے تھے اور میرے بارے میں اُن کی عمومی رائے یہی تھی کہ خواجہ صاحب کا کچھ پتا نہیں ہوتا کب دماغ گھوم جائے۔

سچ یہ ہے کہ دوستوں کی ایسی باتوں کو میں اپنی تعریف

www.urdugem.com

کے طور پر لیتا تھا کیونکہ مجھے لگتا یوں میرا رُعب قائم رہتا ہے اور کوئی مجھ سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ سب تعلقات خراب ہوتے گئے اور اب مجھے لگتا ہے کہ ہر شخص میرے پاس آنے سے گھبراتا ہے۔

میری گھریلو زندگی بظاہر ٹھیک ہے لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ بچے بھی مجھ سے دُور دُور رہتے ہیں۔ وہ میری عدم موجودگی میں زیادہ خوش رہتے ہیں۔ میرے والد مرحوم اکثر اولاد کی تربیت کا یہ قول دُہرایا کرتے تھے ''اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے۔'' مجھے لگتا ہے کہ میں بھی لاشعوری طور پر اِسی مقولے پر عمل کرتا رہا ہوں لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ گھر میں بھی اکیلا پن محسوس کرنے لگا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آخر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے جس کی وجہ سے میرے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔ میں ہمیشہ دوسرے لوگوں سے بہت مخلص ہوتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مسئلہ ہے کہ مجھ سے منافقت اور دوغلا پن برداشت نہیں ہوتا۔

جواب: آپ کا خط ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ کی شخصیت واضح طور پر جھلک رہی ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ آخر کس کمی کی وجہ سے آپ کی زندگی اِس موڑ پر آپہنچی؟ یقیناً یہی وہ نکتہ ہے جس کے تجزیے کی ضرورت ہے۔ اِس سے کوئی حل نکلنا متوقع ہے جس سے آپ کی زندگی کے عمومی حالات بہتر ہونے کا امکان پیدا ہوگا۔

پہلی اُمید افزا بات تو یہ ہے کہ آپ نے خود ہی اِس بات کو محسوس کرلیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی کمی یا خرابی ضرور موجود ہے ورنہ حالات اِس نہج پر نہ پہنچتے۔ علم نفسیات میں یہ بات ایک بنیادی اُصول ہے کہ کسی مسئلے کو سمجھنے کے لیے ذہن کا مائل اور تیار ہونا، حل کی طرف پہلا اور بہت بڑا قدم ہے۔

آپ کی زندگی کے حالات اور آپ کا عمومی رویہ واضح اشارہ کرتا ہے کہ یہ کمی اصل میں جذباتی کنٹرول (Emotional control) کی کمی ہے۔ عجیب بات یہی ہے کہ اپنے جس جذباتی پن کو آپ ہمیشہ اپنی خوبی سمجھتے رہے وہی اصل مسئلے کی بنیاد ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیق میں اپنے جذبات کے فہم اور کنٹرول کی خصوصیت کو جذباتی ذہانت یا (Emotional intelligence) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ میں آپ کے ذاتی حالات کے بارے میں آپ کو کوئی مشورہ دوں، بہتر ہوگا کہ آپ اِس نکتے کے حوالے سے چند عمومی معلومات ذہن نشین کرلیں۔

(۱) جذباتی ذہانت کی سائنس کا مقصد مختلف جذبات کو سمجھنا، اُن کے اظہار کا مناسب طریقہ سیکھنا اور اُن پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنا ہے۔

(۲) موجودہ علم نفسیات کے مطابق کسی انسان کا زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا تعلق اُس کی عمومی ذہانت (آئی کیو I/Q) کی نسبت جذباتی ذہانت (ای کیو E/Q) سے زیادہ گہرا ہے۔ بے شمار بہت ذہین لیکن عمومی طور پر زندگی میں ناکام رہ جانے والے لوگوں کا جب نفسیاتی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سب سے بڑی وجہ جس سے اُن کی عمومی ذہانت (آئی کیو) کامیابی میں نہ بدل سکی... جذباتی ذہانت کی کمی تھی۔

(۳) اِن لوگوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت مختلف طرح کے جذباتی ردِعمل (emotional reactions) یعنی غم وغصّہ، ضد، لڑائی جھگڑا حسد وندامت اور تلخی میں گزار دیا اور یوں جو منزل وہ پاسکتے تھے، اُس سے بہت دُور رہے۔

(۴) اگر اِن لوگوں نے زندگی کے کسی ایک شعبے میں کامیابی حاصل کر بھی لی تو دوسرے شعبوں میں شدید ناکامی نے اُن کی خوشی پر یکسر پانی پھیر دیا۔

خواجہ صاحب، آپ اگر اوپر بیان کردہ حقائق کو بغور پڑھیں تو آپ کو ایسا لگے گا کہ یہ آپ کی زندگی کی کہانی ہی بیان کی جارہی ہے۔ آپ ذرا تھوڑی دیر کے لیے کسی ایسی گاڑی، مشین یا آلے کا تصوّر کریں جو کنٹرول سے باہر ہو

جائے۔ یقیناً آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا ہونے کے بعد شدید نقصان کی توقع ہی ہوگی۔

قابو سے باہر ہوئے جذبات کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ ایک ایسی اندھی طاقت کی مانند ہیں جو پہلے اپنے آپ کو اور بعد میں آس پاس والوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔

آپ نے یقیناً ایسے بیسیوں واقعات سنے یا پڑھے ہوں گے جب غصّے میں کیے گئے چند منٹ کے عمل کا نتیجہ مہینوں بلکہ برسوں تک بھگتنا پڑتا ہے۔ اخبارات اور ٹی وی چینلز پر کتنے ہی واقعات روزانہ رپورٹ ہوتے ہیں جن میں لمحاتی غصّے کے باعث مرد وزن تشدد اور قتل جیسے سنگین جرائم تک کر بیٹھتے ہیں۔ فوری غصّے میں آکر طلاق دے دینا اور بعد میں پچھتاوے کا شکار ہوکر مفتی صاحبان کے ہاں حاضریاں دینا بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔

جدید میڈیکل سائنس کے مطابق شدید غصّے کی کیفیت میں انسانی جسم کے کچھ غدود بہت تیزی سے ایسے کیمیائی مادے (Catabolic Hormones) پیدا کرتے ہیں جو خلیوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل شروع کردیتے ہیں۔ عارضی طور پر یہ عمل جسم کو طاقت بھی دیتا ہے لیکن اگر یہی عمل بار بار دہرایا جاتا رہے تو نتیجے میں کچھ عرصے بعد جسمانی نظام کی قوتِ مدافعت (Body immunity) کم ہوجاتی ہے اور بہت سی بیماریاں مثلاً ہائی بلڈ پریشر، دماغی فالج، دل کی بیماریاں، معدے کے امراض وغیرہ چمٹنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

ہماری علمی تاریخ کی ایک دانا ہستی غصّے کے بارے میں کن الفاظ میں اظہار کرتی ہے، غور کے لائق ہے: ''بے قابو غصّہ ہاتھ میں پکڑے ایسے جلتے کوئلے کی مانند ہے جسے آپ کسی اور پر ہی پھینک دیں ہاتھ جل جانے کا امکان آپ کا ہی زیادہ ہوگا۔''

اب آپ ذرا یہ خوبصورت اور پُرمغز قول غور سے پڑھیے:

''غصّہ دوسرے کی خطا پر اپنے آپ کو سزا دینے کا نام ہے۔''

بالفرض یہ بات مان بھی لی جائے کہ ہم جتنی بار غصّہ کرتے ہیں، اُس میں دوسروں کی غلطی زیادہ ہوتی ہے۔ تب بھی نتیجہ ہمارے جسمانی و ذہنی نظام میں ہی زیادہ توڑ پھوڑ کی شکل میں آئے گا۔ آپ سوچیے کہ ایسے شخص کو عقلمند کیسے کہا جائے جو بار بار ایک ہی غلطی دُہرا کر نقصان اُٹھا تا رہے؟

اِن عمومی گزارشات کے بعد اب میں آپ کے بیان کردہ حالات کے حوالے سے چند نکات پیش کرتا ہوں۔

(الف) آپ نے غصّے کے حوالے سے عارضی نفع کا ذکر کیا کہ عام طور پر زیادہ غصّہ کرنے والے سے لوگ گھبراتے اور اُس کے منہ لگنے سے گریز کرتے ہیں۔ یوں بظاہر اُس کا رعب سا قائم رہتا ہے لیکن آپ ذرا اِس عارضی فائدے کا موازنہ طویل المدت نقصان سے کیجیے جس سے اچھے تعلقات بھی مستقل خراب اور دوستیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ گھر جسے مہر و محبت کا مرکز ہونا چاہیے، ویرانے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ آپ خود سوچیے کہ اگر چھوٹے فائدے کی اتنی بھیانک قیمت دینی پڑے تو کوئی عقلمند آدمی ایسا سودا کرے گا...!

آپ نے اپنے والد کے حوالے سے اولاد کی تربیت کا ایک مقولہ لکھا ہے کہ ''کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے''۔ یہ مقولہ ہمارے ہاں زبانِ زدِ عام ہے اور بغیر سوچے سمجھے کسی زرّیں اصول کے طور پر بولا جاتا ہے۔

اِس مقولے کے دو بنیادی اجزاء ہیں۔ اگر گہرا تجزیہ کیا جائے تو دونوں ہی بچوں کی تربیت کے بنیادی اُصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ بچوں کو سونے کا نوالہ کھلانا لازمی امر نہیں ہے بلکہ انھیں زندگی میں تنگی و کشادگی ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ اِسی طرح گھر میں ہر وقت خوف و دہشت کی علامت بنے رہنا کہ باپ نظر آتے ہی گھر والوں کے پسینے چھوٹنے لگیں اور کلیجہ منہ کو آنے لگے، ہرگز

www.urdugem.com

متوازن رویہ نہیں۔ اِس طرح کے ماحول سے بچوں میں مختلف طرح کے نفسیاتی خوف اور اعصاب زدگی (Nervousness) کی بیماریاں چمٹ سکتی ہیں۔

بچوں پر خوف کے نفسیاتی اثرات کے حوالے سے ایک مثال غور طلب ہے۔ ایک بار میرے نفسیاتی کلینک میں ایک خاتون تشریف لائیں جن کے شوہر سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ فوج میں بھی بطور کرنل کام کر چکے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ شوہر صاحب گھر میں بھی ڈسپلن کے نام پر بھرپور حاکمانہ اور جابرانہ رویہ رکھتے تھے۔

خاتون نے بتایا کہ میاں صاحب دفتر سے آنے کے بعد بچوں کو خود تین چار گھنٹے خوب محنت سے پڑھاتے ہیں۔ البتہ اِس سلسلے میں ہدایت یہ تھی کہ عین مقررہ وقت پر بچے مکمل تیاری کے ساتھ منتظر ہوں۔ وقت کی پابندی میں پانچ منٹ بھی آگے پیچھے ہونے پر سخت سرزنش کا امکان ہوتا۔ غرض یہ سمجھیے کہ گھر میں بھی مکمل اسکول کا ماحول بنا رہتا۔

خاتونِ خانہ نے یہ نوٹ کیا کہ مقررہ وقت سے قبل آخری ایک دو گھنٹوں میں بچے سخت خوفزدہ اور پریشان نظر آتے اور اپنا کوئی کام کرتے ہوئے بھی بار بار اُٹھ کر وقت دیکھتے۔ اُن کی ایک آٹھ سالہ بچی سے جب بات چیت ہوئی تو میں نے نوٹ کیا کہ وہ گھبراہٹ کی وجہ سے لکنت کا شکار تھی اور مستقل کئی ہفتوں سے نیند کی خرابی اور سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔ یوں بچوں کی نفسیاتی کیفیت اِن حالات کی وجہ سے رفتہ رفتہ بیماری کی شکل اختیار کر گئی۔ خاتون خود بھی انھیں دیکھ دیکھ کر شدید ڈپریشن کا شکار تھیں۔

درج بالا دونوں نکات پر غور کرنے سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ کئی دفعہ ہم اپنے غصّے کو صرف اپنی طاقت یا اقتدار کی حس (Urge to dominate) کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ عارضی طور پر ہمیں اِس میں کامیابی مل بھی جاتی ہے لیکن یاد رکھیے، آپ فقط خوف کے ذریعے کسی کو تادیر زیرِ اثر نہیں رکھ سکتے۔ خوف معین مدت کے بعد لازماً کم یا ختم ہو جاتا ہے۔ یوں وہ حلقۂ اثر جو فقط خوف کی وجہ سے قائم تھا، ہَوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اس تفصیلی تجزیے سے آپ کو اپنی طبیعت کے اصل مسئلے کا کچھ اندازہ ہو چکا ہوگا۔ اب میں اُن چند اقدامات کی نشاندہی، جن پر عمل درآمد سے آپ کسی حد تک اپنے حالات میں بہتری لا سکتے ہیں۔

☆ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ آپ ایک ڈائری لیجیے اور اِس کا نام "Angry diary" یعنی غصّے کی ڈائری رکھیے۔ اِس میں تاریخ، وقت، غصّے کا درجہ (Anger level) اور نتیجہ کے نام سے چار کالم بنائیے۔

جب بھی اظہارِ عصبہ کا واقعہ ہو تو آپ بعد میں غصّے کا درجہ یعنی ہلکا (mild)، درمیانہ (moderate) اور شدید (severe) متعیّن کیجیے۔ ہر وہ واقعہ جو شدید غصّے کے درجے (severe intensity) میں آتا ہو، اُس پر اپنے لیے خود کوئی سزا متعیّن کر لیجیے۔ سزا کا چناؤ ایسا ہونا چاہیے جو نفس پر بوجھ بنے مثلاً بیس نفل نماز، ایک ہزار روپے صدقہ یا چند دن کے لیے کوئی پسندیدہ مشغلہ روک دینا وغیرہ۔ سزا کا تعین اگر آدمی کے مزاج کے حساب سے ہو تو یہ زیادہ پُراثر ثابت ہوگی۔

جب بھی شدید غصّے کے دورے کا واقعہ ہو، متعین سزا پر عمل کرنا اپنے اوپر لازم کر لیجیے۔ آپ کچھ عرصے بعد محسوس کریں گے کہ غصّے کی شدت میں کمی آ رہی ہے۔

☆ شدید غصّے کے بعد تنہائی میں بیٹھ کر پُوری صورتِ حال اپنے تصوّر میں لائیں اور اپنے آپ سے سوال کریں کہ سارے واقعے میں ایسا کیا لائحہ عمل اختیار کیا جاتا جس سے مسئلہ حل ہو جاتا اور غصّے میں آنے کی ضرورت بھی نہ رہتی۔ آپ جب چند بار یہ ذہنی ورزش کریں گے تو کچھ عرصے بعد غصّے کے لمحات میں ذہن خود بخود کسی ایسے لائحہ عمل کی طرف

منتقل ہو جائے گا جس کا آپ نے پہلے تصوّر کیا تھا۔

☆ بچوں سے اپنے تعلقات بہتر بنانے کے لیے خصوصی کوشش کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر کبھی کبھار بچوں کی پسندیدہ کھانے پینے کی چیزیں لائیے اور ان کے ساتھ مل کر کھائیے۔ بہت سے والدین بچوں سے گفتگو کا موقع ملنے پر فقط ایک ہی بات اکثر پوچھتے ہیں کہ اُن کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ آپ ایسے رٹے رٹائے سوالوں کے بجائے بچوں سے پسندیدہ مشاغل اور دوستوں وغیرہ کے بارے میں باتیں کیجیے۔ بچوں سے باتیں کرتے ہوئے طویل نصیحت ناموں یا لیکچر بازی سے پرہیز ضروری ہے۔ بچے اِس طرح آپ کی باتوں سے بور ہو کر سنی ان سنی کرنے لگتے ہیں۔ نصیحت آمیز گفتگو صرف کبھی کبھار کریں اور وہ بھی بہت مختصر اور حکمت سے، ورنہ زیادہ نصیحتیں کرنا نفع کے بجائے اُلٹا نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔ بچے ضد میں آ کر آپ کی نصیحتوں سے جان بوجھ کر اُلٹ عمل کرنے لگتے ہیں۔

اگر بچوں میں سے کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرے تو گھر کے سب افراد کو اِکٹھا کر کے اُن کے سامنے اُس کی تعریف کیجیے۔ اگر آپ نے کچھ عرصہ ہی اِن باتوں پر عمل کیا، تو آپ کو گھر کی فضا میں تبدیلی کا احساس ہوگا اور بچے آپ سے قریب ہونے لگیں گے۔

☆ اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ نے غصّے میں کسی مخلص اور اچھے دوست کے ساتھ کبھی زیادتی کی ہے اور احساس ہونے کے باوجود سامنے معذرت کرنا مشکل لگے تو آپ اُسے خط لکھ کر یا پیغام کے ذریعے اپنی خلش کا اظہار کر کے معذرت طلب کر سکتے ہیں۔ اِس سے آپ کے دل پر پڑا بوجھ کم ہوگا اور دوبارہ اچھے تعلقات کی بحالی میں مدد ملے گی۔

☆ جسمانی ورزش کے باقاعدہ معمول سے بھی غصہ کنٹرول کرنے میں مدد ملتی ہے۔ سخت ورزش ضروری نہیں ہلکہ ہفتے میں کم از کم چار پانچ دفعہ آدھے گھنٹے کے لیے کسی کھلی جگہ یا پارک وغیرہ میں تیز قدم سیر مطلوبہ نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

☆ کیفین کی حامل تمام غذائیں مثلاً چائے، کافی، کولا مشروبات وغیرہ انسانی جسم میں ایسے کیمیائی مادّوں کی افزائش کرتی ہیں جو غصہ بڑھاتے ہیں۔ اِس لیے اگر اِن سے مکمل پرہیز نہ بھی کیا جا سکے تو اِن کا استعمال حدِّ اعتدال میں لانا ضروری ہے۔

☆ "Angre Management" کے نام سے ایک نفسیاتی طریقۂ علاج جو عام طور پر ۱۰ سے ۱۲ سیشنوں (Sessins) پر مبنی ہے، غصّہ کنٹرول کرنے میں نمایاں اثرات کا حامل دیکھا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اِس مکمل کورس میں حصّہ لے کر اپنا مسئلہ بہتر کر سکتے ہیں۔

☆ غصّے کے کنٹرول میں دوائیں بھی افادیت رکھتی ہیں۔ یہ دوائیں نشہ آور اثرات سے پاک اور مقررّہ مدت استعمال کرنے کے بعد با آسانی بند کی جا سکتی ہیں۔

☆ Anger Management کے نام سے بہت سی کتابیں اور میٹریل آج کل آسانی سے مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ آپ اِن سے رجوع کر کے نفع حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ ایک دانا ہستی کے الفاظ میں یہ بات سنہرے حروف سے لکھے جانے اور یاد رکھے جانے کے قابل ہے: "اپنے جذبات پر خود حکومت کرو نہ کہ تمہارے جذبات تم پر حکومت کرنے لگیں"۔

یہ جذبات ہی ہوتے ہیں جو انسان کو اچھا یا بُرا بنا دیتے ہیں مگر کیسے...؟
تحقیقی مضمون
انسان فطری طور پر اچھا ہے یا بُرا؟
پڑھیے صفحہ نمبر ۱۶۱ پر

www.urdugem.com

محمود غزنوی کے یادگار حملے

سید قاسم محمود

ایک افغان مجاہد کی داستان عزیمت جس نے ہندو حکمرانوں کو پے در پے شکستیں دیں اور کفرستان میں عَلم اسلام بلند کر دیا

قسط نمبر۴

پچھلی اقساط کا خلاصہ

ہندوستان میں مالابار کے ایک ہندو راجا نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی لشکر برصغیر کے نزدیک آپہنچا۔ ساتویں صدی میں سندھ کے حکمران، راجا داہر نے عرب جہاز رانوں کے بحری جہازوں پر قبضہ کرلیا۔ محمد بن قاسم مسلمانوں کو رہا کروانے پہنچے اور انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔ اسی طرح جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور دین اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔ اب آگے پڑھیے۔

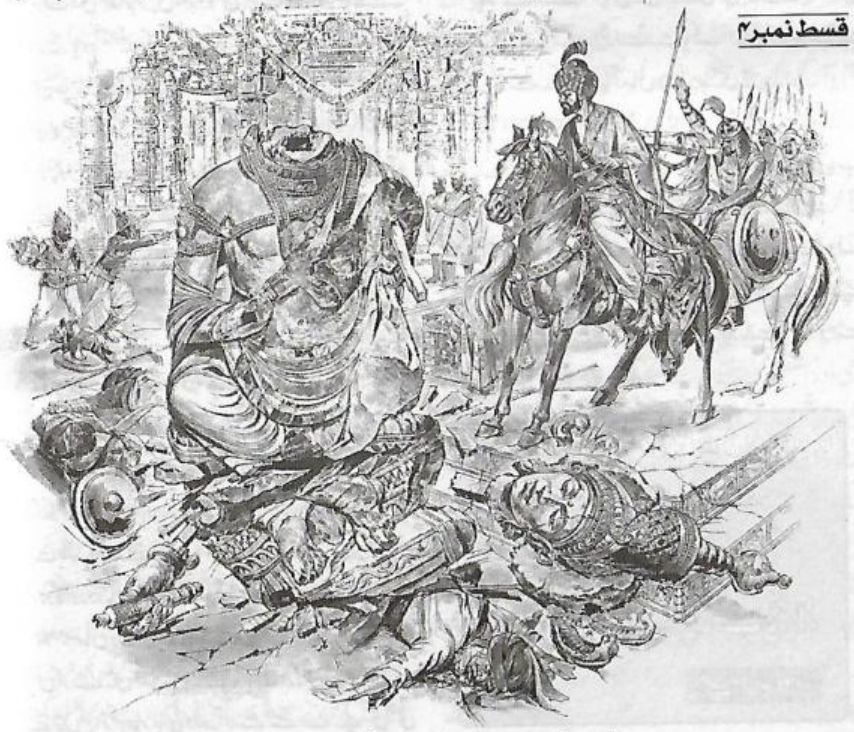

محمد بن قاسم نے دو سال کی مدت میں سندھ اور ملتان کا علاقہ فتح کرلیا اور عجب نہ تھا کہ اگر اسے مہلت ملتی تو وہ ہندوستان کے دور دراز حصوں میں فتح کے پھریرے لہراتا، لیکن عربوں کی قبائلی نزاعیں سد راہ ہوئیں اور چار سال کے اندر یہ جوان سال سپہ سالار واپس بلا لیا گیا۔

محمد بن قاسم نے صحرائے سندھ میں جو سرچشمہ فیض بہایا تھا، وہ خشک تو نہ ہوا، لیکن اس کے عرب جانشین اسے وسعت اور گہرائی نہ دے سکے۔ جو نہریں اس چشمہ فیض سے نکلی تھیں، وہ ملتان تک آتے آتے خشک ہوگئیں۔ پنجاب اور شمالی ہند کے باقی علاقوں میں آبیاری ان لوگوں نے کی، جو عرب سے نہیں بلکہ افغانستان سے آئے تھے اور انھیں بھی یہاں پہنچنے میں ایک زمانہ لگا۔

سندھ اور ملتان ۷۱۳ء میں فتح ہوئے۔ اس کے بعد تین سو سال تک راجپوت شمالی ہندوستان میں بے کھٹکے حکومت کرتے رہے اور باہر سے کوئی مسلمان تلوار کا دھنی ہندوستان میں نہیں آیا۔ ۹۸۰ء کے قریب امیر سبکتگین نے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کی طرف نظر کی اور بعض اہم فوجی مقامات فتح کر کے آنے والوں کا راستہ صاف کیا، لیکن عجیب اتفاق ہے، محمد بن قاسم کی مہم کی طرح اس نے بھی کسی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق نہیں، بلکہ واقعات سے مجبور ہوکر قدم اٹھایا۔

واقعات کا سلسلہ یوں ہے کہ خلافت عباسیہ کے عروج کے زمانے تک (۲۴۷ھ/۸۶۱ء) مراکش اور اندلس کے چھوٹے چھوٹے ملک چھوڑ کر باقی ساری اسلامی دنیا، ترکستان اور فرغانہ سے لے کر قیروان تک خلافت عباسیہ کے ماتحت تھی۔ لیکن عباسی خلافت کے زوال کے بعد اس اتحاد اور وحدت کا خاتمہ ہوگیا۔ جس صوبے دار کو جہاں موقع ملا، وہاں اس نے خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس طرح ایک مرکزی حکومت کی جگہ کئی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں تین خاص اور بڑی حکومتیں یہ ہیں: سامانی، بنی بویہ اور فاطمی۔

محمود غزنوی کی نسبت سے ہمارا تعلق آل سامان سے ہے۔ یہ حکومت (۸۷۴ء تا ۱۰۰۳) ماوراالنہر میں قائم رہی۔ افغانستان اور ایران کا علاقہ خراسان بھی اس حکومت میں شامل تھے۔ اس کا دارالحکومت بخارا تھا۔ سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، مرو، ہرات، نیشاپور اور رے سامانی حکومت کے بڑے اور خوشحال شہر تھے۔

سامانی عہد میں علم و ادب کی دل کھول کر سرپرستی کی گئی، لیکن اس دور کی بڑی خصوصیت فارسی زبان کی ترقی ہے۔ اس سے پہلے اسلامی حکومت کا مرکز عراق تھا، جہاں کی زبان عربی تھی۔ جو لوگ عرب نہیں تھے، جیسے ایرانی اور ترک وہ بھی عربی ہی میں کتابیں پڑھتے اور لکھتے تھے۔ حتیٰ کہ شاعری بھی مقامی زبان ترکی اور فارسی کے بجائے عربی میں ہوتی۔ چونکہ سامانیوں کی زبان فارسی تھی، اس لیے اب فارسی کو عروج حاصل ہوا۔ فارسی کے پہلے بڑے شاعر رودکی، مشہور فلسفی فارابی اور ابن سینا کا تعلق سامانی دربار سے تھا۔

محمود کا نانا الپتگین

جب سامانی بھی عباسیوں کی طرح کمزور ہوگئے، صوبیدار باغی ہونے لگے تو بلخ کے گورنر اور خراسان کی فوج کے کمانڈر الپتگین نے بھی بغاوت کی۔ وہ ابتدا میں سامانیوں کا غلام تھا۔ ترقی کرتے کرتے کمانڈر اور گورنر بنا۔ عبدالملک کی وفات کے بعد الپتگین نے منصور سامانی کی جانشینی سے اختلاف کیا، لہٰذا اسے حکومت سے معزول کر دیا گیا، مگر اس نے سامانی فوج کو بلخ کے نزدیک شکست فاش دی اور غزنی یا غزنہ پر قبضہ کر کے مستقل حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اسحاق جانشین ہوا، مگر وہ حکومت کے انتظامات سنبھال نہ سکا اور اس کے رفیق یکے

www.urdugem.com

بعد دیگرے عنانِ حکومت سنبھالتے رہے، یہاں تک کہ سبکتگین کی باری آئی۔

باپ سبکتگین

امیر سبکتگین (۹۴۲ء۔۹۹۷ء) الپگین کا غلام اور داماد تھا۔ اس کا سلسلہ نسب یزدجرد سے ملتا ہے جو فتح اسلام کے وقت ایران کا حاکم تھا۔ وہ شجاع اور مہم جو حکمران تھا، اس نے غزنی حکومت ہی پر قناعت نہ کی، بلکہ آگے بڑھ کر خراسان، سیستان اور لمغان (موجودہ جلال آباد) کو بھی فتح کر لیا۔ اس زمانے میں پاکستان کے شمال مغربی علاقے جلال آباد سے لے کر سرہند (دریائے چناب) تک ہندو شاہیہ خاندان کی حکومت تھی، جس کا دارالحکومت وے ہند موجودہ اٹک کے قریب واقع تھا۔

۹۷۸ء میں سبکتگین نے کابل فتح کر کے ہندوستان کی سرحد پر حفاظتی انتظام شروع کیے، کیونکہ غزنی اور کابل کی سرحد لاہور اور ملتان سے ملی ہوئی تھی۔ اس وقت لاہور کا راجا جے پال بن ست پال تھا۔ وہ ملک گیری کی ہوس میں غزنی کی جدید سلطنت کو ایک لقمہ سمجھ کر عظیم الشان لشکر کے ساتھ لاہور سے پشاور اور وہاں سے جمرود کے راستے سیلاب کی طرح بڑھا اور غزنی کی سرحد پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت سبکتگین اپنے بیٹے محمود کی مدد کے لیے نیشاپور گیا ہوا تھا، جہاں ولیمیوں اور باغیوں نے محمود کو، جو ابھی لڑکا ہی تھا، تنہا پا کر چڑھائی کر دی تھی۔

سبکتگین طوس کے قریب مصروف پیکار تھا کہ اسے اچانک غزنہ پر جے پال کے حملے کا حال معلوم ہوا۔ سبکتگین طوس کے میدان میں فتح پا کر اپنے دارالسلطنت کو بچانے کے خیال سے فوراً واپس آیا۔ دونوں فریقین نبرد آزما ہوئے۔ جے پال کو شکست ہوئی۔ راجا جے پال نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قصور کی معافی چاہی اور وعدہ کیا کہ وہ پنجاب پہنچ کر بہت سا سونا چاندی بطور تاوانِ جنگ بھیجے گا۔

سبکتگین کا بیٹا محمود، جو اپنے باپ کے ہم رکاب تھا، صلح کے خلاف تھا۔ لیکن جب جے پال نے یہ پیغام بھیجا کہ ہم شکست کی صورت میں اپنے مال و دولت، نقد و جنس جلا کر خاک کر دیتے ہیں تو محمود بھی خاموش ہو گیا۔ صلح ان شرائط پر ہوئی کہ جے پال اپنے ملک میں واپس جا کر گھوڑے، ہاتھی، مال و جواہر، جن کی تعداد عہدنامے میں معین ہوئی تھی، امیر سبکتگین کے کارندوں کے ہاتھ غزنی بھیجے گا، جن کو وہ اپنے باپ کے ہمراہ پنجاب لے گیا تھا۔

لاہور پہنچ کر راجا جے پال اپنا وعدہ بھول گیا بلکہ امیر کے آدمیوں کو قید خانے میں ڈال دیا۔ سبکتگین کو پتا چلا تو اسے بڑا طیش آیا۔ اس نے جگہ جگہ سے فوجیں جمع کیں اور جے پال کے علاقے پر ہلہ بول دیا۔ امیر کو بہت سا مال و اسباب اور بے شمار لونڈی غلام ہاتھ آئے۔ لیکن جے پال بھی غافل نہ بیٹھا تھا۔ اس نے خط بھیج کر ہندوستان کے تمام راجوں، مہاراجوں سے مدد مانگی۔ جب پشاور کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو دہلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کی منتخب فوجیں راجا جے پال کے ہم رکاب تھیں۔

یہ پہلا موقع تھا جب شمالی ہندوستان کے تمام حکمرانوں نے متحد ہو کر مسلمان حملہ آوروں کو روکنا چاہا۔ ہندستانی فوج کی اس قدر کثرت تھی کہ سبکتگین کی فوج کے سردار بھی گھبرا گئے۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ جب مخالف فوج کا اندازہ کرنے کے لیے سبکتگین ایک پہاڑی پر چڑھا تو اس نے دیکھا کہ مقابل میں ایک دریا ہے، بے پایاں اور ایک لشکر ہے، مثل مور و ملخ کے فراواں۔ لیکن سبکتگین نے ہندوستانی فوجوں کے ہاتھ دیکھے ہوئے تھے، وہ ان کی کثرت سے مرعوب نہ ہوا۔ لیکن بھانپ گیا کہ خاص داؤ پیچ اور نئے

طریقے سے لشکر آرائی کی ضرورت ہے۔

چنانچہ ایک تو اس نے اپنے سرداروں کو بلا کر جہاد کی ترغیب دی اور بہادروں کے کارنامے سنا کر ان کے دل بڑھائے۔ دوسرے اپنے لشکر کو پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کیا، تاکہ جب ایک دستہ دشمن سے لڑتے لڑتے تھک جائے تو پانچ سو تازہ دم سپاہیوں کا دوسرا دستہ مقابلے میں ڈٹ جائے اور دشمن پر اپنی کمزوری عیاں نہ ہو۔ جب کچھ دیر اس طرح لڑائی جاری رہی اور دشمن کی صفیں ڈھیلی پڑ گئیں تو تمام دستوں نے یک بارگی پورے زور کا حملہ کیا اور اس انبوہ عظیم کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

راجا جے پال نے غزنی پر حملہ کر کے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اب یہ حالت ہو گئی کہ ”میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا“۔ سبکتگین نے جے پال کو شکستیں دے کر کابل اور پشاور کا سارا علاقہ چھین لیا۔ پشاور میں اپنا ایک نائب مقرر کرا اسے مقبوضات غزنی میں داخل کر لیا۔

جناب شیخ محمد اکرام امیر سبکتگین کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عام طور پر اوراق تاریخ میں سبکتگین کا نام اس جلی قلم سے نہیں لکھا جاتا جس سے اس کے فاتح اور بلند اقبال بیٹے محمود غزنوی کا نام روشن ہوتا ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ باپ کا مرتبہ بیٹے سے بہت کم نہیں اور ٹھوس نتائج میں تو شاید سبکتگین کو محمود پر فوقیت حاصل ہے۔

امیر سبکتگین کا سب سے بڑا کام تو یہ تھا کہ اس نے ہندوستان کی سرحد پر غزنی میں ایک ایسا اہم عسکری اور حکومتی مرکز قائم کیا، جس نے برصغیر پاک و ہند کی فتح کے لیے فوجی صدر کیمپ کا کام دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کابل سے لے کر پشاور تک کا علاقہ فتح کیا اور اپنے تدبر اور حسن انتظام سے وہاں کامیاب حکومت قائم کر کے اور راستوں اور قلعوں کی درستی سے آئندہ فتوحات کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان کے تمام راجاؤں کو شکست دے کر اسی عسکری نظام پر ضرب کاری لگائی جو شمالی حملہ آوروں کو روک سکتا ہے۔ سبکتگین کی فتوحات میں وہ ڈرامائی عنصر نہیں جو سلطان محمود غزنوی کے حملہ سومنات یا اس کے دوسرے کارناموں میں نظر کو خیرہ کر دیتا ہے، لیکن نتائج کے لحاظ سے وہ بھی کم وقعت نہیں۔“ (آب کوثر)

محمود کا لڑکپن

ابوالقاسم محمود امیر سبکتگین کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ یکم اور دو نومبر ۹۷۱ء کی درمیانی رات پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذہین و فطین، ہونہار اور بہادر تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت مشرقی سلاطین کے شہزادوں کی طرح کی گئی۔ اس کے لیے بڑے بڑے علما کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس نے بہت جلد علوم دین کی تکمیل کر لی۔ وہ حافظ قرآن تھا اور احادیث و فقہ میں مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ اس کی تربیت اور تعلیم کے سیاسی پہلو کی طرف خود سبکتگین نے توجہ کی۔

اس نے بیٹے کو بتایا کہ حکمرانی کے کامیاب طریقے کیا ہیں۔ اس نے طریق حکمرانی کو ایک مجموعے کی شکل میں یکجا کیا جس کا نام ”پند نامہ“ ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ محمود نے آغاز شباب میں غزنی میں ایک خوبصورت باغ لگوایا اور اس میں نہایت حسین اور عالیشان عمارت تعمیر کی۔ جب باغ اور عمارت کی تکمیل ہو گئی تو اس نے اپنے والد سبکتگین اور عمائدین کو مدعو کیا۔

والد نے باغ اور عمارت کو دیکھا تو بہت خوش ہوا، مگر سب کچھ دیکھ کر محمود سے کہا: ”بیٹے یہ باغ اور عمارت اگرچہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہے، لیکن اس طرح کا باغ اور عمارت ہر ایک امیر بنا سکتا ہے۔ بادشاہوں کی شان تو اس

www.urdugem.com

کی متقاضی ہے کہ ایسی عمارت کی طرح ڈالیں کہ دوسرے اس کا مثل نہ بن سکیں۔"

محمود نے ادب سے پوچھا: "وہ کون سی عمارت ہے جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں"۔

سبکتگین نے جواب دیا: "اس عمارت سے مراد اہل علم کے دل ہیں۔ اس گھر کی زمین میں اگر تم اپنے احسان اور محبت کی تخم ریزی کرو اور وہ بار آور ہو تو اس کے پھل البتہ اس قابل ہوں گے کہ ان کے چکھنے سے تمھیں دین و دنیا کی سعادت کا مزا مل جائے"۔

محمود کو سلطنت غزنی کے نظم و نسق میں جلد ہی عملی تجربہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ جب سبکتگین خراسان کے شہر بست کی مہم پر روانہ ہوا تو وہ محمود کو، جس کی عمر اس وقت بمشکل سات برس کی تھی، اپنی جگہ غزنی میں نائب مقرر کر گیا۔ چند سال بعد صوبہ زمین داور کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ اس کے علاوہ محمود کو جنگ کے طور طریقوں میں پوری تربیت دی گئی۔ شمشیر زنی میں وہ بڑا ماہر تھا۔ نشانہ بازی اور نیزہ چلانے میں اس کا کوئی ثانی تھا۔

محمود کی فتوحات

۹۹۸ء میں تخت نشینی سے پہلے ۹۷۷ء سے ۹۹۷ء تک اپنے والد کے عہد حکومت میں محمود غزنوی کالڑکپن باپ کے ساتھ معرکہ آرائیوں میں گزرا۔ پنجاب کے راجا جے پال کے حملے کی مدافعت کرنے میں محمود اپنے والد کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ ۹۹۱ء میں جب راجا جے پال نے شمالی ہند کے دوسرے راجوں مہاراجوں کے اتحاد سے غزنی پر دوسرا حملہ کیا تو اس معرکے میں بھی محمود پیش پیش تھا۔ ۹۸۶ء سے ۹۹۵ء تک سبکتگین نے محمود کو ساتھ لے کر بلخ اور خراسان میں بھی امیر نوح سامانی کی دعوت پر داد شجاعت دی، جس سے خوش ہو کر امیر نوح نے سبکتگین کو ناصر الدین اور محمود کو "سیف الدولہ" کے خطابات عطا کیے۔

تخت نشین ہونے کے فوراً بعد ۹۹۹ء میں محمود نے

محمود غزنوی کی سلطنت ایران سے بھارت تک پھیلی ہوئی تھی

خراسان فتح کیا، جس میں ہرات اور بلخ جیسے تاریخی علاقے شامل تھے۔ ۱۰۰۲ء میں سیستان، ۱۰۱۲ء میں غزشستان، ۱۹۱۷ء میں خوارزم محمود کے زیر اقتدار آ گئے۔ بخارا، سمرقند، رے، اصفہان اور ہمدان جیسے خطوں پر غزنوی حکومت قائم ہو گئی۔ ان فتوحات کے نتیجے میں عباسی خلیفہ بغداد القادر باللہ نے محمود غزنوی کو "یمین الدولہ" اور "امین الملک" کے خطابات عطا کیے۔

محمود اور ہندوستان

واضح ہو چکا تھا کہ اب عالم اسلام میں ایک بڑی قوت محمود غزنوی کی ہے، لیکن ہندوستانی راجاؤں نے اس قوت کی اہمیت کو سمجھنے میں غلطی کی اور اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لیے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔ بار بار شکست کھانے کے بعد بھی یلغار اور حملہ آوری سے باز نہیں آئے۔

جب کبھی انھوں نے محمود کو اپنی سلطنت کے کسی خاص علاقے کے مسائل میں الجھا دیکھا، اس کے خلاف عہد شکنی اور بغاوت کر دی۔ یہاں تک کہ ہندوستان محمود کے لیے مستقل دردسر اور اس کی ابھرتی سلطنت کے لیے، جو ایران و ترکستان و خراسان میں پھیل رہی تھی، ایک خطرہ بن گیا۔

ہندوستان کا اندرونی انتشار بھی محمود کو دعوت فکر دے رہا تھا۔ اپنے پڑوس میں بڑھتی شورش اور طوائف الملوکی اسے ہندوستان کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ ایک پُرخطر سیاسی صورت حال اسے فوجی اقدام پر مجبور کرتی۔ یا در ہے، زمانہ وسطیٰ میں باہمی اختلاف و نزاع دور کرنے کے لیے بین الاقوامی گفت و شنید کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ دوسرے ہندوستانی حکمران سفارتی آداب سے کم واقف تھے۔ لہٰذا محمود کے لیے لشکر کشی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا۔

www.urdugem.com

لشکر کشی کے بعد بھی اس نے ہندوستانی سرکشوں کی سرکوبی پر اکتفا کیا۔ اکثر و بیشتر راجاؤں کو اپنے تخت پر برقرار رہنے دیا اور برصغیر میں کوئی مستقل حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس حقیقی تناظر کو پیش نظر رکھا جائے تو ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملوں کے محرکات و مقاصد بآسانی سمجھ میں آجائیں گے اور اس کے تصور جہاد کی مصلحتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔ اس کے سترہ حملوں کی کیفیت مختصراً درج ہے۔

پہلا حملہ۔ ۱۰۰۰ء

محمود غزنوی کے تخت نشین ہوتے ہی ہندوستان کے مہم جو طالع آزماؤں، بالخصوص پنجاب کے ہندو شاہی حکمران، جے پال نے سلطنت کی سرحدوں پر شورش برپا کر دی، لہٰذا محمود نے آگے بڑھ کر ان کی سرزنش کی۔ اپنے سرحدی انتظامات درست کیے اور واپس غزنی چلا گیا۔ بعض مورخین اسی دفاعی معرکے کو محمود کی پہلی پیش قدمی یا پہلا حملہ قرار دیتے ہیں۔

دوسرا حملہ۔ ۱۰۰۱ء

دوسرا معرکہ ایک سال بعد پیش آیا، جب راجا جے پال نے جارحانہ اقدام کر کے اپنی عادت اور معمول کے مطابق ایک بار پھر افغانستان پر ایک زبردست لشکر کے ساتھ یلغار کی۔ محمود نے پشاور کے قریب اس لشکر جرار کی پیش قدمی روک دی۔ راجا کی فوج میں کم از کم بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیدل فوج اور تین سو ہاتھی تھے۔ بعض مورخین نے اس فوج کی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ سے زیادہ لگایا ہے، جس میں جے پال کی زیر قیادت ہندوستان کے متعدد راجاؤں کا متحدہ لشکر لڑنے آیا تھا۔

محمود غزنوی نے پندرہ ہزار جانبازوں کو اس تدبیر اور جرأت کے ساتھ لڑوایا کہ چند گھنٹوں کے اندر نہ صرف یہ کہ

عہد اسلامی کا پہلا مزار

سندھ (بلکہ ہندو پاکستان) میں عہد اسلامی کی سب سے قدیم زیارت گاہ شیخ ابوتراب کا مزار ہے۔ شیخ ایک بزرگ تبع تابعی تھے اور عباسی خلفاء کے عہد حکومت میں ضلع ساکورہ (سکھر؟) اور اس کے علاقے کے مضبوط قلعہ تھرہ، شہر بکھر اور مغربی سندھ کے بعض مواضعات پر حاکم تھے۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے اور اس کے گنبد پر تاریخ بنیاد ۱۷۱ھ/ ۷۸۸ء درج ہے۔ مولوی ابوظفر ندوی اپنی تاریخ سندھ میں رائے دیتے ہیں کہ شیخ ابوتراب غالباً والئی سندھ کی طرف سے قلعہ دار (کمشنر) ہوں گے۔

سندھ گزیٹر میں لکھا ہے کہ شیخ ابوتراب نے بکھر کا قلعہ فتح کیا اور بہادری کے دوسرے کارہائے نمایاں دکھائے۔ آپ کا مزار ٹھٹہ سے دس میل کے فاصلے پر تحصیل میرپور ساکرو میں موضع گوجو کے قریب ہے۔ آپ کے مزار پر ہر مہینے چھوٹا سا میلہ لگتا ہے۔ عوام الناس نے آپ کو ایک باکرامت پیر بنا دیا ہے۔ مقامی روایت ہے کہ اس علاقے میں تھارنہ نام کا ایک ہندو راجا تھا۔ شیخ نے اپنی کرامت سے اسے اور اس کی فوج کو ایک پہاڑی کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ یہ پہاڑی بھی زائرین کو دکھائی جاتی ہے۔

ہندوستانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے بلکہ ہزاروں قیدیوں کے ساتھ خود راجا جے پال بھی اپنے شہزادوں اور سرداروں سمیت محمود کی قید میں آ گیا۔ اتنی عظیم الشان فتح کے بعد بھی محمود نے خراج وغیرہ کی معمولی شرائط پر معاہدہ صلح کر کے جنگی قیدیوں کو

عربوں اور اہل سندھ کا تعلق

جب سندھ عرب حکومت کا ایک ماتحت صوبہ بنا تو عربوں اور اہل ہند، بالخصوص اہل سندھ کے درمیان گہرے تعلقات کا دروازہ کھل گیا۔ جب عباسیوں نے دمشق کی جگہ بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا تو "ہندوسندھ" سے عربوں کا علمی، مذہبی، تمدنی اور سیاسی مرکز اور بھی قریب ہو گیا۔ اس قرب سے خلفائے بغداد نے بہت فائدہ اٹھایا اور ہندوستانیوں کی علمی ترقی سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر رکھا۔

عرب اس وقت دنیا کی ساری اقوام سے سربلند تھے، چین کی سرحد سے اسپین کے ساحل تک ان کا پرچم لہرا رہا تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ دنیاوی برتری اور تفوق حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس اصول پر عمل ہو: "جو اچھی چیز جہاں بھی نظر آئے، اسے حاصل کر لو اور علمی ترقیاں جہاں بھی ہوں، ان سے خبردار رہا جائے۔" بے شک اہل ہندوستان ان کے محکوم تھے، لیکن انھوں نے اپنے محکوموں اور ماتحتوں سے سبق سیکھنے سے گریز نہ کیا اور ہندوستان کی متعدد علمی و فنی و سائنسی کتب کو عربی میں منتقل کر کے ان کے مطالب اخذ کیے۔

ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہوا "سدھانت" تھی۔ اس کا مصنف "آریہ بھٹ (پیدائش ۴۷۶ء) تھا۔ وہ قدیم ہندوستان کا ماہر فلکیات، منجم اور ریاضی داں تھا۔ اس کی یہ کتاب فلکیات اور نجوم سے تعلق رکھتی تھی۔

رہا کر دیا۔ یہ سلطنت غزنی کے ساتھ جے پال کی آخری جنگ تھی۔ جے پال کو اپنی اس آخری شکست سے اس قدر ندامت محسوس ہوئی کہ اس نے خود ہی چتا تیار کر کے اپنے آپ کو آگ میں پھونک لیا۔ اس کی خودکشی کے بعد ہندو شاہی راج کی گدی اس کے بیٹے آنند پال نے سنبھالی۔ محمود نے ہند کے علاقے کو تاراج کر کے ۱۰۰۲ء میں غزنی واپس چلا گیا۔

تیسرا حملہ۔ ۱۰۰۳ء

ملتان کی سرحد سے متصل ایک ہندو ریاست بھاطیہ یا بھاٹیہ تھی (موجودہ بھٹنڈہ)۔ اس ریاست کا راجا بجے رائے تھا۔ یہ راجا اپنے آپ کو خودمختار سمجھتا تھا۔ اس نے غزنی پر جے پال کی چڑھائیوں میں اس کی فوجی مدد کی تھی۔ اس زمانے میں بجے رائے نشہ اقتدار میں مست ہو کر کسی معاملے میں غزنہ کے سرحدی حاکموں سے بدتمیزی سے پیش آیا۔ محمود غزنوی کو جب اس کا علم ہوا تو وہ ایک لشکر جرار لے کر ملتان سے گزرتا ہوا بھاٹیہ پہنچا۔ بجے رائے نے تین روز تک سخت مقابلے کے بعد فتح کے آثار نہ پا کر خودکشی کر لی۔ محمود یہ ریاست فتح کر کے غزنی واپس چلا گیا۔

چوتھا حملہ ۱۰۰۵ء

اس وقت ملتان کا حاکم شیخ حمید کا پوتا ابوالفتح داؤد تھا۔ اس کا تعلق قرامطہ سے تھا جو اسماعیلیوں کی ایک شاخ تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت قرامطیوں کو ملحد سمجھتی تھی اور خلیفہ بغداد تو اس کے سخت خلاف تھا۔ شیخ داؤد نے سبکتگین کے خلاف راجا جے پال اور دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ معاہدے کیے ہوئے تھے، لیکن راجوں کی شکست کے بعد سبکتگین نے صلح کا معاہدہ کر لیا تھا۔

www.urdugem.com

اس معاہدے کی بنا پر جب محمود گزشتہ برس بھاٹیہ کے راجا بجے رائے سے لڑ رہا تھا، قدرتاً اُسے خیال تھا کہ ایک حلیف ہونے کی حیثیت میں شیخ ابوالفتح داؤد اس کا ساتھ دے گا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ سلطان کا ساتھ دیتا اور اپنی فوجیں اس کی امداد کے لیے بھیجتا، ابوالفتح نے بعض ایسی غیر وفادارانہ حرکتیں کیں جن کا محمود پر بے حد منفی اثر پڑا۔ اس وقت تو محمود نے ابوالفتح سے کوئی باز پرس نہ کی، لیکن غزنہ واپس آنے کے بعد اس نے ملتان پر حملے کی تیاری شروع کروادی۔

۱۰۰۵ء میں وہ درہ بولان کے قریبی راستے کو چھوڑ کر درہ خیبر سے اس لیے روانہ ہوا تاکہ ابوالفتح کو اس کا علم نہ ہو کہ وہ ملتان پر حملہ کرنے آرہا ہے۔ لاہور کا راجا اس وقت جے پال کا بیٹا آنند پال تھا۔ محمود نے اسے اطلاع دی کہ ہم تمہارے علاقے سے سفر کرتے ہوئے گزریں گے۔ ہمارا مقصود ملتان پر حملہ کرنا ہے۔ ہم صرف تم سے راستہ چاہتے ہیں، تاکہ ہم آسانی کے ساتھ ملتان چلے جائیں، لیکن آنند پال اس کے لیے تیار نہ ہوا اور جنگ کے لیے آمادہ ہوگیا، حالانکہ آنند پال بھی ملتان کے حاکم ابوالفتح داؤد کی طرح سلطان محمود کا باج گزار تھا۔

آنند پال کے اس انکار کی وجہ مورخین نے لکھی ہے کہ سلطان کے حملے کی خبر حاکم ملتان کو بھی مل چکی تھی۔ وہ اس خبر کو سن کر بہت گھبرایا اور اس نے آنند پال سے، جس سے اس کا معاہدہ بھی تھا، مدد چاہی۔ راجا آنند پال نے کچھ تو ہمسائیگی اور کچھ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر حاکم ملتان کی مدد ضروری سمجھی۔ وہ فوج لے کر محمود کا راستہ روکنے پشاور تک پہنچا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور آنند پال شکست کھا کر نکل بھاگا۔ غزنوی لشکر نے اس کا تعاقب دریائے چناب تک کیا۔ راجا نے جب یہ دیکھا کہ اب اس کے لیے کوئی چارہ نہیں تو وہ بھاگ کر کشمیر کے دروں میں داخل ہوگیا۔

سلطان محمود وہاں سے سیدھا ملتان پہنچا۔ شیخ ابوالفتح کو آنند پال کے انجام سے اپنے متعلق بھی بہت کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ فوراً سلطان کی آمد کی خبر سن کر قلعہ بند ہوگیا۔ محمود نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ سات روز تک جاری رہا۔ آخر محمود کی خدمت میں ابوالفتح نے عاجزانہ صلح کی درخواست کی اور معاہدہ کیا کہ وہ دو لاکھ درہم سالانہ بطور خراج غزنی روانہ کرتا رہے گا۔ غالباً اسی معاہدے میں یہ بھی طے پایا تھا کہ ملتان کا ایک حصہ جو دریائے سندھ سے متصل تھا، وہ سلطان کو دے دیا جائے گا۔

پانچواں حملہ۔ ۱۰۰۶ء

محمود ابھی ملتان کے معاملات سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ خبر آئی کہ کاشغر کے حاکم ایلک خان نے اس کی وسط ایشیائی سلطنت پر حملہ کردیا ہے۔ موقع بہت نازک تھا کہ محمود کاشغر اور غزنی کی سرحد سے بہت دور تھا۔ محمود نے ملتان نواساشاہ کے سپرد کردیا۔ نواساشاہ جے پال کا نواسا تھا۔ اس کا اصلی نام سکھ پال تھا۔ قبول اسلام کے بعد وہ نواساشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ آنند پال نے بھی اس موقع پر محمود کو فوجی امداد کی پیشکش کی۔

محمود بڑی سرعت کے ساتھ بلخ پہنچا اور ایلک خان کو شکست دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ہندوستان سے خبر پہنچی کہ نواساشاہ نے پھر سے اپنا آبائی مذہب اختیار کر بھٹنڈہ سے محمود کے افسروں کو نکال کر علم بغاوت بلند کیا ہے۔ محمود آرام کیے بغیر اس تیسری مہم پر روانہ ہوگیا۔ موسم سخت سرد تھا، لیکن محمود نے ذرا پروا نہ کی اور ہندوستان کی سرزمین پر پانچویں مرتبہ چڑھائی کردی۔ نواساشاہ کو قید کر کے اپنے ہمراہ غزنی لایا۔ وہاں وہ کچھ دن بعد اپنی طبعی موت مر گیا۔

(جاری ہے)

اسپیشلسٹ زندہ باد!

مریض کے خرچ پر باہمی خیر سگالی کا مظاہرہ کرنے والے ماہرینِ طب کی دلچسپ کتھا

مزاح

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

آج زندگی کے ہر شعبے میں تخصیص (اسپیشلائزیشن) کا دور دورہ ہے اور اس کی سب سے نمایاں عکاسی طبی شعبے میں ہوتی ہے۔ جسم کی ایک ایک ہڈی، ایک ایک پٹھے اور ایک ایک ریشے کا الگ اسپیشلسٹ موجود ہے اور یہ سب حضرات اپنی خدمات کی انجام دہی میں حیرت انگیز تعاون کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کوئی بھی اپنی معینہ حدود کو نہیں پھلانگتا بلکہ ایک دوسرے کے پاس کیس بھیج کر یہ سب (مریض کے حق میں) باہمی خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

کسی شخص کو آنکھ کا آپریشن کروانا ہو تو آنکھوں والا ڈاکٹر (ویسے تو مریض بھی آنکھوں والا ہی ہوتا ہے) اسے پہلے دانت والے ڈاکٹر کے پاس بھیجتا ہے (کہ آخر اسے بھی کردار ادا کرنا ہے)۔ اگر آپریشن کے بعد وہ شخص صحت یاب نہ ہو یا سرجن کو مرض کا سراغ نہ ملے تو وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مریض کو کسی اور ماہر کے پاس بھیج دیتا ہے۔ وہاں سے مریض کہیں اور جاتا ہے۔

اس طرح ماہرین کے "شفاخانوں" پر حاضری لگاتا رہتا ہے لیکن کہیں سے شفا نہیں ملتی یہاں تک کہ ایک خدا ترس ماہر اس کو ماہر نفسیات کے پاس بھیج دیتا ہے (کہ اس کا گزارا ہی ایسے کیسوں پر ہے۔) اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور مریض اقتصادی مصائب کا شکار ہو کر جسمانی عوارض کو بھول بیٹھتا ہے۔ یوں اس کی "مکمل صحت یابی" کا کریڈٹ بھی اس کے معالجین کو پہنچ جاتا ہے۔

اسپیشلائزین کا عمل تقسیم محنت کے معاشی اصول پر مبنی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مختلف اعضائے جسمانی کے امراض کے بارے میں خصوصی علم، تجربہ اور مہارت کا حصول ممکن ہوجاتا ہے۔ بظاہر اس طریقہ کار میں کوئی خرابی نہیں البتہ اس کا عملی اطلاق بسا اوقات مرض کے بجائے مریض کو ختم کردیتا ہے۔

ایک صاحب کسی بیماری کے خصوصی معالج کے کلینک پر پہنچے اور استقبالیہ کلرک سے ڈاکٹر صاحب کی فیس دریافت کی۔ اس نے بتایا "پہلے پھیرے کی ۵۰۰ روپے، دوسرے کی ۳۰۰ روپے اور اس کے بعد ۲۵۰ روپے فی پھیرا۔"

یہ صاحب پہلی بار آئے تھے لیکن ذرا ہوشیار بننے کی کوشش کی۔ جیب سے دو پچاس روپے نکال کر کلرک کے حوالے کیے اور کہا "یہ رقم پیشگی رکھ لیجیے۔ اس بیماری کے سلسلے میں یہ میرا تیسرا پھیرا ہے۔ کیا میں ڈاکٹر صاحب سے مل سکتا ہوں۔"

"نہیں" وفادار اور ذہین کلرک نے رقم دراز میں رکھتے ہوئے کہا "بس وہی دوائی جاری رکھیے جو ڈاکٹر صاحب نے

www.urdugem.com

پہلے تجویز کی تھی۔"

جب کوئی مریض کسی سرجن کی چھری کے نیچے آتا ہے تو بات معائنہ فیس سے شروع ہو کر آپریشن فیس پر بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ وارڈ بوائے، نرسیں اور خاکروب تک اس سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ ایک بار ہم اپنے بارہ سالہ بیٹے کو (جس کی ناک میں تکلیف تھی) شہر کے ایک نامی گرامی ای این ٹی اسپیشلسٹ کے پاس لے کر گئے۔

موصوف نے سرسری طور پر حال سن کر ٹارچ سنبھالی اور بچے کے کان کا معائنہ شروع کر دیا۔ ہم نے انھیں یاد دلایا کہ حضور، بچے کی ناک کا مسئلہ ہے۔ ہمیں اشارے سے خاموش کرتے ہوئے بولے "دیکھیے کچھ نظر آیا؟"

ہمیں نظر تو کچھ نہ آیا داغ کا شعر یاد آ گیا

نہ ہمت، نہ قسمت، نہ دل ہے، نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا، نہ پایا، نہ سمجھا، نہ دیکھا

پھر ڈاکٹر صاحب نے بچے کا منہ کھلوایا اور ہمیں معائنے کی دعوت دی۔ ہم نے ایک بار پھر ان کی توجہ ناک کی طرف مبذول کرائی۔ بالآخر انھوں نے ایک نگاہ غلط انداز ناک پر ڈال کر ارشاد فرمایا "ہم کان سے آپریشن شروع کریں گے۔"

"کیا مطلب؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "کیا آپریشنوں کا کوئی سیریل چلے گا؟"

بولے "ہاں، یہ ایک ہی ٹریک ہے اس لیے تین آپریشن ضروری ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا رائٹنگ پیڈ نکالا۔ ہم سمجھے کہ نسخہ لکھیں گے لیکن انھوں نے اپنی پوری مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے تیزی سے لکھا "کان ۴۵۰۰ روپے، حلق ۳۰۰۰ روپے، ناک ۳۵۰۰ روپے۔"

اس کے ساتھ ہی انھوں نے کمرے کا کرایہ/نرسنگ وغیرہ کے اخراجات شامل کر کے تقریباً ۲۵۰۰۰ روپے کا "نسخہ" بنا دیا اور ہمیں مشورہ دیا کہ باہر جا کر داخلے کی پرچی بنوا لیں۔ (ان کا اپنا اسپتال بھی اسی عمارت میں واقع ہے۔)

یہ تمام کارروائی بمشکل ڈھائی منٹ میں انجام پا گئی۔ ان کے طرزِ عمل نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید ہم غلطی سے ڈاکٹر کے بجائے اکاؤنٹنٹ سے مشورہ کرنے پہنچ گئے ہیں۔ فیس تو ہم سے پہلے ہی لی جا چکی تھی، بس ہم ان کی جے جے کرتے ہوئے واپس ہو لیے۔

بعد ازاں اسی بچے کو ہم نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو دکھایا جو اہلیت میں پہلے والے ڈاکٹر صاحب کے برابر تھے لیکن دونوں کی ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انھوں نے بچے کی ناک کا معائنہ کر کے بتایا کہ اندرونی ہڈی واقعی ٹیڑھی ہے لیکن ۱۷ سال کی عمر تک اس کی نشوونما تیزی سے ہوتی ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ اس عمل میں ٹیڑھی ہڈی سیدھی ہو جائے لہٰذا فی الحال آپریشن قرین مصلحت نہیں۔

ہماری فلموں کا ڈاکٹر آل راؤنڈر ہونے کی بہترین مثال ہے۔ وہ آنکھ کا آپریشن کرتا ہے اور دمے کا علاج بھی۔ جب کبھی کلینک کے رش سے گھبرا کر وہ ہیروئن کے درد دل کا علاج کرنے کے لیے کھیتوں میں جا نکلتا ہے اور ولن اس کے رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے تو وہ کچھ جسمانی روحانی طاقت کو بروئے کار لا کر اس کی کئی ہڈیاں فریکچر کر دیتا ہے۔ لیکن پھر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر پلستر چڑھاتا ہے۔ گاؤں والوں پر اپنی شرافت کا سکہ جمانے کے لیے ہفتے میں ایک دن وہ بچوں کا علاج بھی کرتا ہے۔ ایسے ہی ڈاکٹر ہمارے طبی مسائل حل کر سکتے ہیں۔

ہم اسپیشلائزیشن کے یکسر خلاف نہیں بلکہ نوجوان خواتین کو مشورہ دیتے ہیں کہ دل کی خصوصی معالج بن کر زخمی دلوں کی مرمت کریں نہ کہ خود کو بنا سنوار کر صحت مند دلوں کو زخمی کرتی پھریں۔ ◆◆◆

ہنستی مسکراتی ایک اور تحریر پیشِ خدمت ہے
"ہائے سویرا ہو گیا"
صفحہ نمبر ۱۴۱ پر

ہاجرہ رضا

سات ڈگریاں رکھنے والا ۹۳ سالہ صدر

زمبابوے کے سابق حکمران کا پُرلطف قصہ جن کی طویل زندگی میں کئی سبق بھی پوشیدہ ہیں

غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے کوڑا کرکٹ اٹھا کر گلی کوچے صاف رکھنے والے بچوں بڑوں کو دیکھ کر برّاعظم افریقا کے بھوک سے مرتے بچے ذہن میں آ جاتے ہیں۔ ان کی تصویریں اکثر سوشل میڈیا پر نظر آتی ہیں۔ ہم ان تصاویر کو شیئر کر کے اپنی ذمے داری پوری کرتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے افریقا کے لوگوں کی مدد میں اہم کردار ادا کر دیا۔

کچھ عرصہ قبل افریقا بھوک سے مرتے بچوں نہیں بلکہ اہم ملک زمبابوے کی وجہ سے شہ سرخیوں میں رہا۔ وہاں ۳۷ سال سے اقتدار کی کرسی پر بیٹھے رہنے کے بعد ۹۳ سال کی عمر میں رابرٹ موگابے نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

یہ استعفیٰ اس وقت دیا گیا جب ملک میں کرپٹ عناصر کے خلاف کارروائی کے نعرے کے ساتھ زمبابوے کی فوج نے بغاوت کرتے ہوئے اہم تنصیبات پر قبضہ کر لیا۔ اس فوجی بغاوت سے قبل موگابے نے نائب وزیراعظم ایمرسن منگاگوا کو برطرف کر دیا تھا۔ ایمرسن نے موگابے کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ فوج، عوام، مغربی ممالک اور یہاں تک کہ خود موگابے کی پارٹی نے ایمرسن کا ساتھ دیا۔ فوج نے موگابے کو گھر میں نظربند کر ڈالا۔ تب موگابے کی اپنی جماعت نے ان سے پارٹی کی سربراہی چھوڑنے اور صدارت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر دیا۔

زمبابوے کے عوام بھی اپنے صدر کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ ملک میں بڑھتی افراطِ زر اور بے روزگاری کی شرح میں اضافے نے نوجوانوں کو موگابے کے خلاف اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۸۰ میں زمبابوے کو برطانوی تسلط سے نجات دلانے والا سیاہ فاموں کا ہر دل عزیز حریت پسند راہنما موگابے آخر کیوں ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا کہ عوام اس کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ موگابے کا کہنا ہے کہ یہ سفید فاموں کی ان کے خلاف سازش ہے۔

اگر ہم موگابے کی زندگی پر نظر کریں تو بہت سی چیزیں قابلِ ستائش دکھائی دیتی ہیں۔ وہ دنیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ

www.urdugem.com

صدر ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ موگابے سات ڈگریاں رکھنے والے دنیا کی تاریخ میں پہلے اور اب تک کے مطابق آخری صدر ہیں۔ ان سات اسناد میں سے دو انھوں نے قید کے دوران حاصل کیں۔

موگابے کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود ۹۳ سال کی عمر تک پہنچ گئے اور اس عمر میں بھی وہ چند ماہ قبل تک صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس مہلک مرض میں مبتلا افراد اپنی زندگی سے ہی مایوس ہو جاتے ہیں۔ ان کی صحت مند زندگی کی وجہ خالص خوراک، صبح سویرے بیدار ہونا اور باقاعدگی سے ورزش کرنا ہے، لیکن وہ ورزش کے لیے کوئی مشین استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی جم جاتے ہیں۔ موگابے کا کہنا ہے کہ اگر میں ورزش نہ کروں تو بیمار ہو جاؤں۔ جم نہ جانے کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ ''قید میں کوئی ساز و سامان نہیں ہوتا، صرف انسان کا اپنا آپ ہوتا ہے۔ آج بھی میں اسی طرح ورزش کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح میں جیل میں کیا کرتا تھا۔''

ورزش کے ساتھ ساتھ موگابے کھیلوں میں بھی خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ کرکٹ کے بہت شوقین ہیں جس کا اندازہ یوں لگائیے کہ ان کی اقامت گاہ ہرارے اسپورٹس کلب کے ساتھ ہے جہاں سے وہ کرکٹ دیکھ سکتے ہیں۔ موگابے کا کہنا ہے ''کرکٹ انسان کو مہذب اور شریف بناتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زمبابوے میں ہر کوئی کرکٹ کھیلے۔ کرکٹ کے ساتھ ساتھ ٹینس اور فٹ بال بھی وہ بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے حیران کن واقعات میں سے ۷۳ سال میں ان کے تیسرے بچے کی پیدائش ہے۔

موگابے خوش لباس ہیں۔ انھیں انگریزی لباس پہنا پسند ہے، لیکن ان کو برطانیہ میں خوش آمدید نہیں کہا جاتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ موگابے زمبابوے کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کروانے والے لیڈر ہیں۔

رابرٹ موگابے کی سیاسی جدوجہد پر نظر ڈالنے سے پہلے زمبابوے کی تاریخ جاننا ضروری ہے۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور افریقا کے ملک روڈیشیا (زمبابوے کا پرانا نام) میں برطانیہ کی تجارتی کمپنی ''سیل روڈس'' کی آمد میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں کمپنیوں نے سازشوں سے ہی ہندوستان اور روڈیشیا پر قبضہ جمایا۔ ۱۹۲۳ تک اس خطے پر مکمل طور پر برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔ سیاہ فام اکثریت کے ملک پر سفید فام اقلیت حکومت کرنے لگی۔

۱۹۶۵ میں زمبابوے کے سفید فام وزیر اعظم ''آئی این اسمتھ'' نے آزادی کا اعلان کر دیا لیکن برطانیہ نے اس اعلان کو تسلیم نہیں کیا۔ یہاں کی سیاہ فام اکثریت کسی بھی حال میں سفید فام کی حکومت سے آزادی چاہتی تھی۔ اس لیے ملک میں حکومت کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کے دوران ملک پر بہت سی اقتصادی پابندیاں عائد کی

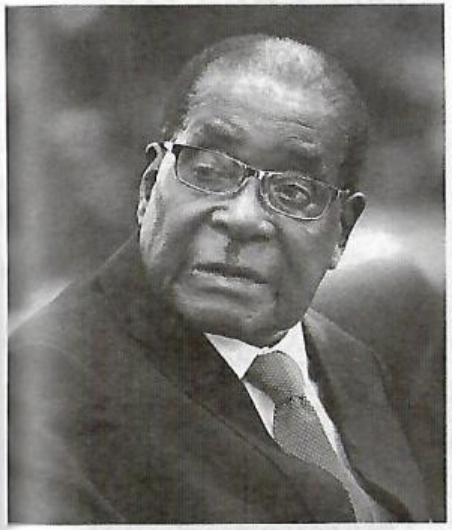

گئیں۔ یہ دور روڈیشیا کی تاریخ کا مشکل ترین دور تھا۔ اس دور میں رابرٹ موگابے حریت پسند راہنما کے طور پر ابھرے۔

رابرٹ موگابے فروری ۱۹۲۴ میں کیٹوما (katuma) میں پیدا ہوئے۔ ان کا والد ایک بڑھئی تھا۔ موگابے نے ۱۹۴۵ میں گریجویشن کی۔ بعد ازاں آں پندرہ سال تک روڈیشیا اور گھانا میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۰ میں ایک سیاسی جماعت، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (National Democratic Party) سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۶۱ میں اس جماعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ چنانچہ این ڈی پی میں اصلاحات لائی گئیں۔ وہ پھر نئے نام 'زمبابوے افریقن پیپلز یونین' کے نام سے منظر عام پر آئی۔

۱۹۶۴ء میں حکومت نے ایک بار پھر جماعت پر پابندی لگا دی۔ موگابے کو قید کر لیا گیا۔ اپنی دس سالہ قید کے دوران (۱۹۶۴ تا ۱۹۷۴) موگابے نے اپنے ساتھی قیدیوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دی۔ اسی دوران دو ڈگریاں بھی حاصل کر لیں۔ موگابے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ملکہ برطانیہ کی زبان اتنی اچھی بول سکتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس انداز سے انگریزی نہیں بول سکتا۔

موگابے جس قدر تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں، اس کا اندازہ زمبابوے کی شرح خواندگی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کاش ہمارے ملک کے حکمران بھی تعلیم پر کچھ توجہ دیتے۔ زمبابوے کا شمار دنیا کے تعلیم یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ جس کی شرح خواندگی ۸۹ فیصد ہے۔ ان کی زندگی کا دردناک واقعہ قید کے دوران بیٹے کی موت ہے۔ روڈیشیا حکومت نے انھیں بیٹے کے جنازے میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔

مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۹۸۰ میں رابرٹ موگابے اپنے ملک کو سفید فام کی حکومت سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ موگابے برصغیر کے عوام کی جدوجہد آزادی سے بھی متاثر ہوئے تھے۔

زمبابوے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ یہاں سونے اور پلاٹینم کے ذخائر وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار کے اعتبار سے بھی اہم ملک ہے۔ ماضی قریب میں زمبابوے زرعی اجناس برآمد کرنے والا ملک تھا، لیکن آج صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی۔ جس کا ذمے دار ناقدین موگابے کی اقربا پروری کو ٹھہراتے ہیں۔

ان کے دور حکومت میں زرعی اراضی من پسند لوگوں میں تقسیم کی گئی۔ معدنیات کے شعبے کو حکومتی تحویل میں دے دیا گیا۔ نتیجے میں زرعی اجناس برآمد کرنے والے ملک کے عوام دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ ملک اقتصادی بحران کا شکار ہو گیا۔ اس بحران کی ایک وجہ مغربی دنیا سے آنے والی امداد کا بند ہو جانا بھی ہے۔ کیا واقعی موگابے کے خلاف سفید فاموں نے سازش کی؟ یا پھر زمبابوے موگابے کی غلط پالیسیوں کے باعث زوال پزیر ہوا؟ جو کچھ بھی ہو، موگابے کی زندگی سے ہمیں قابل عمل سبق ضرور مل جاتے ہیں۔

وہ ایک حیرت انگیز شخصیت ہیں۔ تاریخ کے اہم کردار کے طور پر وہ ضرور یاد رکھے جائیں گے۔

موگابے سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے کوئی سیاسی جانشین نہیں بنایا۔ ان کی خواہش اپنی اہلیہ گریس کو پارٹی کی صدارت سونپنا تھا، لیکن ان کی اہلیہ کی کرپشن کے باعث حکمران جماعت نے اس فیصلے کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ اہلیہ کو صدر بنانے کی خواہش موگابے کو لے ڈوبی اور ان کے اقتدار کا بوریا بستر بھی گول ہو گیا۔ اب ان کے نائب وزیر اعظم، ایمرسن ہی صدر بن چکے۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

محمد فاروق عزمی

میری پہلی محبت!

کتاب کے ایک عاشق صادق کی سنہری یادیں

کل ایک دوست کے ہاتھ میں شفیق الرحمٰن مرحوم کی کتاب ''کرنیں'' دیکھ کر کئی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ کسی اچھی کتاب کو برسوں بعد دوبارہ پڑھنا ایک خوبصورت اور دلچسپ تجربہ ہے۔ جیسے کسی بچھڑے ہوئے پرانے دوست سے اچانک ملاقات ہوجائے۔ یہی کیفیت ''کرنیں'' دوبارہ پڑھ کر ہماری بھی ہوئی۔

جب میڈیا اتنا عام اور کمپیوٹر ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا اور زندگی اتنی تیز رفتار نہ تھی تو تنہائی اور فرصت کے لمحوں میں بہترین ساتھی اور رفیق کتاب ہی ہوا کرتی۔ کتاب کو ہم نے بچپن میں ہی دوست بنالیا تھا۔ ہمارے اس شوق کی سلگتی آگ کو ہمارے دوست ''بوٹے'' نے ابنِ صفی کے ناول پڑھا کر اور بھڑکا دیا۔ ابن صفی جن کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ پاکستان میں جاسوسی ادب لکھنے والے اردو کے پہلے مصنف تھے۔ انھوں نے ''عمران سیریز'' اور ''جاسوسی دنیا'' کے عنوان سے دو (۲) سلسلے شروع کیے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار عمران، ایکس ٹو، سر رحمان، کیپٹن حمید، کرنل فریدی، جولیا اور صفدر وغیرہ آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ بعد میں آنے والے بہت سے لوگوں نے انہی کرداروں پر اور اسی طرز پر بے شمار جاسوسی ادب تخلیق کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ابن صفی کے ان چھوٹے چھوٹے ناولوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ نئی کتاب کا انتظار کیا کرتے تھے۔

لاہور کے تقریباً ہر علاقے میں ایک آدھ ایسی لائبریری ہوتی، جہاں سے کتابیں یومیہ کرایے پر مل جاتی تھیں۔ مطالعے کے شوقین حضرات جو کتابیں خرید کر پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے، وہ کتاب کرایے پر لے کر پڑھتے۔ ہمیں گھر کے لیے سودا سلف اور سبزی وغیرہ لانا بہت پسند تھا کیونکہ اس ''خدمت'' کی ادائی میں ہمیں سائیکل بھی چلانے کو مل جاتی تھی اور دو چار آنے بھی ادھر اُدھر کرنے کا موقع مل جاتا۔ اس سے ہم فوراً کسی لائبریری سے اپنی پسند کی کوئی کتاب نکلواتے، اس کا یومیہ کرایہ ادا کرتے اور پھر گھر کے کسی کونے میں دُبک کر ''کتابی کیڑا'' بن جاتے۔

ایک دن ہمارے دوست ''بوٹے'' نے ہمیں نسیم حجازی صاحب کی کتاب ''داستانِ مجاہد'' تھمادی۔ یہ ایک الگ دنیا تھی، اس دنیا میں اور طرح کے لوگ بستے تھے۔ جن کا انداز گفتگو اور طرزِ زندگی بہت خوبصورت اور جداگانہ تھا۔ اگر ہم نسیم حجازی کو نہ پڑھتے تو ہمیں اپنے ماضی اور شاندار اسلامی

روایات کا قطعی کوئی علم نہ ہوتا۔ ہم کبھی اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہی حاصل نہ کر پاتے۔

اس زمانے میں ہمیں اسکول کا جیب خرچ چار آٹھ آنے سے زیادہ نہیں ملتا تھا۔ اُسے ہم بچا بچا کر رکھتے اور خواہش کے باوجود تفریح کے وقت خرچ نہ کرتے کیونکہ اب ہمیں نسیم حجازی کی تمام کتابیں خریدنی اور اس کے لیے روپے جمع کرنے تھے۔ اس معرکے کو سر کرنے کے لیے ہم نے سبزی اور سودے وغیرہ کی خریداری میں مزید چار آٹھ آنے کے گھپلے کرنا شروع کردیے۔ چھوٹی بہنوں سے ایک آنہ دو آنہ ہتھیانا اور عیدی وغیرہ کی بڑی رقم جو پانچ دس روپوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی، اضافی کمک شمار ہوتی۔ یوں ہم نے وہ چند سو روپے اکٹھے کر ہی لیے جن سے ہم اُس وقت تک چھپی نسیم حجازی صاحب کی ساری کتابیں خرید سکتے۔

وہ ہماری زندگی کا بہت بڑا اور خوشی کا دن تھا جب ہم تیز تیز سائیکل چلا کر مال روڈ پر واقع ''فیروز سنز'' پہنچے۔ ہم نے حجازی صاحب کی تمام کتابیں نکال کر اس ٹیبل پر لا ڈھیر کیں جہاں بیٹھ کر ایک باباجی ''بل'' بنایا کرتے تھے۔ انھوں نے اتنی ساری کتابیں ایک ساتھ خریدنے کی کوشش کرتے دیکھ کر ہمیں مشکوک اور قدرے غصے بھرے انداز میں پوچھا، ''تمہیں پتا ہے ان سب کتابوں کی کیا قیمت ہے؟''

جواب میں ہم نے وہ ساری رقم نکال کر ان کے سامنے رکھ دی جس کا حساب ہم کئی ماہ پہلے کتابوں کی قیمت دیکھ کر لگا چکے تھے۔ انھوں نے جب ٹوٹل کیا تو وہ رقم کتابوں پر درج قیمت کے عین برابر تھی۔ اب باباجی مسکرائے، انھوں نے بل بنایا اور کمال شفقت اور مہربانی سے ہمیں پورے سولہ روپے رعایت کردی۔ یہ ہمارے لیے مزید خوشی کی بات تھی۔ چند روز قبل ہم مال روڈ سے گزرے تو فیروز سنز والی عمارت میں دکان غائب دیکھ کر دکھی ہوئے۔ یہاں سے ہم نے سینکڑوں کتابیں خریدیں اور بہت سا وقت کتابوں کی شیلفوں کے سامنے کھڑے کھڑے ورق گردانی کرتے اس ''کتاب محل'' میں گزارا۔ لاہور میں موجود کتابوں کی بڑی بڑی دکانوں سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

کتاب سے ہمارے ''عشق'' کا زمانہ بھی عجیب تھا۔ ہم نے پڑھنا شروع کیا تو سوائے نصاب کے باقی ہر طرح کی اچھی کتاب پڑھ ڈالی، شاعری، افسانہ، تاریخی ناول، جاسوسی ادب، سفرنامے، جو کچھ میسر آیا چاٹ گئے۔ کتابیں سستی تھیں، لیکن پھر بھی خرید کر پڑھنا مشکل تھا اور طالب علم کی حیثیت سے ہمارے لیے اور بھی دشوار کیونکہ بہت کم جیب خرچ میسر آتا تھا۔ پھر بھی ہم نے ڈھیروں کتابیں، خریدیں پڑھیں اور گھر کے اندر ہی اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا ڈالی۔

ایک وقت آیا کہ ہمارے پاس کم و بیش سات سو کتابیں جمع ہوگئیں۔ جن میں کچھ ایسی بھی تھیں جو دوستوں سے پڑھنے کے لیے لیں لیکن پھر کبھی واپس نہ کیں۔ ہمارے ایک استادِ محترم فرمایا کرتے تھے، کتاب اور دودھ جہاں بھی ملے، پی جاؤ۔ ہم نے کتاب کی حد تک ان کے اس فرمان پر خوب عمل کیا لیکن غلطی یہ ہوئی کہ استاد جی کا یہ فرمان دوستوں کے بھی گوش گزار کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو دوست بھی ہم سے ''کتاب'' مانگ کر لے گیا، ڈکار گیا اور کبھی واپس نہ کی۔

ہمارے دوست ''بوٹے'' کے مالی حالات ہم سے بھی پتلے تھے البتہ شوقِ مطالعہ خاصا تگڑا، لہٰذا کتاب خریدنے کی ہمت و طاقت نہ ہونے کے باوجود اپنے شوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے بوٹے نے ایک ''طریقۂ واردات'' ایجاد کرلیا۔ ہم بھی اس واردات میں اس کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں دس پندرہ روپے کی کتاب بھی ہماری قوت خرید سے باہر تھی۔ ہم نے لاہور کی کتابوں کی تمام بڑی بڑی دکانیں تاڑ رکھی تھیں، جیسے فیروز سنز، ماورا والے۔

طریقۂ واردات یہ ہوتا کہ ہم اپنے ذہن میں چند کتابوں

www.urdugem.com

کے فرضی نام ترتیب دیتے اور ساتھ کسی مشہور لکھاری کو اس کا مصنف بنا لیتے۔ ہر تیسرے چوتھے دن بہت سا فارغ وقت لے کر کسی بڑی دکان میں گھس جاتے اور مختلف کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کسی مجموعۂ کلام سے دس بارہ غزلیں پڑھ لیتے۔ کھڑے کھڑے کسی کتاب سے ایک آدھ افسانہ پڑھ ڈالتے۔ اپنی دلچسپی کی کئی دیگر چیزیں بھی پڑھ جاتے۔ کبھی ایک آدھ چھوٹی موٹی کتاب اپنی استطاعت کے مطابق خرید بھی لیتے۔

جب ہمیں ایک جگہ کھڑے کھڑے کافی وقت گزر جاتا، تو لازمی طور پر سیلز مین متوجہ ہوتے کہ یہ لڑکے تو دکان کو لائبریری بنائے ہوئے ہیں۔ ایسے میں کوئی صاحب ہمارے پاس آتے اور کاروباری مسکراہٹ اور شائستگی سے دریافت فرماتے، ''جی کون سی کتاب چاہیے؟ میں آپ کی مدد کروں؟''

اب ہم ہوٹے کے ایجاد کردہ طریقہ واردات کے مطابق کسی فرضی کتاب کا نام لیتے، مثلاً ایک بار میں نے ایسی ہی صورت حال میں فیروز سنز کے باباجی سے کہا، ''جی وہ دراصل میں کتاب ''رقصِ ابلیس'' تلاش کر رہا تھا۔''

باباجی نے ذہن پر زور دیا اور دہراتے ہوئے پوچھا ''رقصِ ابلیس؟ بیٹا یہ کس کی لکھی ہوئی ہے؟''

میں نے فوراً گھڑا گھڑایا جواب دیا۔ ''جناب مولانا کوثر نیازی کی نئی کتاب ہے۔''

وہ سوچتے ہوئے گویا ہوئے، ''نہیں، اس نام سے کوئی کتاب نہیں... سوری۔''

کبھی ایسی ہی سنگین صورت حال میں ہم کہتے، ''جی وہ اسلم راہی کا نیا ناول ''خاکی زین کے تھان'' چاہیے تھا۔'' اب دکان دار سٹپٹا جاتا کیونکہ یہ سب فرضی نام ہوتے۔ وہ حیرت سے ہمیں دیکھتا اور ہم سے اور پھر معذرت کر لیتا۔ ہم کمال کی اداکاری کرتے ہوئے لمبی سی ''اووو'' کرتے اور مسکرا کر کہتے، چلیے کوئی بات نہیں، ہم کسی اور جگہ سے پتا کر لیتے ہیں یہ کہہ کر ہم دکان سے کھسک لیتے۔ بعد میں ہمیں اپنی کم مائیگی اور اس غیر اخلاقی حرکت کا شدت سے احساس ہوتا۔ ہم کوئی اچھی کتاب خریدنا چاہتے اور خرید نہ پاتے تو ہماری آنکھیں نم ہو جاتیں۔

کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ہم خود ہی اکتا گئے۔ اب ہم نے ایسی لائبریریاں تلاش کیں جو یومیہ کرایے پر کتابیں پڑھنے کے لیے دیتی تھیں۔ ہم ان کے رکن بن گئے، یہ ایک سستا ذریعہ تھا جس سے ہم اپنے شوقِ مطالعہ کی تسکین کا سامان کرتے۔ دوستوں سے بھی کتابوں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔

لاہور کینٹ میں جہاں راحت بیکری ہے، اسے میڈیکل چوک بھی کہا جاتا تھا، یہاں ایک چھوٹا سا پھٹہ نما بک اسٹال ہوا کرتا تھا اور اب بھی ہے، (لیکن فرش پر) اس کے مالک جہانگیر صاحب درویش صفت انسان ہیں۔ ان سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ ہم گھنٹوں ان کے پاس وقت گزارتے۔ ان کے پھٹے کے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ کر ہم نے کئی کتابیں بنا خریدے پڑھی ہیں۔

جہانگیر صاحب ہمیں چائے بھی پلواتے اور کبھی کبھی راحت کی آئس کریم سے ہماری تواضع کرتے۔ کیا اچھے دن تھے، لوگوں میں مروت تھی، محبت تھی۔ جہانگیر صاحب نے کم و بیش ۴۵ سال اسی ایک جگہ پر بیٹھ کر اخبارات، میگزین رسالے اور کتابیں فروخت کیں اور ترقی کا یہ عالم ہے کہ اب ''پھٹے'' کی بجائے مارکیٹ کے برآمدے میں فرش پر کپڑا بچھا کر ''علم'' فروخت کرتے ہیں۔ خود بھی ایک ستون سے ٹیک لگائے فرش پر ہی محو استراحت ہوتے ہیں۔

یہ سب ''کتاب'' سے محبت کی یادیں ہیں۔ جب ہم تلاشِ معاش میں ملک سے باہر چلے گئے تو گویا گھر اور فیملی کے ساتھ ساتھ کتاب سے بھی دور ہو گئے۔ سال دو سال بعد جب چھٹی پر آتے تو دیکھتے کہ ہماری کتابوں کی الماریاں خالی

ہوتی جا رہی ہیں۔ تقریباً ربع صدی کی ملک بدری کے دوران گھر میں موجود کتابوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اب تو لوگوں کا کتاب سے جیسے رشتہ ہی ختم ہو گیا ہے نہ کسی کے پاس فرصت ہے اور نہ شوقِ مطالعہ۔

اب فیس بک اور انٹرنیٹ کے جدید آلات نے بری طرح لوگوں کے ذہنوں کو اپنے بے رحم پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہماری نئی نسل تو اس دلدل میں اس طرح پھنس چکی کہ اب بچنا دشوار ہی نہیں ناممکن نظر آتا ہے۔ کتابوں کو شہد لگا کر الماریوں کے پیچھے پھینک دیا گیا ہے تاکہ چوہے انھیں کترتے رہیں۔ جدیدیت کی دیمک تمام پرانی روایتیں اور قدریں چاٹ گئی ہے۔ جن ہاتھوں میں کتاب ہونی چاہیے تھی، ان ہاتھوں میں ''آئی فون'' اور ریموٹ کنٹرول ہے۔

انگریز برصغیر سے رخصت ہوئے تو قیمتی سامان لوٹنے کے ساتھ ساتھ کتابوں کی صورت میں ہمارا بہت سا علمی خزانہ اور نایاب اثاثہ سمیٹ کر یورپ لے گئے۔ اپنی لائبریریوں کی زینت بنا لیا اور اس سے استفادہ بھی کرتے رہے۔ علامہ اقبال علیہ رحمہ یورپ گئے تو مسلمانوں کا یہ علمی، ادبی، ثقافتی ''بیسرمایہ'' انگریز کی الماریوں اور عجائب گھروں میں دیکھ کر دکھی ہو گئے، فرمایا:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

زمانے کی قدریں بدلتی گئیں، لائبریریوں کی جگہ پہلے میوزک سینٹر بنے پھر موبائل شاپس بن گئیں۔ کبوتروں کی جگہ کووں نے لے لی، اب جوتے شیشے کے خوبصورت شو کیس میں سجے ہوتے ہیں اور کتابیں فٹ پاتھ پہ دھری ہوتی ہیں۔ جدید نسل کتاب سے بالکل کنارہ کش ہو گئی ہے۔ آج بچے اسکول کالج کے نصاب کی کتاب کو بھی مجبوراً ہاتھ لگاتے ہیں، یہ اہل دل اور اہل دانش کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

سوشل میڈیا نے علم اور معلومات کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ لوگ جگت اور فقرے بازی کو بھی علم کے ترازو میں تولنے لگے ہیں۔ کتاب سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے ماضی اور تاریخ سے بہت دور چلے گئے ہیں، اپنے علمی و ادبی سرمائے اور اپنے اسلاف کے سنہرے ماضی سے ناآشنا رہ گئے ہیں، ہمارے بچوں کو پتا ہی نہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی کون تھے؟

ہماری ملاقات بی اے کے ایک ایسے طالب علم سے ہوئی جسے مختار مسعود، اشفاق احمد، فیض احمد فیض کا قطعاً علم نہ تھا۔ مجھ جیسے پرانے لوگ ایسی صورتِ حال پہ کڑھتے رہتے ہیں، بچے گھنٹا گھنٹا ویڈیو گیم کھیلتے رہتے ہیں، لیکن دس پندرہ منٹ بھی کسی کتاب کا مطالعہ توجہ اور شوق سے نہیں کر سکتے۔ کتاب سے تعلق زوال پزیر ہے، کوئی اس طرف توجہ نہیں دے رہا۔

ٹی وی کے کسی چینل پہ بچوں کا کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ مختلف اسکولوں کے چھوٹے بچے اور بچیاں ٹولیوں کی شکل میں شریک تھے، ٹی وی کے اینکر پرسن نے بچوں سے علامہ اقبال کی مشہور دعا، ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' سنانے کو کہا، کہیں سے کوئی ہاتھ کھڑا نہ ہوا۔ ہمیں یہ دیکھ کر شدید دکھ ہوا، بیسیوں بچے بچیوں میں سے کوئی ایک بھی اس نظم کا مصرعہ تک نہ سُنا سکا۔

آٹھ دس سال کی چند بچیوں نے ہاتھ بلند کیے۔ کمپیئر مائیک لے کر ان کے پاس گیا۔ ان چھوٹی چھوٹی اسکول کی بچیوں نے ''لب پہ آتی ہے دعا'' تو سنانے سے معذرت کر لی اور ضد کی کہ ہم گانا سنائیں۔ مجبوراً ان کو گانا ہی گنگنانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد انھوں نے کورس کی شکل میں جو گایا اس کے بول تھے:

''سالی تُو مانی نہیں، سالی تُو مانی نہیں''، کہیے آپ کیا کہیں گے؟

www.urdugem.com

شکیلہ رفیق

پردے کے پیچھے کی عورت!

الیکشن کا موقع قریب آنے پر ازدواجی نفسیات کی بوالعجبی دکھاتا دلچسپ ماجرا

آج کل صبح و شام دن اور رات وہ اسے بتا رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھو عرصے بعد ملک میں الیکشن ہو رہے ہیں... ہمارے ہاں جمہوریت آ رہی ہے اور میں اس موقع پر کتنا خوش ہوں تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“ پھر رُک کر پوچھتا ہے۔ ”تم بھی خوش ہو نا؟“

”لیکن...“ وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتا۔ وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی تو وہ دھیمے لہجے میں کہتا۔ ”میں... خوش ہونے کے ساتھ خوفزدہ بھی ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ..... اگر ہم نے یعنی میں نے اور تم نے اس پارٹی کو ووٹ نہ دیا جس کا انتخابی نشان ہوائی جہاز ہے تو... یقین جانو! ہمارے لیے بہت برا ہوگا..... وہ میرا دوست ہے اور ..... اُس کی فتح کے ساتھ ہی میری فتح کی راہیں بھی روشن ہو جائیں گی جو اُس کے مخالف نے تاریک کر دی تھیں۔ لہٰذا ہم دونوں کا فرض ہے کہ نہ صرف خود اسے ووٹ دیں بلکہ اپنے تمام متعلقین پر بھی زور دیں کہ وہ غلطی سے بھی اس

پارٹی کو ووٹ نہ دیں جس کا انتخابی نشان موٹر سائیکل ہے..... سمجھیں۔؟“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ۔“

”بس اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ تمہیں ہوائی جہاز پر نشان لگانا ہے۔“

”جی اچھا!“

”اور کسی انتخابی نشان کی جانب دیکھنا بھی مت۔“

”بہت بہتر۔“

”بس صرف اور صرف ہوائی جہاز۔“

”ٹھیک ہے“

”تم میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہو نا؟“

”جی!... بہت اچھی طرح“

”شکریہ!“

اس نے کہا پھر اپنی بیگم کے ہاتھ تھام کر اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

مقررہ دن آن پہنچا تھا۔ وہ صبح سے وہی الفاظ دہراتے ہوئے ریکارڈ کی مانند بجے جا رہا تھا:

”دیکھو۔ ہوائی جہاز پر نشان لگانا ہے! کسی اور انتخابی نشان کی جانب دیکھنا بھی مت! ہوائی جہاز کو منتخب کرنے میں ہی ہماری عافیت ہے اور ہاں! موٹر سائیکل تمہاری دشمن ہے۔ خبردار! جو تم نے اس کے یا کسی دوسرے انتخابی نشان کے بارے میں سوچا بھی تو..... تم میری باتیں غور سے سُن رہی ہو نا؟

”جی ہاں..... مجھے اس پارٹی کو ووٹ دینا ہے جس کا انتخابی نشان ہوائی جہاز ہے۔“

اس نے سبق کی مانند دہرا دیا۔ شوہر نے خوش ہو کر بیگم کو دیکھا اور کہا:

”شاباش! تم بہت اچھی بیوی ہو... مجھے تم پر فخر ہے، پھر جھک کر اُس کی ہرن آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ ”تم بھی مجھ پر فخر کرتی ہو نا؟“

”جی ہاں۔“

”بہت اعلیٰ۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی..... اچھا اب تیار ہو جاؤ..... صبح ہی صبح ووٹ ڈال آئیں تو اچھا ہے۔ بعد میں ہجوم بڑھ جاتا ہے۔“

”جی بہتر۔“

”سنو! وہ آسمانی رنگ کا سادہ سوٹ پہن لینا اور..... اپنا کارڈ ضرور رکھ لینا۔“

”کون سا کارڈ؟“

”میرا مطلب ہے شناختی کارڈ... ورنہ وہاں شناخت کیسے ہوگی۔“

”میری شناخت تو آپ ہیں۔“

اُس نے کہا تو وہ جی بھر کر ہنسا اور پھر اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولا ”کتنی پیاری بیوی ہو تم.. مگر میری جان! وہاں تو تمہاری شناخت، شناختی کارڈ سے ہی ہوگی..... لہٰذا یاد سے رکھ لینا۔“

”جی اچھا رکھ لوں گی۔“

اس نے ملائمت سے کہا اور ڈریسنگ روم میں جا کر آسمانی رنگ کا سادہ سوٹ پہننے لگی۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ دس سال پیچھے چلی گئی تھی...

”سنو! گھر کا کام تین بجے تک ختم کر لینا۔ پھر نہا کر رولرز لگا لینا۔ میں ٹھیک پانچ بجے آجاؤں گا۔ تم بالکل تیار ملنا۔“

وہ حسب معمول ہدایات دے رہا تھا اور وہ بھی حسب معمول ہی جی جی کہہ کر اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

”اچھا۔ اللہ حافظ۔“ وہ گھر سے نکلنے لگا پھر اچانک ٹھہر کر بولا۔ ”وہ سبز انڈین ساڑھی ہے نا؟ وہ باندھنا۔“

”جی اچھا!“

”اور کانوں میں جرمنی والے آویزے۔“

”ٹھیک ہے۔“

www.urdugem.com

”میک اپ نہ بہت ہلکا کرنا نہ گہرا، البتہ لپ اسٹک گہری لگانا۔“

”اچھا!“

”اس ساڑھی کے ساتھ کی میچنگ سینڈل تو ہے نا۔“

’جی۔‘

”بس پھر تو وہی پہننا۔۔۔اچھا اللہ حافظ۔“

لیکن وہ خاموش رہی اور مڑ کر ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی کہ اُس کی آواز آئی ”اور سنو! بال کھلے رکھنا......وہ اس روز جیسا اُونچا سا جوڑا نہ بنا لینا، مجھے بالکل پسند نہیں آیا تھا، یاد ہے نا؟“

”جی۔ یاد ہے۔ میں بال کھلے رکھوں گی۔“

”اچھا اللہ حافظ“

اب وہ واقعی چلا گیا۔ اس نے ناشتے کے برتن سمیٹے، گھڑی دیکھی اور اُس کی ہدایات کے مطابق کام شروع کر دیا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ سبز ساڑھی میں ملبوس، جرمنی کے آویزے کانوں میں پہنے، کھلے بالوں کے ساتھ مناسب میک اپ کے بعد گہرے رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر جما رہی تھی کہ وہ گھر میں داخل ہوا اور ”ہوں“ کہہ کر اس کا جائزہ تنقیدی نگاہوں سے لینے لگا۔

”ویری گڈ!“ کچھ دیر بعد اُس کی آواز آئی۔ ”بس میں ذرا کپڑے تبدیل کرلوں پھر چلتے ہیں۔“

”جی اچھا“

گزشتہ دس برس سے ’جی اچھا‘، ...... ”ٹھیک ہے“، اور ”بہت بہتر“ جیسے الفاظ کی ادائیگی اس کا معمول تھا۔ وہ کوئی کام بھی اس کی مرضی کے خلاف نہ کرتی تھی۔

وہ اپنی ’عورت‘ سے بہت خوش تھا اور...... ہمارے یہاں خوشگوار ازدواجی زندگی کی علامت یہ ہے کہ مرد اپنی عورت سے مطمئن اور خوش رہے اور...... وہ خوش رہتا تھا...... ہنستا تھا اور...... ہنستا ہی رہتا تھا کہ اس کی زندگی کی ناؤ، اطمینان و مسرت کے دریا کی پرسکون موجوں میں ہلکورے لیتی تیرتی چلی جا رہی تھی...... اس صورت حال میں اسے کسی دوسری بات پر غور و فکر کی ضرورت بھی کیا تھی۔

دس سال میں ان کے یہاں تین بچے ہوئے تھے۔ سب کے نام اُس نے اپنی پسند سے رکھے تھے۔ بچے کن اسکولوں میں داخل ہوں گے؟ ان کی تربیت کیسے ہوگی۔ وہ کس قسم کے کپڑے پہنیں گے، کس کے گھر جائیں گے کس کے نہیں۔ کب سوئیں گے۔ کب جاگیں گے۔ کب کھیلیں گے۔ کیا کھیلیں گے، کیسے دوست بنائیں گے۔ کیا کھائیں گے، ٹی وی کتنی دیر دیکھیں گے۔ ان کے مطالعے میں کون سی کتب و رسائل آئیں گے۔ ان تمام باتوں کا فیصلہ بھی وہی کیا کرتا تھا اور۔۔۔وہ بہت خوش تھا کہ اُس کی عورت سارے کام اُس کی پسند سے کرتی تھی۔

ہر محفل میں وہ اس کا تعارف کرواتے ہوئے بہت فخر سے کہتا:

”جناب! ان سے ملیے ...... یہ ہیں ہماری پیاری، دلاری اور وفادار بیگم صاحبہ۔“

اور آج۔۔۔!

وہ اُس کی ہدایت کے مطابق ہوائی جہاز کو اپنی وفاداریاں سونپنے جا رہی تھی۔ آسمانی کپڑوں میں ملبوس وہ پولنگ بوتھ میں داخل ہوئی۔ ضروری اقدامات سے فارغ ہو کر بیلٹ پیپر ہاتھ میں تھامے پردے کے پیچھے چلی گئی۔

پس دیوار۔۔۔اس نے ہاتھ میں تھما ہوا پرس ایک جانب رکھا اور بیلٹ پیپر کھول لیا۔ پھر خوب غور سے تمام انتخابی نشانات دیکھے۔ پہلی ہی تصویر ہوائی جہاز کی تھی۔

اور پھر۔۔۔

اُس نے بے حد طمانیت کے ساتھ موٹر سائیکل پر مہر لگا دی۔

سعد فاروقی

خوابوں کا محل

جو ایک نوآموز سرکاری افسر نے بنایا تھا مگر...

۲۰۰۵ء میں سی ایس ایس (مقابلے کا امتحان) کرنے سے پہلے ہم اپنے پیش رو افسران اور عوام سے سنتے آئے تھے کہ اگر رُوئے زمین پر کوئی مکانی جنت ہے تو وہ سول سروسز اکیڈمی ہے۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں تو ایک طرف رہیں وہاں قیام و طعام کی ایسی آسائشیں ہم پہنچائی جاتی ہیں جن کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہر کیف انجینئر ہونے کے باوجود ہم نے سی ایس ایس کر لیا۔ کیا پتا تھا کہ ہمیں ورغلایا گیا ہے اور اب سات ماہ کی قیدِ بامشقت کاٹنی پڑے گی۔ بہر حال وہاں بسر ہونے والے آئندہ سات مہینوں کا حسین تصور لیے ہم ”اکیڈمی“ پہنچ گئے۔ داخلی دروازے سے جونہی اندر داخل ہوئے تو ایک نہایت قدیم عمارت پہ نظر پڑی۔

ہم سمجھے کہ شاید یہ عمارت محکمہِ آثارِ قدیمہ کے زیرِ انتظام ہے اور اس سے پیشرو افسرانِ بالا کی چند یادیں اور نوادرات وابستہ ہوں گی جن کی نمائش سے وقتاً فوقتاً ہمارا جذبہ افسری از سر نو تر و تازہ کیا جائے گا، لیکن چوکیدار سے پتا چلا کہ یہ انتظامی بلاک ہے اور اس میں فیکلٹی (faculty) کے چند معزز ارکان کے علاوہ کوئی قدیم چیز نہیں۔ ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

اسی چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ اسی عمارت کی بالائی منزل یعنی کوٹھے پر آپ کی رہائش کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہم اپنا سر و سامان لے کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے اوپر پہنچے کیونکہ سیڑھیوں کے خستہ قدمچوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ پتا چلا کہ نائب قاصد صاحب ابھی تشریف نہیں لائے اور کمرے کے قفل کی چابی ان کے پاس ہے۔

چوکیدار نے جو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا، ہمیں ٹی وی کے کمرے میں استراحت کرنے کو کہا۔ ٹی وی روم پہنچے تو وہاں قبرستانوں جیسی ناگوار سی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے پہلے اس کمرے کا استعمال اسے آسیب زدہ سمجھ کر متروک کر دیا گیا تھا اور اب پرانے کاٹھ کباڑ کو صاف کر کے عارضی طور پر قابلِ استعمال بنایا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک عدد بزرگ ٹی وی موجود تھا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے اسے چلایا تو کسی بھی چینل پر تصویر نہیں تھی۔ آواز البتہ آ رہی تھی؛

www.urdugem.com

شاں شاں کی آواز۔ ہم ڈر سے نجات پانے کے لیے اسی آواز سے سمع خراشی کرنے لگے۔ ٹی وی کے کمرے میں ہمارے بیٹھنے سے وہاں مستقل رہائش پزیر مچھروں کو بڑا فائدہ ہوا۔ وہ طویل عرصے سے انسانی خون کے متلاشی تھے چنانچہ انہوں نے ہمارے میٹھے خون سے اپنا طویل روزہ افطار کیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک صاحب خراماں خراماں تشریف لائے۔ ان کی چال ڈھال دیکھ کر ہم نے گمان کیا کہ شاید کوئی بابو ہیں۔ تفصیلی تعارف پہ پتا چلا کہ وہی ناہنجار ہمارے ہاسٹل کا نائب قاصد ہے۔ ہم اسے صرف یہی کہہ سکے:

؎ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

اُن صاحب نے ایک ڈرامائی کمرا کھول کر ہمیں اس میں جانے کا اشارہ کیا۔ اکثریت کے برعکس اکیلا اور تن تنہا کمرا پا کر خوشی سے ہماری باچھیں کھل گئیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ کمرے میں نہ تو ٹھنڈی مشین (اے سی) تھی اور نہ ہی آبِ رواں والا پنکھا (ائیر کولر)۔

ہم نے سست رفتار چھتی پنکھے کو غنیمت جانا اور اپنا سامان وہاں رکھ دیا۔ اس ہاسٹل میں زمانۂ قدیم کے شاہی حماموں کی طرح اجتماعی غسل خانے تھے اور ہمیں یہ خیال ستانے لگا کہ ہر روز ایک ہاتھ میں تولیہ اور دوسرے ہاتھ میں صابن تھام کر قطارِ غسل میں لگنا پڑے گا۔ بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ پانی بھی افسرانہ ادا کے ساتھ آتا اور بعض اوقات دورانِ غسل بند ہو جاتا ہے۔

بعد ازاں ہم تیار ہو کر اپنے نام اور کوائف کا اندراج کروانے مرکزی ہال میں پہنچے تو وہاں انواع و اقسام کے سُوٹ بُوٹ اور رنگ برنگے آنچل نظر آئے۔ سب اندراج کے لیے اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔ جب ہر پروبیشنر (Probationer) کو فرداً فرداً تسلیمات کر کر کے تھک گئے تو ہم نے نئی نویلی افسری کے زعم میں انتظامیہ کے ایک صاحب سے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا کہ میری باری کب آئے گی؟ انہوں نے دُرشتی سے ہمیں جھٹک دیا۔ اُن کے یوں سنی ان سنی کر دینے پر ہم غمزدہ سی صورت بنا کر بیٹھ گئے اور پیچ و تاب کھانے لگے۔ آخر کار کافی انتظار کے بعد قرعۂ فال ہمارے نام نکلا۔ وہاں سے ہم کھانے کے کمرے یعنی میس (Mess) میں پہنچے تو وہاں 'کنکر' پلاؤ پکا تھا۔ اسے کھا کر خفیف سے دردِ شکم کے علاوہ کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ ہمیں اس احساس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی کہ اب ہمارے معدے لکڑ ہضم، پتھر ہضم کی کیفیت اختیار کر چکے یعنی

؎ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اگلے دن ڈائریکٹر صاحب کا افتتاحی خطاب تھا جس میں ہم پر انکشاف ہوا کہ اصل میں ہم انسان نہیں بلکہ ہنس ہیں۔ لگتا تھا کہ ڈائریکٹر صاحب ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے متاثر ہیں۔ دراصل ڈائریکٹر صاحب نے خطاب میں ہمیں ہنسوں کی طرح اتفاق و اتحاد کی تلقین کی تھی۔ ہنس انگریزی حرف V کی طرح قطار بنا کر اڑتے ہیں۔ اس سے آگے کی نسبت پیچھے والوں کو اڑنے میں سہولت ملتی ہے، چنانچہ ہنس باری باری سب سے آگے والے ہنس کی جگہ لیتے ہیں۔ مزید برآں اگر کوئی ہنس زخمی ہو جائے تو دو ہنس اپنی ڈار سے الگ ہو کر اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ کمرِ اجماعت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہی مضامین شد و مد کے ساتھ پڑھائے جا رہے ہیں جنہیں مقابلے کے امتحان کے لیے پڑھ پڑھ کر ہمارے ذہن کے سوتے خشک ہو گئے تھے، مثلاً ''تعلیم سب کے لیے''، ''غریبوں کے لیے صحت کی بنیادی سہولتیں'' اور ''انسان کی زندگی کا بنیادی مقصد'' وغیرہ۔ یعنی تعلیم بالغان کا منظر تھا۔ گویا:

؎ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہ سب دیکھ کر ہمارے خوابوں کا محل چکنا چور ہو گیا اور ہم زیرِ لب گنگنا اُٹھے۔

بہت شور سنتے تھے اس انجمن کا
یہاں آ کے جو کچھ سنا تھا، نہ دیکھا

داغ دہلوی

مزاح

ہائے سویرا ہو گیا!

ابو الفرح ہمایوں

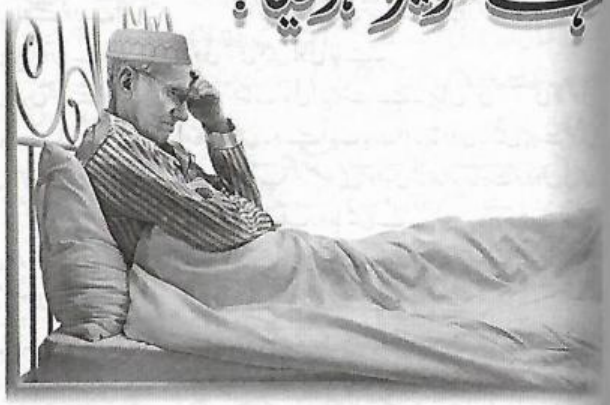

جنت الفردوس میں بھی شریکِ زندگی کی کمی محسوس کرنے والے شوہر کا شوخیوں بھرا ماجرا

ڈاکٹر نے کہا ''آپ کا وقت ختم ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں۔ بمشکل چھ ماہ۔''

''ڈاکٹر! کیا اس مدت میں کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا؟ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے؟ صرف پچھتر سال۔ ہم کچھ اور جینا چاہتے ہیں۔''

''نہیں۔ بس اتنی عمر کافی ہے۔ شکر کریں کہ اتنی بے اعتدالیوں اور بد پرہیزی کے باوجود آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ ورنہ تو کوئی اچھی بھلی نابغۂ روزگار ہستیاں نہایت کم عمری میں ہی دنیا کو داغ مفارقت دے کر چلی گئیں۔ اب آپ بقیہ زندگی عبادت میں گزاریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔''

ڈاکٹر کی طرف سے مایوس ہو کر ہم نے اللہ سے لو لگا لی مگر ابھی تین ماہ بھی پورے نہ گزرنے پائے تھے کہ بلاوا آ گیا۔ ہم اپنے بستر پر چاروں شانے چت ایک بھولا بسرا گیت گنگنا رہے تھے کہ اچانک یوں لگا جیسے ہمارے جسم سے کوئی پرندہ نکل کر آسمان کی جانب پرواز کر گیا۔

ججوں نے بلا تامل فیصلہ دے دیا کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ اسے فوراً دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ یہ ساری عمر اللہ کی یاد سے غافل رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت میں بھی بجائے وظیفے اور درود پڑھنے کے، اس کے لبوں پر فلمی گیت رواں تھا۔

اچانک ایک گرج دار آواز گونجی۔ ''لیکن اس نے بہت نیک کام بھی کیے ہیں۔ اس نے پورے پچاس سال اپنی بیوی کا درشت اور تلخ رویہ نہایت صبر و شکر سے برداشت کیا ہے۔ گویا اس نے دنیا ہی میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت لی۔ ہم اس کے گناہوں کو معاف کر کے اسے جنت میں داخل کیے جانے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔''

ہم تو مارے خوشی کے پھولے نہ سما رہے تھے۔ اپنی پچاس سال کی تمام کلفتوں کو بھول کر خوشی سے بغلیں بجانے لگے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اتنا بڑا انعام ملے گا۔ واقعی عالم بالا میں انصاف کا بول بالا ہے۔ یہاں کسی کے ساتھ زیادتی ہو ہی نہیں سکتی۔

''اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور جنت میں اس کی پسند کے مطابق رہائش وغیرہ کا بندوبست کرو۔'' ایک غیبی آواز نے

www.urdugem.com

کسی فرشتے کو حکم دیا۔

ایک فرشتہ ہمیں لے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیدل ہی چل پڑا۔ ہم بھی شاداں و فرحاں انداز میں اچھلتے کودتے اُس کے پیچھے پیچھے دوڑے اور جنت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کسی ہوشیار ایجنٹ کی طرح فرشتے نے ہمیں کئی مکانات دکھائے اور ہر مکان کی خوبیاں گنواتے ہوئے ہمیں رام کرنے کی کوشش کی لیکن ہمیں کوئی مکان پسند ہی نہیں آرہا تھا۔

کبھی مکان پسند آتا تو پڑوسی نہیں اور اگر پڑوس ٹھیک ٹھاک ہوتا تو نظاروں اور دل فریبی میں کچھ کمی ہوتی۔ بہر حال جیسے تیسے ایک مکان پسند کر ہی لیا۔ سیدریا کے کنارے نہایت آراستہ و پیراستہ مختصر سا دو منزلہ مکان تھا۔ طرزِ تعمیر کا شاندار شاہکار۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہو۔ اوپر کی منزل پر ایک شاندار لائبریری موجود تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہمیں خیال آیا کہ کہیں یہ شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوں کی لائبریری تو نہیں۔

خیر ہم نے وہاں رہنا شروع کر دیا۔ مکان ویل فرنشڈ تھا۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ ہاتھ بڑھاؤ اور اُٹھا لو۔ ایک عدد حور بھی یہاں پہلے ہی سے موجود تھی، جو سنگ مرمر کے بت کی طرح ایک جگہ جم کر بیٹھی تھی۔ کوئی کام کہو تو روبوٹ کے سے مشینی انداز میں آگے پیچھے ہو کر فرض بجا لاتی اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی۔ ہم جلد ہی اس سے بیزار ہو گئے اور فرشتے سے فرمائش کی کہ بھائی صاحب! ہمیں کوئی بہتر قسم کی حور مہیا فرما دیجیے جو شوخ اور چنچل قسم کی ہو۔ گپ شپ کی شوقین اور کچھ ادبی ذوق بھی رکھتی ہو۔

فرشتے نے کہا ”یہ کون سی مشکل بات ہے۔ جنت میں ہر طرح کی حوریں موجود ہیں۔ آپ جسے چاہیں پسند کر لیں، بلکہ اگر ضرورت ہو تو ایک سے زائد بھی رکھ سکتے ہیں۔“

ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ پرانی کی جگہ نئی حور ہمارے سامنے کھڑی دل آویز مسکراہٹ نچھاور کر رہی تھی۔ ”کیا حکم ہے میرے آقا!“ اس کے شیریں لبوں سے مترنم آواز بکھر گئی۔

”فی الحال تو ہمارے چند مضامین کمپوز کر دو اور ہاں دیکھو کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔“

”جنابِ عالی! یہ جنت ہے۔ یہاں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ ویسے ایک بات اور بتا دوں۔ میں بہت خوش خط ہوں۔ آپ اگر حکم دیں تو ایسی شاندار کتابت کر دوں گی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں گے۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ جاؤ! اپنا کام کرو۔“ ہمیں اُس کی لن ترانی کچھ اچھی نہ لگی۔

ذرا ہی دیر گزری تھی کہ وہ سب مضامین کتابت کر کے لے آئی اور پلندہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اگر یہ کتاب دنیا میں چھپ جاتی تو ایک دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی۔

”اور کوئی حکم میرے آقا!“ وہ بدستور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہماری طرف گستاخ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”اپنے کمرے میں جاؤ۔ جب کوئی ضرورت ہوگی تو بلا لیں گے۔“

وہ چلی تو گئی مگر چند ہی منٹوں بعد پھر آن موجود ہوئی۔ ”حضور! کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے میز سجا دی ہے۔ آپ کھانا تناول فرمالیں۔“

میز پر ہماری پسند کی ہر چیز موجود تھی۔ بڑے پُرشوق انداز میں بے تابی سے کھانے لگے۔ وہ ہماری طرف بڑی محویت سے دیکھتی رہی اور ایک ایک چیز اصرار کر کے کھلاتی رہی۔

”کیا تمہیں بھوک نہیں لگتی؟ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔“

”نہیں نہیں۔ میں بعد میں کھا لوں گی۔ آپ آقا اور میں حور۔ بندی اس قابل کہاں۔“

ہم خاموش ہو گئے مگر اُس کا یہ فدویانہ انداز ہمارے دل کو بھا گیا۔ ایک خیال ہمارے دل میں آیا۔ ہماری بیوی تو ہمارے سامنے نہایت بے تکلفی سے گنواروں کی طرح چپڑ چپڑ کرتے کھاتی اور ہماری طرف یوں دیکھتی جیسے ہمیں منہ چڑا رہی ہو۔ ہڈیوں کو تو اس طرح بھنبھوڑتی گویا بدترین دشمن کا ڈھانچہ چبا رہی ہو۔

”اب آپ کے آرام کا وقت ہے۔ میں نے بستر درست کر دیا ہے۔ شام کو میں آپ کو پارک میں چہل قدمی کے لیے لے چلوں گی۔“

اب ہماری عادتیں خراب ہوتی جا رہی تھیں اور ہم بلا چون و چرا اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے لگے تھے۔ وہ ہر کام بڑے سلیقے سے انجام دیتی۔ اُس کی گفتگو بڑی دل نشیں اور دل افروز ہوتی۔ وہ بات بات پر مسکراتی اور اُس کے منہ سے پھول جھڑتے۔ ایک دن ہمیں اچانک ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

ایک دوست نے دوسرے سے پوچھا ”یار! کبھی کسی عورت کو دیکھ کر تمہیں یہ خیال آیا کہ کاش تمہاری شادی نہ ہوئی ہوتی۔“ دوست نے بلا تامل جواب دیا۔ ”ہاں، اپنی بیوی کو دیکھ کر۔“

وہ کبھی کبھی کوئی غزل بھی گنگنا دیتی اور اِدھر اُدھر کے قصے کہانیاں سنانے میں تو اُسے مہارت حاصل تھی۔ لیکن اب ہمیں کچھ یکسانیت کا احساس ستانے لگا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے جس میں نہ لڑائی جھگڑا، نہ تلخی و ترشی، نہ روٹھنا اور منانا۔ دنیا میں تو یہ حالت تھی کہ ذرا سی کوئی بات ناگوار گزری اور خاندان کی اگلی پچھلی سات پشتوں کو لتاڑ ڈالا گیا۔

تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد ہم نے ایک فیصلہ کر ہی ڈالا۔ ہم نے فرشتے سے کہا کہ بھئی! ہم ایسی بے رونق زندگی سے عاجز آ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسی حور لا کر دو جو انتہائی ترش مزاج، زبان دراز اور جھگڑالو قسم کی ہو۔ بات بات پر روک ٹوک کر کے ناک میں دم کر کے رکھ دے۔“

فرشتے نے بڑی سنجیدہ سی شکل بناتے ہوئے کہا۔ ”یہاں منفی سوچ اور کم ظرفی کی باتیں سخت ممنوع ہیں۔ یہ جنت ہے کوئی تمہارا گھر نہیں۔ جنت میں رہنا ہے تو یہاں کے اصولوں اور دستور کے مطابق رہنا ہوگا۔“

”تو پھر ایسا کرو کہ ہماری بیوی کو یہاں لے آؤ۔ کم از کم ہماری زندگی میں رونق اور بہار تو لوٹ آئے گی۔ یہاں ایک جیسی سپاٹ زندگی گزارتے گزارتے طبیعت اُوب گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اعلیٰ حکام سے بات کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔“

ذرا ہی دیر بعد وہ پھر آن موجود ہوا اور کہنے لگا۔ ”تمہاری درخواست کے جواب میں یہ فرمان صادر ہوا ہے کہ تمہاری بیوی کی مہلت ابھی باقی ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تمہیں اُس کے پاس واپس بھیج دیا جائے۔ جب اُن کا وقت آیا تو تم دونوں کو ایک ساتھ بلا لیا جائے گا۔“

ابھی ہم کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ اچانک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور کوئی چیز جسم میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ ہم ہوش میں آ رہے تھے لیکن دل و دماغ کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے طویل عرصے کے بعد گہری نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔

چند لمحوں بعد جب ہم ہوش و حواس میں واپس آئے تو دیکھا ہماری نصف بہتر بڑے پیار اور چاؤ سے ہمارے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں اور پھر نہایت مدھر اور مدھم سی آواز میں انھوں نے سرگوشی کی۔ ”فجر کی آذان ہو رہی ہے۔ جلدی سے مسجد چلے جائیے اور نماز پڑھ کر آئیے۔ آج میں آپ کو نہایت مزیدار ناشتا کرواؤں گی۔“ اُن کے چہرے پر بڑی لگاوٹ اور شوخی رقصاں تھی۔

”نہیں ایں ایں“ ہمارے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ ”ہم اس دنیا میں اس لیے تو واپس نہیں آئے۔ ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو آپ کا وتیرہ ہے۔“ ہم نے دل میں کہا اور چھلانگ مار کر مسجد کی طرف دوڑ لگا دی۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

قومِ نوحؑ کا عبرتناک انجام

مشتاق احمد

قومِ نوحؑ بلادِ شرقیہ یعنی عراق و شام میں صدیوں پہلے آباد تھی۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اُن کے بتوں کے نام وَدّ، سواعًا، یعوق، یغوث اور نسر تھے۔ کسی بُت کو روزی دینے، کسی کو بارش، کسی کو بیماری سے شفا دینے، غرض یہ کہ مختلف قسم کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے اُن پر چڑھاوے چڑھاتے اور مُرادیں مانگتے تھے۔

انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو مبعوث کیا۔ حضرت نوحؑ نے قوم کو کہا کہ تُم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو اور اللہ تعالیٰ مجھے تمہیں راہِ راست پر لانے کے لیے بھیجا ہے۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور بتوں کی پوجا چھوڑ دو۔ قوم نے جواب دیا کہ تم کہتے ہو، اللہ نے تمہیں ایک اللہ پر ایمان لانے کے لیے بھیجا ہے۔ اگر اللہ نے ہماری اصلاح کرنی ہوتی تو کسی فرشتے کو نبی بنا کر بھیجتا اِس لیے ہم تمہیں نہیں مانتے۔

حضرت نوحؑ نے کم و بیش ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی مگر گمراہ قوم نے آپؑ کی ایک نہ سُنی اور نتیجتاً صرف ستّر لوگ صحیح راستے پر آئے۔ حضرت نوحؑ نے عرض کیا کہ ”اے میرے ربّ، میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا اور جب میں نے اُن کو بُلایا تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف کر دے تو انھوں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانپ لیے اور اپنی رَوش پر اَڑ گئے اور پھر میں نے اعلانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چُپکے چُپکے بھی سمجھایا۔

میں نے کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا معاف کر دینے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا۔ تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کر دے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے حالانکہ اُس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور اُن میں چاند کو نُور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے اُگایا اور پھر تمہیں اُسی طرح زمین میں واپس لے جائے گا اور اُس سے یکا یک نکال کھڑا کرے گا اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس پر کھلے راستوں پر چلو۔

نوحؑ نے کہا اے میرے ربّ، اُنھوں نے میری بات ردّ کر دی اور اُن رئیسوں کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے۔ ان لوگوں نے بڑے بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے اور انھوں نے کہا، ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو۔ اُنھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تو بھی اِن ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔ چنانچہ قومِ نوحؑ کے باشندے اپنی خطاؤں کی بنا پر غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیے گئے، پھر اُنھوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا۔ نوحؑ نے کہا، اے میرے ربّ، ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اُن کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا، بدکار اور کافر ہی ہو گا۔ (خلاصہ سورۃ نوح ۷۱)

ایس اے نقوی

چاند سی دلہن

معصوم بچیوں میں کیڑے نکالنے والی عورتوں کے لیے ایک تازیانہ

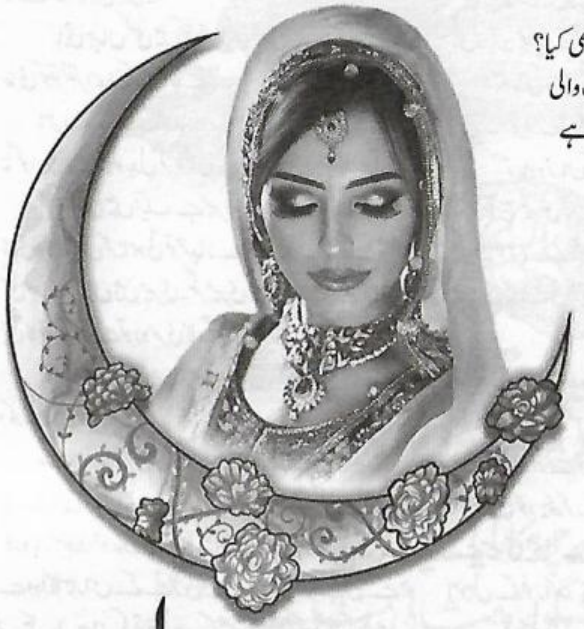

”اُف باجی، اچھی بھلی تو لڑکی تھی۔ مجھے تو بہت پسند آئی۔ سلجھی ہوئی، پڑھی لکھی، خوبصورت اور خاندان بھی بہت اچھا تھا، اور بھلا کیا چاہیے؟“ صابرہ نے تاسف سے کہا۔

”کیوں بھئی! لڑکی کی ناک نہیں دیکھی کیا؟ میرے شہروز کے لیے میں کوئی چپٹی ناک والی لڑکی تھوڑی نہ لاؤں گی۔ ایک ہی تو بیٹا ہے میرا“؟ عادلہ نے ہاتھ جھلا کر کہا۔

”چپٹی ناک؟؟ بھئی میں نے تو ناک پر اتنا غور کیا ہی نہیں البتہ مجموعی طور مجھے وہ بہت پرکشش لگی۔ اگر ناک چپٹی تھی بھی تو کیا ہوا باجی۔ مجموعی طور پر تو مجھے وہ بچی بڑی ہی پیاری لگی۔“ اس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

”دیکھ صابرہ..... تمہارا کوئی بیٹا تو ہے نہیں۔ بھلا تم کیا جانو کہ ایک ماں کے کیا ارمان ہوتے ہیں۔“ اس نے میٹھے لہجے میں کڑوی بات کی مگر صابرہ نے دل پر نہیں لیا۔ وہ اللہ کی رضا میں راضی تھی۔ اس کے اُوپر معاشرے کی کڑوی باتیں اثر نہ کرتی تھیں، اس لیے وہ سنی ان سنی کر کے بڑے نارمل انداز میں بولی۔

”باجی، چھ ماہ میں چھ سو لڑکیاں تو دیکھ ہی چکی ہیں۔ آخر آپ کو شہروز کے لیے کیسی لڑکی چاہیے؟“

www.urdugem.com

"مجھے تو اپنے بیٹے کے لیے چاندسی دلہن چاہیے۔" عادلہ کے لہجے میں عجیب سا فخر گھل گیا تھا۔

"چاند میں بھی تو داغ ہوتا ہے۔ مکمل تو وہ بھی نہیں" صابرہ نے کہنا چاہا مگر ہمت نہ کر پائی، اس لیے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"باجی جہاں کسی میں کئی خوبیاں ہوں وہاں ایک آدھ خامی کو تو نظر انداز کر دینا چاہیے"۔

اس سادہ سی بات کا عادلہ صاحبہ تو بُرا ہی مان گئیں۔ ناگواری سے پہلو بدل کر بولیں۔

"لاکھوں میں ایک ہے میرا بیٹا۔ ایسے ہی ایک آدھ خامی والی قبول کرنا ہوتی تو تمہارے گھر سے نہ رشتہ لے لیتی۔ سگی بھانجیاں ہیں میری۔ مگر میری بُری قسمت کہ تیری ایک بیٹی کا قد چھوٹا ہے تو دوسری کا رنگ سانولا"۔

صابرہ یہ سنتے ہی خاموش ہو گئی۔ اس کا دل بری طرح دکھ سے بھر گیا۔

صابرہ اور عادلہ سگی بہنیں تھیں۔ عادلہ کا بس ایک بیٹا اور ایک ہی بیٹی تھی جبکہ صابرہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ شہروز نے باپ کا کاروبار سنبھالا تو عادلہ کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ چھ ماہ سے وہ لگاتار اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھی مگر مجال ہے جو اب تک اسے اس کی توقعات کے عین مطابق کوئی لڑکی ملی ہو۔

چھ ماہ کی تگ و دو کے بعد جب تھک چکی تو اپنی بہن صابرہ کے گھر جا بیٹھی کہ وہ اپنی جان پہچان کی تمام لڑکیاں دکھا دے۔

صابرہ نے ایک ہفتے میں اسے جانے کتنی لڑکیوں کے رشتے دکھائے، مگر مجال ہے جو عادلہ کے دل کو کوئی پسند آئی ہو۔

☆☆☆

"ارے کم بخت۔ جانے مجھے تیری ماں نے کیا گھول کر پلا دیا تھا جو میں اندھی ہو کر تجھے اپنے شہروز کے لیے پسند کر بیٹھی۔" وہ شاہین کے سر پر کھڑی کب سے اُسے کھری کھری سنا رہی تھی۔

"اماں اب بس بھی کرو... تم ہی نے مجھے پسند کیا تھا..... خود ہی کہا تھا کہ پورا ملک کھنگالنے کے بعد تجھے میں ملی ہوں۔" شاہین نے بھی اسے اسی کی بات یاد کروائی۔

"ارے جب چائے دینے آئی تھی تب تو ایسی گونگی بنی بیٹھی تھی جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اندر دو فٹ لمبی زبان چھپائے بیٹھی ہے۔" وہ مزید طیش میں آ کر بولی۔

"اماں، اب تم بلاوجہ باتیں سناؤ گی تو میں کچھ تو کہوں گی"۔ اس نے زچ ہو کر کہا۔

"زیادہ زبان نہ چلا..... جا جلدی سے اچھا سا کھانا تیار کر۔ آج میری شہزادی بیٹی کو دیکھنے لڑکے والے آ رہے ہیں۔" اس نے چیختے انداز میں حکم دیا تو شاہین بھی منہ بسور کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔

☆☆☆

"ارے ساجدہ، میں اتنے دن سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ تم نے تو بتایا ہی نہیں کہ لڑکے والوں نے کیا جواب دیا۔ ارے وہ تو نہال ہو گئے ہوں گے میری شہزادیوں جیسی بیٹی کو دیکھ کر۔ آخر پڑھی لکھی، خوبصورت، سلجھی ہوئی ہے میری بیٹی"۔ عادلہ نے ساجدہ کو فون کر کے رسمی حال احوال کے فوراً بعد ہی پوچھا۔

"جی بہن! بات تو آپ کی ٹھیک ہے، مگر ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے۔ معاف کرنا بہن مگر انہیں شگفتہ پسند نہیں آئی"۔ ساجدہ نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے ساجدہ۔ ارے کیا کمی ہے میری بیٹی میں؟ انہیں آخر لڑکی میں چاہیے کیا؟؟؟"..... وہ جوش میں آئی۔

"کمی تو کوئی نہیں بس وہ کہہ رہے تھے کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے چاندسی دلہن چاہیے۔" ساجدہ نے سادگی سے بتا کر فون بند کر دیا اور عادلہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

☆☆☆

مہوش طالب

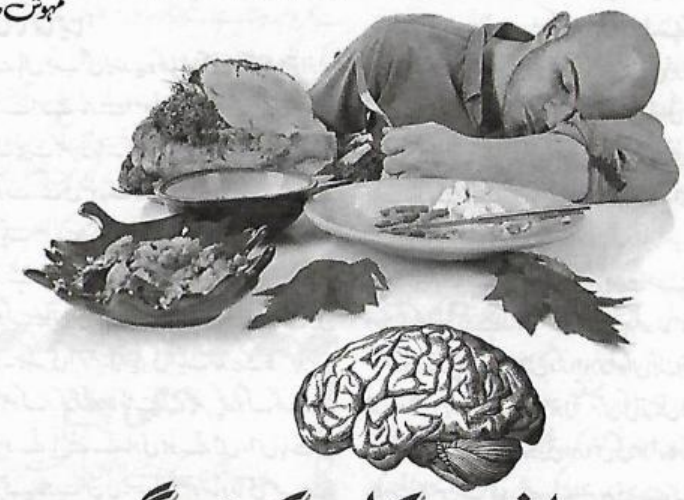

دماغی کارکردگی کم کرنے والی دس عادات

اِن سے چھٹکارا پائیے اور اپنی زندگی کو خوشگوار و مثالی بنا لیجیے

انسان کے بدن میں دماغ آقا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی تمام جسمانی اعضاء کو احکامات جاری کرتا اور ان سے کام کرواتا ہے۔ اگر دماغ میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو پھر روزمرہ کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ ذیل میں ایسی عادات کا تذکرہ پیش ہے جو ہمارے دماغ کو کمزور و ناتواں بنا سکتی ہیں۔

۱۔ ناشتا نہ کرنا:

کچھ لوگ صبح اُٹھتے ہی ناشتا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ کچھ عموماً دیر سے ناشتا کرتے ہیں، کہ صبح صبح کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ بعض لوگ سرے سے ناشتا ہی نہیں کرتے، مگر یہ عمل نہ صرف معدے بلکہ دماغ کے لیے بھی بے حد نقصان دہ ہے، کیونکہ صبح کے وقت متوازن خوراک نہ کھانے سے آپ کا بلڈ شوگر لیول کم ہو جاتا ہے۔ اس باعث دماغ تک ضروری غذائی اجزاء نہیں پہنچ پاتے۔ نتیجتاً دماغ کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا جب صبح کا آغاز ہی غیر متوازن طریقے سے ہوگا تو ذرا سوچیں کہ سارا دن

www.urdugem.com

آپ کیونکر چستی سے کام کر پائیں گے؟

۲۔ زائد کھانا کھا لینا:

ہمارے ہاں جب بھی پسندیدہ کھانا بنتا ہے تو ہم متوازن غذا کھانے کے اپنے سارے اصول فراموش کر دیتے ہیں۔ پھر جب تک پیٹ بھر نہ جائے دسترخوان نہیں چھوڑتے، یا بہت تیز بھوک لگنے کی صورت میں جب کھانا ہمارے سامنے آتا ہے تو ایک دم سے اتنا زیادہ کھا لیتے ہیں کہ بعد میں خود ہی پریشان رہتے ہیں۔

بعض لوگ یوں بھی پیٹ بھر کر کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے ''ہمیشہ بھوک رکھ کر کھانا چاہیے''۔ پھر کچھ لوگ کھانے کے فوراً بعد سونے یا لیٹنے کے عادی ہوتے ہیں، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ یہ عادت ان کی جسمانی خصوصاً دماغی صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ زائد کھانا ہاضمہ کرنا دماغ کی نالیوں کو سخت کر دیتا ہے، جس سے دماغ کی طاقت میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔

۳۔ تمباکو نوشی:

تمباکو اور سگریٹ پینا ایسی عادات ہیں، جن کی شدت بعض اوقات جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ نہ صرف دماغ کی نالیوں کو سکیڑتی بلکہ الزائمر (Alzheimer) بیماری اور دماغ کے سرطان کا باعث بھی بنتی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو سگریٹ اور تمباکو پینے کے عادی ہیں، انھیں ایک دم سے عادت ختم کرنے کے بجائے رفتہ رفتہ مستقل طور پر اس سے جان چھڑانے کی منصوبہ بندی پر عمل کرنا چاہیے۔

۴۔ زیادہ میٹھا کھانا:

یہ کہنا بے جا نا ہوگا کہ بچوں کے علاوہ جو لوگ میٹھے کے شوقین ہوتے ہیں۔ انھیں کہیں بھی میٹھا کھانے کو مل جائے چاہے وہ کیلوریز بھری آئس کریم ہو، مائع سے بنا کسٹرڈ یا چینی کی فیکٹری کی مانند دیگر میٹھے پکوان، وہ پورا پورا انصاف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ زیادہ میٹھے کا استعمال خواہ وہ چائے میں ہو، یا ڈیزرٹ کی صورت، موٹاپے کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ دماغی حصوں کے عمل میں بھی خرابی پیدا کرتا ہے۔ اس سے پروٹین، وٹامن اور دیگر غذائی اجزاء کی دماغ تک ترسیل میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ یوں خلیوں کی افزائش رک جاتی ہے اور نتیجتاً دماغ ٹھیک طرح کام نہیں کر پاتا۔

۵۔ ہوائی آلودگی:

ہمارے جسم میں آکسیجن کی ضرورت سب سے زیادہ دماغ کو ہوتی ہے۔ ہوا جس میں ہم ہر لمحہ سانس لیتے ہیں، آلودگی سے پاک نہیں، گرد اور دھواں ہمہ وقت فضا میں موجود رہتا ہے۔ آلودہ ہوا آکسیجن کی ترسیل دماغ تک صحیح طرح سے نہیں ہونے دیتی اور اس کی مؤثر کارکردگی میں رکاوٹ کا موجب بنتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے تک تازہ فضا میں ۳۰ سے ۶۰ منٹ تک ضرور چہل قدمی کریں۔ یہ مشق سارا دن آپ کو زائد تکان نہیں ہونے دے گی۔

۶۔ پُرسکون نیند کی کمی:

رات گئے دیر تک جاگنا، صبح دیر سے اُٹھنا یا دو دو دن تک اپنے آرام کا خیال نہ رکھنا، آپ کی جسمانی صحت کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ ایک طرف یہ عادتیں جلد اور آنکھوں کی تازگی ختم کرتی ہیں وہیں دوسری طرف یہ دماغ کے خلیوں کی موت بھی تیز کر دیتی ہیں۔

۷۔ سر ڈھانپ کر سونا:

ہمارے ہاں عموماً اور خصوصاً سردیوں میں سر ڈھانپ کر سونا مناسب یا صحت کے لیے اچھا تصور کیا جاتا ہے، مگر یہ غلط فہمی دور کر لیجیے کیونکہ سر ڈھانپ کر سونے سے بند جگہ میں کاربن ڈائی آکسائیڈ جمع ہوتی اور آکسیجن کی مقدار کم ہونے لگتی ہے۔ اس سے دماغی خلیوں کے سُن ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ افراد جو سر ڈھانپے بغیر سونے کے

عادی نہ ہوں، موٹے لحاف کے بجائے باریک کپڑا، رومال یا دوپٹا اوڑھ سکتے ہیں۔

۸۔ بیماری اور تکان میں بھی کام کرنا:

جب آپ شدید بخار، نزلے، زکام یا جسم درد کی زد میں ہوں تو عام طور سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات کام کا دباؤ آپ کو وہ ضروری آرام اور سکون کرنے نہیں دیتا جو آپ کی اچھی صحت کی بحالی کے لیے ناگزیر ہے، اور آپ بیماری کی پروا کیے بغیر کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر طالبہ بھی شدید سر درد کے باوجود پڑھتے ہیں، مگر یاد رکھیے یہ آپ کی دماغی اور یادداشت کی کمزوری کا موجب بن سکتا ہے۔

۹۔ غیر ضروری اور منفی سوچیں:

منفی عادات دماغ کو زنگ لگانے میں دیر نہیں لگاتیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ فارغ وقت میں یا تو کچھ سوچتے ہی نہیں کہ جو کام ہمارے ذمے تھا، وہ ہم نے پورا کر لیا، یا اگر سوچیں بھی تو ہمارا ذہن منفی اور پریشان کن سوچوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

پہلے کیس میں دماغ کے اہم حصے سوچنے کی صلاحیت اور ذہانت سے خالی ہونے لگتے ہیں، جبکہ دوسری صورت میں دماغی نالیوں پر دباؤ بڑھتا ہے۔ علاوہ ازیں فشارِ خون بلند ہو جاتا ہے۔ دماغ کی نالیوں میں خون کی بے ترتیب ترسیل بہت سی خطرناک بیماریوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

لہٰذا آپ فارغ ہوں یا مصروف، اپنے ذہن کو مثبت کاموں اور سوچوں میں مصروف رکھیں۔ چیزوں کو کھوجنے، پہیلیوں کو سلجھانے کی تگ و دو میں رہیں۔ اس ضمن میں انٹرنیٹ، فیس بک پر موجود ویب سائٹس پر دی گئی مختلف گیمز ذہانت اور حاضر جوابی کو جانچنے کے لیے فائدے مند ثابت ہو سکتی ہیں۔

۱۰۔ تنہا پسندی اور سرد مزاجی:

وہ لوگ جو اکیلے رہنا پسند کرتے ہیں، یا زیادہ لوگوں میں گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے، ان کا ذہن بھی تخلیقی صلاحیتوں سے محروم رہتا ہے۔ نتیجتاً دماغی کمزوری سے ان کی ذہانت کو زنگ لگ جاتا ہے۔

اگرچہ دماغی کمزوریوں کے یہ اسباب آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتے ہیں، تاہم ایک وقت میں آکر یہ ہماری صحت کا اس قدر نقصان کر چکے ہوتے ہیں کہ ہم پھر انھیں کسی بھی طرح پلٹا نہیں سکتے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم ان بے پروائیوں سے پرہیز کریں اور اپنی جوانی اور بڑھاپے کو کسی پر بوجھ بنانے کے بجائے صحت منداور مثالی بنالیں۔

کالی چائے

چائے چین کے رہنے والوں کی اختراع ہے۔ چین میں قدیم زمانے سے ناشتے کے ساتھ چائے پی جاتی تھی۔ پہلے اِس کی پتّیوں کی رنگت سیاہ ہوا کرتی تھی۔ اِس میں سیاہی مائل بھورا پن ایشیا و افریقہ کے مختلف ملکوں میں کاشت کے تجربات کی بدولت پیدا ہوا۔ یاد رہے کہ یہ چین میں آج بھی سیاہ رنگ کی پتّیوں کی شکل میں پیدا ہوتی اور 'بلیک ٹی' کہلاتی ہے۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلِ کار سترھویں صدی کے اوائل میں چائے مغربی ممالک میں لائے۔ اُس سے پہلے اہلِ مغرب ناشتے میں بیئر، یا چاکولیٹ پیا کرتے تھے۔ ۱۶۴۵ء میں چائے پینے کا رواج انگلستان بھر میں ہو گیا۔ فرق اِتنا آیا کہ چین میں 'چا' اُس پانی کو کہتے ہیں جس میں چائے کی پتّیاں اُبالی جاتی ہیں، مغرب میں پتّیوں کو 'چائے' کہنے لگے۔ چین اور جاپان میں چائے بغیر شکر اور دودھ کے پی جاتی ہے۔ اِس میں دودھ اور شکر ملانے کا رواج ہندوستان پہنچ کر ہوا۔

www.urdugem.com

صادق ہدایت

بازگشت

ایک بدصورت مرد کا دل چھو لینے والا قصہ، اس کی ویران زندگی میں خوشی بہار بن کر کبھی کبھی آتی تھی

شریف بائیس برس پردیس میں گزارنے کے بعد اپنے آبائی شہر، آبادہ لوٹ آیا تھا۔ جب آبادہ سے گیا تھا تو اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ دانت مضبوط تھے اور پیشانی پر سیاہ بال گرے رہتے۔ مگر اب اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی، دانت ہل رہے تھے اور سر کے بال گر چکے تھے۔

پٹواری، گرداور، قانون گو، تحصیلدار وغیرہ مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد اب وہ پچاس برس کی عمر میں آبادہ کا افسر مال مقرر ہوا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوا اور صرف بچپن کے ایام گزار سکا۔ ابھی وہ بارہ برس ہی کا تھا کہ باپ نے اسے تعلیم کے لیے تہران بھیج دیا۔ فارغ التحصیل ہوتے ہی اسے ملازمت مل گئی۔ تب سے وہ مختلف علاقوں میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب محض اتفاق یا شاید ذاتی کوشش سے اس کا تبادلہ آبادہ ہو گیا تھا۔ یوں اسے ایک بار پھر اپنے آبائی گھر میں رہنے کا موقع مل گیا۔

زندگی کے تلخ تجربوں نے اسے ہر شے سے بے زار اور لاابالی بنا دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ دفتر میں اپنے چالاک اور ہوشیار ساتھیوں سے، جو رشوت خور اور خائن تھے، بہت پیچھے رہ گیا۔ زندگی میں ناکامی کی وجہ افیون کی عادت نہ تھی بلکہ اس کی شرافت اور دیانت!

باپ اس کے لیے اتنا ورثہ چھوڑ کر مرا تھا کہ وہ بغیر کوئی کام کیے اپنی پوری زندگی نہایت اطمینان سے گزار سکتا تھا بلکہ افیون کی لت نہ پڑتی تو بہت کچھ بچا بھی لیتا۔ وہ محض فرصت اور بے کاری سے بچنے کے لیے دفتر جاتا تھا۔ اُسے دفتر کی میز پر بیٹھنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب زندگی سے بے زاری اور کام سے اکتاہٹ کے باوجود وہ ملازمت سے سبکدوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اسے آبادہ کی ہر شے تنگ، محدود اور سطحی نظر آتی۔ لوگ اُسے آوارہ اور بے ہودہ معلوم ہوتے۔ یہ لوگ اپنے اصلی رنگ روپ کھو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے پنجے زندگی کے شکم میں گاڑ دیے تھے۔ ان کا خوف و ہراس، واہمے اور وسوسے، ان کی بے اعتدالی اور وارفتگی بڑھ گئی تھی۔ ان کی توندیں نکل آئی تھیں۔ ہوا و ہوس بڑھ گئی تھی۔ زندگی کی ہاؤ ہو میں ان کی توجہ اپنے ساتھیوں کی پگڑی اچھالنے، ماتحتوں کو ستانے، کپاس، گندم، افیون اور شکر کی ذخیرہ اندوزی کرنے اور بیماریوں کا علاج کروانے تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔

کیا وہ خود بھی اپنا پہلا رنگ روپ نہیں کھو چکا تھا؟ کیا وہ خود بھی بوڑھا اور ناتواں نہیں ہو گیا تھا؟ کیا وہ بھی اس خیال سے آبادہ میں نہیں آیا تھا کہ اپنی زندگی کے باقی ایام افیون کے نشے میں مست رہ کر گزار دے۔ اس کی چھوٹی بہن جو پچھلی ملاقات پر اس قدر جوان اور ہشاش بشاش نظر آتی تھی، اب شادی کر کے کئی بچے جن چکی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ کیا اس کی پژمردگی اپنے بھائی کی آشفتگی کی غمازی کر نہیں کرتی تھی؟ کیا سُرخ مٹی کے مکانوں اور تاریخی کنڈروں کا یہ شہر جسے گویا طنزاً ''آبادہ'' کہا جاتا ہے، بجائے خود ویران اور عبرت انگیز نہیں تھا؟

شاید آبادہ نہیں بدلا وہ خود ہی بدل گیا تھا۔ یہ اس کی اپنی افسردگی اور مایوسی کا اثر تھا کہ اسے آبادہ کی ہر شے حسن و خوبی سے عاری نظر آتی تھی۔ آبادہ کے لوگ مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ خود ہی خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ زندگی میں اپنی ناکامی اور کامیابی کے لیے سعیٔ رائیگاں کی چند ناگوار یادوں کے سوا اس کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔ اعصاب جواب دے رہے تھے۔ وہ اپنی لاش کو دیوانہ وار ادھر سے اُدھر گھسیٹتا پھرتا تھا!

دفتر میں وہ تمام وقت سگریٹ پیتا رہتا اور نہایت بے دلی سے سرکاری کاغذوں پر دستخط کرتا۔ اکثر لاروس کی مصور لغات کھول کر اس کی تصویریں دیکھتا رہتا۔ دفتر کے دوسرے لوگ شام کو شہر کے کلب میں جمع ہوتے تھے اور رات عیش و عشرت اور قمار بازی میں گزار دیتے۔ لیکن شریف ان سے میل جول پسند نہ کرتا تھا۔ اس نے کنارہ گیری اور گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی۔ دفتر سے آ کر وہ گھر میں باغبانی اور سبزی کاری میں مشغول ہو جاتا۔ اس کا بیشتر وقت تریاک کشی اور اس کے لوازمات میں گزرتا۔ سر شام اس کا بوڑھا نوکر، غلام رضا انگیٹھی میں کوئلے دہکاتا اور باغ میں حوض کے کنارے بید کے درخت تلے شیر کی کھال بچھا دیتا۔

شریف اس پر بیٹھ جاتا اور نہایت احتیاط سے وہ صندوقچی کھولتا جس میں تریاک کشی کا حقہ اور افیون کی گولیاں رکھی رہتی تھی۔ وہ یہ سب چیزیں اپنے گرد چن لیتا اور نہایت ذوق و شوق سے مشغول ہو جاتا۔ کبھی غلام رضا چپکے سے اس کے پاس بیٹھ جاتا اور اپنے ہاتھ سے اسے تریاک

www.urdugem.com

دیتا جیسے کوئی نہایت اہم مذہبی فریضہ انجام دے رہا ہو۔

غلام رضا خانہ زاد ملازم تھا جو شریف کو گھر کے ساتھ ہی گویا ترکے میں ملا تھا۔ وہ بہت مطیع، فرمانبردار اور وفادار تھا اور اُن پرانی وضع کے خوش خلق اور بے آزار لوگوں میں سے تھا جو دل و جان سے مالک کی خدمت کرتے اور اس کے پسینے پر لہو تک بہا دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ دنیا میں صرف ایک وہی شخص تھا جو شریف کے وسوسوں اور واہموں کو سمجھتا اور اس کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ چونکہ شریف غیر معمولی طور پر نفاست پسند تھا اور ہر شے میں مین میخ نکالتا اس لیے غلام رضا اس کے برتنوں کی صفائی اور کمروں کی سجاوٹ پر خاص توجہ دیتا تاکہ اسے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔

تریاک کشی کے تکلفات سے فارغ ہو کر شریف سب چیزیں، حتیٰ کہ شطرنج کی وہ بساط بھی جسے وہ ہر دفعہ یونہی بلا مقصد نکال لیتا تھا، نہایت توجہ اور احتیاط سے صاف کرتا اور بڑے سلیقے اور قرینے کے ساتھ صندوقچی کے مختلف خانوں میں رکھ دیتا۔ پھر وہ تصویروں کی البم نکالتا جس پر اس نے قرآن مجید کی طرح غلاف چڑھا رکھا تھا۔ وہ نہایت ذوق و شوق سے تصویریں دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ البم کی ورق گردانی سے اُسے جو سرور ملتا وہ تریاک کے نشے کو مکمل کر دیتا۔ یہ البم گویا اس کی زندگی کی فلم تھا۔ اس میں ان تمام لوگوں کی تصویریں تھیں جن سے وہ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں کہیں نہ ملا تھا۔ یہ تصویریں عہد رفتہ کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کر دیتیں اور شریف ان میں کھو کر عجیب کیفیت محسوس کرتا۔

شریف کی ذہنی تفریح دیوان حافظ اور کلیات سعدی کے مطالعہ تک محدود تھی۔ یہ دونوں کتابیں ایران میں متوسط طبقہ کے ادبی ذوق کا بلند ترین معیار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن وہ اپنے اس ذوق کا اظہار کسی سے نہ کرتا تھا۔ زندگی کی تلخیوں نے اسے متنفر اور بیزار کر دیا تھا اور وہ ان کے معاملے میں نہایت سرد مہری اور بے اعتنائی سے کام لیتا۔ اس کے پاس ایک سدھایا ہوا تیتر بھی تھا جس کے پاؤں پر اس نے حلقہ ڈال دیا تھا۔ تیتر کی حفاظت کے لیے اس نے ایک چھوٹا سا کتا بھی پال رکھا تھا۔ یہ جانور بیکاری کے لمحات میں اس کا دل بہلاتے۔ وہ انسان کی پُرتزویر دنیا سے بھاگ کر جانوروں کی سادہ اور معصوم دنیا میں پناہ لیا کرتا۔

ایک روز شریف دفتر میں اپنی میز پر بیٹھا ایک موٹا سا رجسٹر دیکھ رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان داخل ہوا۔ یہ نوجوان دفتر کے عملے میں مقرر ہو کر تہران سے آیا تھا اس نے اپنے کاغذات شریف کو پیش کیے۔ شریف نے سر اٹھا کر نوجوان کو دیکھا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور اسے اپنے آپ کو سنبھال مشکل ہو گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا کوئی پرانا زخم جو بھر چکا تھا، پھر سے ہرا ہو گیا اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، اور اس کے عقل کے دھندلے پردے پر ایک بھولا ہوا درد ناک منظر اُبھر آیا۔

یہ کیونکر ممکن تھا؟ شریف نے اس نوجوان کو ایک عمیق خواب میں اپنی جوانی کے سندر سپنے میں دیکھا تھا اور اپنی زندگی کے بہترین ایام اس کے ساتھ گزارے تھے۔ یہ آج سے اکیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر یہ حسین خواب ٹوٹ گیا اور نوجوان ایک عجیب و غریب غیر خاکی وجود کی صورت اختیار کر کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ کیسے ممکن تھا؟ شریف کو یقین نہیں آتا تھا! اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اکیس برس کی اس مدت میں وہ خود تو ضعیف ہو چکا ہے اور قبر میں پاؤں لٹکائے موت کی راہ دیکھ رہا ہے لیکن یہ نوجوان جس اجنبی دنیا میں چلا گیا تھا، وہاں سے پہلے سے زیادہ جوان، حسین اور صحت مند بن کر لوٹا ہے۔

شریف اس نوجوان کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے اسے اپنے عہد شباب میں محسن کی صورت دیکھا تھا، جو اس کا گہرا دوست اور عزیز ہم درس تھا۔ وہی چال ڈھال، ناک نقشہ، وہی آواز، وہی لب ولہجہ، غیر ارادی حرکات و سکنات، وہی کھل کر بات کرنے کا انداز..... یہ نوجوان ہو بہو اس کے مرحوم دوست محسن کا نمونہ تھا۔ صرف یہ ایک فرق تھا کہ اس کی صورت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس نوجوان کی روح عام لوگوں کی معمولی زندگی کے قوانین سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے سے عجیب معصومیت اور بچپن ٹپکتا تھا۔

شریف نے نوجوان کے کاغذات اٹھائے لیکن پڑھ نہ سکا البتہ یہ دیکھ لیا کہ اس کا نام مجید ہے۔ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے یہ جملہ نکلا ''عجیب اتفاق ہے!''..... شریف کو جب کوئی الجھن محسوس ہوتی تو یہ جملہ بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا۔ اس کی یکساں اور غیر متغیر زندگی میں جب بھی کوئی نیا حادثہ رونما ہوتا تو وہ اسے محض ایک عجیب و غریب اتفاق ہی تصور کرتا تھا۔

اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور کسی قدر تامل کے بعد، بھرائی ہوئی آواز میں جو شدت اضطراب سے لرز رہی تھی، مجید سے اس کے والد کا نام دریافت کیا..... مجید محسن ہی کا لڑکا تھا۔ اس نے مجید کو بتایا ''تمہارے والد کے ساتھ میرے برادرانہ تعلقات تھے، ہم دونوں ایک ہی مدرسے میں پڑھتے اور ایک ہی دفتر میں کام کرتے رہے ہیں۔ میں تمہیں اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے گھر چلنے کے لیے کہوں۔''

آخر طے پایا کہ دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے وہ اُسے اپنے گھر لے چلے گا۔ چنانچہ ابھی دفتر بند ہونے میں کافی دیر تھی کہ شریف نے دفتر کے چپراسی کے سر پر مجید کا سامان اٹھوایا اور مجید کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سرخ مٹی کی کچی دیواروں والے گھروں، پرانے کھنڈروں اور ویرانوں کے پاس سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں شریف مجید سے اپنی اور محسن کی گہری دوستی کا ذکر کرتا رہا۔ آخر وہ ایک بہت بڑی حویلی میں پہنچے۔ اس حویلی کے دالان میں ایک وسیع باغ اور حوض تھا۔ اس باغ کا خوشنما منظر شہر کے خشک و بے آب مناظر کے مقابلے میں یوں نظر آتا تھا جیسے صحرا میں ایک دلکش گلستان۔

شریف آج بہت خوش، مستعد اور مطمئن تھا۔ مجید کو اپنے گھر لے آنا محض ایک فرض کی ادائیگی ہی نہ تھی بلکہ وہ اس میں ایک خاص قسم کی لذت بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے مرحوم دوست کا شکر گزار اور ممنون تھا کہ وہ اپنی موت کے کئی سال بعد ایک بار پھر مجید کی صورت میں اس زندگی میں داخل ہوا۔ اُس نے شریف کی غیر متغیر اور یکساں حالت میں ایک خوش نما انقلاب پیدا کر دیا۔

شریف نے غلام رضا کو حکم دیا کہ وہ مہمانوں والے کمرے میں مجید کا بستر لگا دے۔ اس کا دیوان ایک وسیع کمرے میں تھا جس میں بیش قیمت قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ اس کے طول کی جانب دروازوں کی ایک قطار تھی جو دالان میں کھلتے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی میز تھی جس پر قالین بچھا تھا۔ میز پر ایک شش گوشہ صندوقچی تھی جس پر آبادہ کی مشہور عالم قلمکاری کی گئی تھی۔ میز کے گرد چند کرسیاں رکھی تھیں۔

شریف نے حسب معمول اپنا لباس اتار کر، گھر کا زیب تن کیا اور کمرے میں چلا آیا۔ حقہ پینے سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ وہ عموماً سرسری طور پر اپنی صورت دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ خلاف عادت آئینے میں اپنی شکل دیر تک دیکھتا رہا۔ سونے کے نقلی دانت، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، اندر دھنسے ہوئے شانے، اور سانولی رنگت دیکھ کر وہ سخت مایوس ہوا۔ اس نے سوچا وہ ہمیشہ ایسا ہی بدصورت رہا ہے

www.urdugem.com

اور اس کے دل میں زمین پر بسنے والے لوگوں کے خلاف نفرت و حقارت کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ اسے اپنے والدین پر غصہ آیا جو اسے اس قدر بدصورت پیدا کر کے چھوڑ گئے تھے۔ اگر وہ دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا تو کیا فرق پڑ جاتا؟ اگر وہ خوش شکل ہوتا تو وہ بھی دوسروں کی طرح بے باک اور چالاک ہوتا اور یوں اس کے ماضی کی یادیں اس قدر تلخ اور غم انگیز نہ ہوتیں۔

عین اس وقت مجید کمرے میں وارد ہوا۔ دونوں دیوان میں بیٹھ گئے۔ شریف حقہ پینے لگا اور مجید سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجید کو بتایا کہ میں مرکز کو تمہارے پہنچنے کی اطلاع دے دوں گا اور وعدہ کیا کہ دو ایک ماہ بعد تمہاری ترقی کے لیے کوشش بھی کروں گا۔

انہوں نے شام کا کھانا ذرا جلد کھا لیا۔ جب مجید سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے لگا تو شریف نے نہایت شفقت کے ساتھ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مجید کو یہ بات بالکل فطری معلوم ہوئی۔ لیکن شریف کے لیے یہ ایک غیر معمولی حادثہ تھا اور حسب عادت بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ ''عجیب اتفاق ہے!'' مجید چلا گیا، تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا تصویروں کا البم کھولا تھا جو اس کی زندگی کے مختلف ادوار کا مرقع تھا۔ اس نے پیشانی سے اپنا پسینہ پونچھا اور چراغ تلے بیٹھ کر اس البم کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اپنے بچپن کی ایک تصویر میں وہ اپنی بہن کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس کا لباس میلا کچیلا تھا۔ آنکھوں میں حیرت اور تعجب تھا اور وہ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بری خبر چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

ایک اور تصویر تھی جو اس نے مدرسے کے لڑکوں کے ساتھ کھنچوائی تھی۔ وہ پہلی تصویر سے کچھ ایسی مختلف نہ تھی۔ وہی متعجب نگاہیں تھیں اور اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے تھے جنہیں وہ چھپا رہا تھا۔

ایک تصویر ایک گارڈن پارٹی میں مجید کے باپ محسن کے ساتھ اتروائی تھی۔ تصویر میں اس کی آنکھوں میں تحیر اور مایوسی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اپنا ہاتھ محسن کے کندھے پر رکھے ہوئے تھا۔ اس وقت وہ چودہ پندرہ برس کا تھا۔ تصویر کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس میں محسن کی صورت محو ہوتی اور کانپتی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے وہ کوئی عارضی، غیر مستقل شے اور چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہو جانے والی ہو۔ یہ تصویر شریف کو پسند آئی۔ اس میں شریف نے اپنے بال سنوار رکھے تھے اور زیادہ معزز اور باوقار نظر آتا تھا۔ اس نے نہایت احتیاط سے یہ تصویر البم سے نکال لی۔

آخری تصویر میں جو اس نے مازندران میں محسن کے ساتھ کھنچوائی تھی، محسن کی صورت مجید سے بالکل مشابہ تھی۔ لیکن خود شریف نے چند دن سے شیو نہ کی تھی اور اس کی ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی حیرت زدہ اور ہراساں نگاہیں کیمرے پر اس طرح جمی تھیں جیسے نسل انسانی کی تباہی و بربادی کا انتظار کر رہی ہوں۔ تصویر میں اس کی صورت بڑی وحشت انگیز تھی۔ شریف کو یہ تصویر قطعاً پسند نہ آئی۔

شریف نے ورق الٹے اور وہ تصویریں دیکھنے لگا جو اس نے مختلف علاقوں میں اپنے دفتر کے لوگوں یا دوسرے ملنے جلنے والوں کے ساتھ اتروائی تھیں۔ ان تصویروں سے اس کے ماضی کی یادیں مجسم ہو کر نظروں میں پھرنے لگیں۔ وہ ان سب لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی آوازیں سن رہا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے کسی دور کو بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ یادیں اس کی زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔

یہ تصویریں دیکھ وہ بہت متاثر ہوا۔ یہ عجیب تاثر بڑا ہی دردناک تھا۔ زندگی کی تلخیاں، محبت میں ناکامیاں اور کامیابی

کے لیے بیہودہ کوششیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا اور حلق سوکھ رہا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے اور نگاہیں خیرہ تھیں۔ جب وہ اپنے بستر پر لیٹا اور سونے کے لیے اپنی پلکیں بند کیں تو اس نے چشم تصور سے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی ایک قطار دیکھی۔

یہ صورتیں بادلوں میں سے ابھری اور دھوئیں میں محو ہو رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی طلسم یا فسوں کے اثر سے یکجا ہو گئی ہوں۔ ان صورتوں میں ان کے مرحوم دوست، عزیز ہمدرس اور محترم ہمکار کی صورت میں سب سے زیادہ نمایاں اور زندگی سے بھرپور نظر آتی تھی۔ اپنے تمام عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں میں صرف ایک محسن ہی تھا جس نے شریف کے دل پر کبھی نہ بھولنے والا تاثر چھوڑا تھا اور اب مجید کی غیر متوقع آمد اور محسن سے اس کی غیر معمولی شباہت نے اس تاثر کو اور بھی شدید بنا دیا تھا۔ کیا محسن کی ناگہانی موت نے جو شریف کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوئی تھی، اس کی زندگی کو زہر آلود نہیں کر دیا تھا؟ کیا وہ محسن کی ناگہانی موت کے بعد دنیا کی محفلوں سے اکتا نہیں گیا تھا اور کیا اب لوگوں کی مجلس میں اسے خستگی اور کوفت کا احساس نہیں ہوتا تھا؟

زندگی میں شریف کی ناکامی، مایوسی اور خوف و ہراس کا سب سے بڑا سبب اس کی بدصورتی تھی۔ بدصورتی ہی نے اس میں کمتری اور پستی کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اسی احساس کمتری کی بنا پر کسی سے اظہار محبت نہ کر سکا اور نہ کسی کو اپنا دوست بنا سکا۔ صرف ایک محسن ہی تھا جس نے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے تھے۔ شاید اس نے شریف کی بدصورتی کی طرف توجہ نہ کی تھی یا شاید وہ متوجہ تھا لیکن شریف کو اس کا احساس نہ دلاتا یا شاید وہ شریف کی شرافت اور اس کے حسن اخلاق کا گرویدہ تھا۔ وہ شریف سے مخصوص قسم کی برادرانہ محبت اور مخلصانہ ارادت کا اظہار کرتا تھا چنانچہ جب کبھی وہ کسی اور شخص کے ساتھ اسی قسم کی وابستگی ظاہر کرتا تو شریف کو حسد کا شدید احساس ہوتا۔

ایک دن محسن نے نہایت بددلی سے شریف کو بتایا کہ اس کے والدین شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خبر سن کر شریف کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ اس کے دل میں اجنبی لڑکی کے خلاف بغض و کینہ پیدا ہو گیا جو محسن کی بیوی بننے والی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو رہے تھے۔

امتحانات کے فوراً بعد محسن کی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں دوست جدا ہو گئے اور کبھی کبھار ہی ایک دوسرے سے ملتے۔ شروع شروع میں شریف کو محسن پر سخت غصہ آیا، لیکن بعد میں وہی افتاد جس نے محسن کو اس سے چھین لیا تھا، خود اس پر بھی آن پڑی۔

ان دنوں شریف اپنے عزیز و اقارب سے ملنے آبادہ چلا آیا تھا۔ یہاں اس کے بزرگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنی خالہ کی لڑکی عفت سے شادی کر لے۔ قصہ یہ تھا کہ گنبد ہرام کے قریب واقع علاقے سورک میں زمین کا ایک ٹکڑا جو عفت کے باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر دیا تھا، زمین کے اس ٹکڑے سے متصل تھا جو شریف کے والد نے اپنے بیٹے کے نام کر رکھا تھا۔ شریف کے بزرگوں کی خواہش تھی کہ اس شادی کے ذریعے ان دونوں ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملحق کر دیا جائے۔

شریف نہ تو زراعت کا ماہر تھا اور نہ اس اشتمال اراضی کے اقتصادی و معاشی فوائد اس کے تصور میں آ سکتے تھے۔ اسی لیے وہ اس تجویز پر خوش نہ تھا مگر اس کے بزرگوں نے نہایت جلد املاک کے معاملات طے کر لیے اور شادی کی رسوم ادا کر دیں۔

www.urdugem.com

جب دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیا گیا اور شریف عفت کے ساتھ حجلۂ عروسی میں تنہا رہ گیا تو وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ یہ ایک لامتناہی اور تمسخر آمیز ہنسی تھی جس نے شریف کی تمام رگوں کو بے حس کر دیا۔ وہ خاموش و ساکت کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھا اپنی بیوی کی صورت کا مقابلہ اس کی ماں سے کر رہا تھا۔ ماں بیٹی میں پوری مشابہت تھی۔ اسے محسوس ہوا جب عفت بوڑھی ہو کر اپنی ماں کا نقش ثانی بن جائے گی تو بھی محض وہ اپنی بدصورتی کے سبب اپنی بیوی کے دل میں گھر نہ کر سکے گا۔

اس کی نظروں میں خانگی جھگڑوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ پھرنے لگا۔ عفت کے لامتناہی قہقہے نے اس بھیانک منظر کو اور بھی ہولناک بنا دیا۔ اسے نہایت شدت سے احساس ہوا کہ یہ عورت اس کی نئی نویلی دلہن نہیں، ایک جانور ہے جو اسے زندگی بھر پریشان کرتا رہے گا۔ اپنے اس تاریک مستقبل سے وہ سخت رنجیدہ ہوا اور کورے لٹھے کی ایک چادر جس میں سے صابن کی بو آ رہی تھی، اوڑھ کر سو گیا۔ رات بھر ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا اور صبح کسی سے بات کیے بغیر تہران بھاگ آیا۔

شریف کی تہران سے غیر حاضری کے دوران محسن اپنے ایک بااثر عزیز کی سفارش پر مالیات کے محکمے میں ملازم ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد زندگی کے میدان میں قدم رکھے اور معاشرے میں اپنا مقام پیدا کرے۔ اس کے اصرار پر شریف بھی ملازمت اختیار کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ محسن کے اسی عزیز کے رسوخ سے اسے بھی مالیات کے محکمے میں جگہ مل گئی اور یہ دونوں دوست مازندران میں مامور ہوئے۔ دونوں نے ایک ہی گھر لیا اور ایک ساتھ رہنے لگے۔ دفتر سے لوٹ کر وہ رات گئے تک شطرنج کھیلتے رہتے اور تعطیل کے دن شہوار چلے جاتے۔ محسن کو شروع ہی سے پیراکی کا شوق تھا۔ اس نے سمندر کے ساحل پر ایک تنہا گوشہ شناوری اور آب تنی کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

شریف کو اب تک یاد تھا کہ ایک روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں حبس ہو رہا تھا اور سمندر میں غیر معمولی تلاطم تھا۔ وہ دونوں ساحل کی سیر کر رہے تھے کہ محسن نے حسبِ معمول کپڑے اتارے اور پانی میں اتر گیا۔ شریف نے اُسے بہت روکا مگر محسن نے ایک نہ سنی۔ اسے اپنی شناوری پر گھمنڈ تھا۔

شریف کے چہرے پر خوف و ہراس اور منت و عاجزی کے جو آثار ہویدا تھے، انہیں دیکھ کر وہ اور بھی مچل گیا اور شریف کا مذاق اڑانے لگا کہ وہ یونہی پانی سے ڈر رہا ہے۔ آخر اس نے بچگانہ بے اعتنائی سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے سفید لاغر بازو جن پر نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں، موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے اسے ساحل سے بہت دور لے گئے۔ پانی کی سطح آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی اور شریف نہایت پریشانی کے عالم میں ایک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر محسن پر پڑی۔ اس کا ہاتھ شریف کی طرف اٹھا تھا۔ وہ ایک ایسی آواز میں جو خوابوں میں سنائی دیتی تھی، چلا رہا تھا:

"آؤ... آ... ؤ"

مگر محسن سے کچھ بھی تو بن نہ پڑا۔ وہ شناوری سے ناآشنا تھا اور پاس کوئی ایسا شخص بھی نہ تھا جو اس کی مدد کر سکتا۔ اس نے پہلے سوچا کہ شاید محسن کو شرارت سوجھی ہے۔ وہ منہ کھولے تذبذب کے عالم میں محسن کو دیکھ رہا تھا۔ محسن نے نہایت مایوسی سے ایک بار پھر ہاتھ پاؤں مارے، غیر معمولی کوشش سے اپنا بازو بلند کیا اور پھٹی ہوئی آواز میں پکارا:۔ آؤ... آ... ؤ!" اور غرق ہو گیا۔ پانی اسے بہا لے گیا اور موجیں باہم پیچ و تاب کھانے لگیں۔

شریف حیران پریشان بت بنا کھڑا سمندر کی سب موجوں کے تلاطم کو دیکھتا رہا۔ خوف و ہراس نے اس کے تمام قواء سلب کر لیے۔ وہ نہ تو کوئی حرکت کر سکتا تھا اور نہ کچھ سوچ سکتا تھا۔ بس سمندر کی پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہروں کو گھورے جا رہا تھا۔ لہروں کا پیچ و تاب برابر بڑھ رہا تھا۔ وہ کبھی بلند ہوتی تھیں اور کبھی گر جاتیں۔ سطحِ آب پر سفید جھاگ جمع ہو رہا تھا۔ اب پانی ساحل کی ریت تک جہاں شریف کھڑا تھا، چڑھ آیا اور لہریں اس کے پیروں تلے ریت پر اُگی ہوئی جھاڑیوں سے ٹکرانے لگیں۔ پھر کالی گھٹا آئی اور بارش شروع ہو گئی۔

شریف غیر ارادی طور پر مڑا اور بھاری قدم اٹھاتا جنگل کی طرف بڑھا۔ اس کے حواس قائم نہ تھے۔ البتہ کوئی غیر مرئی مافوق الفطرت قوت اسے اس قدر احساس دلا رہی تھی کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس تاریکی میں ایک بھیانک آواز بار بار اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہی تھی:

"تو پست ہے، تو مجرم ہے، تو قاتل ہے؟"

اس وقت اسے موت ایک نہایت ہی فطری اور سہل شے معلوم ہوئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک مضحکہ خیز فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ابھی چار پانچ گھنٹے پہلے اس نے محسن کے ساتھ باغیچے میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اس وقت وہ خوش باش اور دل ربا معلوم ہوتا تھا۔ وہ دیگچی سے کس لذت اور بھوک کے ساتھ کھرچن کرید کرید کر کھا رہا تھا اور پھر وہ کس بچگانہ معصومیت کے ساتھ وہیں سبزہ زار پر لیٹ گیا اور اپنے گھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"میری بیوی حاملہ ہے لیکن ایک مدت سے اس کا خط نہیں آیا۔ میں سفر کی تکان اور ملیریا کے خوف سے اسے تہران ہی میں چھوڑ آیا تھا۔"

اس وقت وہ کس قدر سنجیدہ تھا۔ اس نے ایسی سنجیدہ گفتگو پہلے کبھی نہ کی تھی۔ وہ اپنے مستقبل کے عزائم کا ذکر کر رہا تھا اور اب وہ ایک بجھی ہوئی شمع کی طرح خاموش ہو گیا تھا! مر گیا تھا! کیا یہ حقیقت تھی؟ کیا یہ خواب نہ تھا؟ کیا واقعی وہ مر چکا؟ اب سمندر کے ساحل پر صرف کوؤں کا ایک غول رہ گیا ہے جو بارش میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ شریف نے پہلی مرتبہ اپنے دل سے کہا:

"عجیب اتفاق ہے"۔

دو دن تک شریف کو ظاہری دنیا بے رنگ اور دھندلی دھندلی نظر آتی رہی۔ وہ ہر شے کو کہر کے پردے میں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ نیند اڑ گئی تھی۔ بھوک جاتی رہی تھی۔ بے چین دل کو قرار نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا موت ایسی آسانی سے آ سکتی ہے؟ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح مر جائے اور چند گھنٹے بعد سمندر کی متلاطم موجیں اس کے بے جان جسم کو بے کار اور بے مصرف شے سمجھ کر دور ساحل پر پھینک دیں اور اپنا دردناک اور بھیانک راگ الاپتی رہیں۔ ایک غیر مرئی قوت اُسے سمندر کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی زندگی تمام موہوم آرزوئیں لیے غرق ہو جائے۔ سمندر کی موجیں اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھیں:

"آؤ... آ... ؤ!"

سمندر کا سیاہ پانی اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ لیکن ایک اور آواز اس سے بار بار کہہ رہی تھی:

"تو پست ہے! تو مجرم ہے! تو قاتل ہے!"

اس عظیم حادثے کا نقش شریف کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ اس کی تمام تر جزئیات اب تک ذہن میں محفوظ تھیں بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی انہی جزئیات کا ایک حصہ ہو۔ وہ جب بھی محسن کی گھڑی دیکھتا، ماضی کے تمام

www.urdugem.com

واقعات اس کی نظروں میں پھر جاتے۔ یہ گھڑی محسن نے حادثے سے چند دن پہلے دی تھی کہ کسی گھڑی ساز سے اس کی مرمت کروادے۔ اتفاق سے وہ گھڑی اس کی جیب میں رہ گئی۔ اب وہ ایک مقدس امانت کی طرح اس کے پاس تھی۔

اس حادثے کے بعد شریف نے ملازمت ترک کردی اور تہران چلا آیا۔ یہاں اس نے محسن کے بیوی بچوں کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر اُن کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مسرور ایام سے یہ خیالات اس کے دل سے محو ہوگئے تھے لیکن اب مجید کی غیر متوقع آمد نے اسے ازسرنو متاثر کیا اور حادثے کی یاد کو نئی اور پہلے سے زیادہ دردناک زندگی بخش دی۔ اب اس کے مرحوم دوست کا گوشت و پوست سے بنا ہوا زندہ ہمزاد اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ کسے معلوم یہ ہمزاد نہیں خود محسن ہی ہو؟

شریف نے محسن کو اس عمر میں اسی حلیے میں اور اسی قدو قامت میں دیکھا تھا۔ شریف کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے محسن مرا نہیں، اس کی روح نوجوان کے جسم میں تحلیل ہوگئی تھی۔ کیا یہ امر حیات جاودانی کا ثبوت نہیں؟ جس شے کو لوگ حیات ابدی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، کیا وہ ارواح کی یہی بازگشت اور تبدیلی قالب نہیں؟ اگر ایسا ہے تو محسن مرا نہیں زندہ ہے۔

شریف کو خیال آیا کہ محسن اب تک زندہ ہے، مگر میں ہمیشہ کے لیے مر گیا ہوں کیونکہ میری کوئی اولاد نہیں۔ میری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہوگئی کہ اب وہ میرے مثل کے کسی جسم میں حلول نہ کرے گی۔ اس خیال سے اسے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ جسمانی اور روحانی طور پر بالکل نیست و نابود ہو جائے گا۔ گھڑی کی سوئی ان لمحات کا شمار کر رہی تھی جن سے گزر کر وہ نیستی اور فنا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ایک رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح جلد بیدار ہوگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھکا ماندہ ہے۔ کمر اور ٹانگوں میں درد ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا، آئینے کے سامنے جا کر اپنی صورت پر ایک نگاہ ڈالی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے کی جھریاں گہری ہوگئی تھیں۔ بال پریشان تھے۔ وہ دبے پاؤں مہمانوں کے کمرے کی طرف گیا اور مجید کو دیکھا جو گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچگانہ معصومیت برس رہی تھی۔ پسینے کے قطرے پیشانی پر چمک رہے تھے۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی چادر سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر شریف کو یوں محسوس ہوا جیسے ستائش کے لائق کوئی روحانی وجود نظروں کے سامنے جلوہ گر ہے۔

معمول کے مطابق شریف نے حوض کے کنارے بید کے درخت تلے ناشتے کا اہتمام کیا۔ ابھی چائے پی رہا تھا کہ مجید آیا اور ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد شریف نے گفتگو کے لیے کوئی موضوع تلاش کرتے ہوئے پوچھا ”کیا تمہارے پاس گھڑی ہے؟“

منفی جواب پا کر اس نے وہی گھڑی جو کبھی محسن نے مرمت کروانے کے لیے اسے دی تھی، نکالی اور بولا ”یہ گھڑی تمہارے مرحوم والد کی امانت ہے جو میرے پاس رہ گئی تھی۔ یہ لے لو۔“

مجید نے اس پر سرسری سی نگاہ ڈالی۔ چند لمحوں کے لیے مسرت کی چمک اس کی آنکھوں میں پیدا ہوئی۔ پھر اس نے شکریہ ادا کیے بغیر گھڑی جیب میں رکھ لی۔ شریف زیر چشم اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنا عہد شباب یاد آ رہا تھا۔ اپنی گم شدہ دنیا یاد آ رہی تھی۔

جس میں اس نے خواب کے سے عالم میں محسن کے ساتھ زندگی کے حسین ایام گزارے تھے۔ فراموش نشدنی ایام

کی تمام تفصیلات اس کی نظروں میں پھر رہی تھیں۔ مجید کی تمام حرکات و سکنات حتیٰ کہ روٹی توڑنے کے انداز میں بھی اُسے محسن کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ مجید محسن ہی کا نقش ثانی تھا۔ پھر اس نے جیب سے وہ تصویر نکالی جو اس نے رات اپنی البم میں سے نکالی تھی۔ اس نے یہ تصویر مجید کو دی اور کہا ”یہ تصویر تمہارے مرحوم والد کے ساتھ ایک گارڈن پارٹی میں اتاری تھی۔ تب میرے سر کے بال گرنے شروع نہیں ہوئے تھے!“

مجید نے بے اعتنائی سے تصویر پر نگاہ ڈالی جیسے کسی بیگانے اور اجنبی کی تصویر دیکھ رہا ہو۔ پھر تصویر زمین پر رکھ دی اور اور ایک اچٹتی نگاہ شریف پر ڈالی۔ وہ اس سے پہلے شریف کے گنجے سر کی طرف متوجہ نہ ہوا تھا۔ شریف نے تصویر اٹھالی اور مجید کے ساتھ دفتر چلا گیا۔

❁❁

شریف کی زندگی کے دو اگلے ہفتے مصروفیت میں گزرے۔ اس دوران اس نے مسلسل محنت اور بے تکان کاوش سے مجید کو دفتر کے تمام کام اور محاسبات کے تمام گُر سمجھا دیے۔ مجید دفتر میں سب لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اب شریف کی دفتری اور نجی زندگی میں تغیرات رونما ہوگئے۔ وہ دفتر کا کام نہایت مستعدی اور گرم جوشی سے کرتا تھا اور کاغذات کو نہایت توجہ اور غور سے دیکھتا۔ ہر ہفتے جب وہ آبادہ کے نواحی دیہات کے دورے پر جاتا تو مجید کو اپنے خاص معتمد کی حیثیت سے ساتھ رکھتا۔ گھر میں بھی وہ غلام رضا کے کام میں مین میخ نہ نکالتا۔ اس کی حد سے بڑھی نفاست ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ ہر گلاس میں پانی پی لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے ایک بار پھر زندگی سے سمجھوتہ کرلیا ہو۔ اب وہ خوب ڈٹ کر غذا کھاتا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اسے اپنی گم شدہ زندگی دوبارہ مل گئی تھی، وہ بھی اس وقت جب اپنے حالات سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

مجید رات کو نہایت لاابالیانہ انداز میں گھر لوٹتا۔ نہایت بے تکلفی سے کھانا کھاتا اور رات گئے تک شریف کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا یا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا۔ جب وہ سونے جاتا، شریف پدرانہ محبت و شفقت کے ساتھ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا۔ اس کی تنہا، غیر تغیر یکساں اور بیزار کن زندگی میں ایک عجیب کیف، عجیب رنگینی اور گہرائی پیدا ہوگئی تھی جس کا سفلی عوالم سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ اپنی طبیعت میں عجیب سکون، راحت، سیری اور عجیب استغنا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس عالم میں وہ ایک شفیق باپ کی طرح مجید کی پرستش کرتا۔ وہ مجید کی سرپرستی، بزرگداشت راہنمائی اور تربیت کو اپنا مقدس فریضہ سمجھتا۔ وہ اُسے اپنا بیٹا لگنے لگا تھا۔

❁❁

گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک روز آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھی۔ اس روز شریف کو دفتر میں بہت ضروری کام کرنے تھے۔ افیون کی تحدید کا نگران مرکز سے آیا ہوا تھا اور دوسری طرف اسے دفتری عملے کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی۔ اس لیے وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر نہ جا سکا، غلام رضا کے ذریعے دفتر ہی میں منگوالیا۔ کھانا کھاتے ہی وہ پھر سرکاری کام میں لگ گیا۔ دو ایک بار اس نے مجید کو بھی طلب کیا مگر وہ دفتر نہیں آیا تھا۔

آسمان شفق کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ غلام رضا ہانپتا کانپتا دفتر آیا اور زبردستی اجلاس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ یوں اترا ہوا تھا کہ شریف کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے بولا: ”کیا ہوا؟“

”آقا!... آقائے مجید خان حوض میں ڈوب گئے۔ میں جب آپ کو کھانا دے کر گھر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا لیکن جب کسی نے دروازہ نہ

www.urdugem.com

کھولا تو ساتھ کے گھر سے کود کر اندر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آقائے مجید خان کی نعش حوض میں تیر رہی تھی۔"

شریف کا حلق سوکھ گیا۔ اس کے حزحزہ کو حرکت ہوئی اور اس نے نہایت گلوگیر آواز میں پوچھا "تو پھر ڈاکٹر..... تو نے ڈاکٹر کو نہیں بلایا!"

"آقا... کام تمام ہو چکا تھا۔ ان کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا پڑا تھا... میں نے نعش کو حوض میں سے نکالا اور ایوان میں لے گیا۔"

شریف کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ تاریکی چھا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں بھیگی سوئی زمین اور ڈھلے ہوئے پتوں کی بو پھیل رہی تھی..... شریف سڑکیں اور چوراہے عبور کرتا چلا جا رہا تھا۔ غلام رضا نہایت خاموشی سے ایک سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ گھر کے چاروں دروازے کھلے تھے اور دالان میں گیس کا لیمپ روشن تھا۔ مجید کی لاش وہیں رکھی تھی۔ اس پر ایک سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے سر کے الجھے بال چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا بدن اکڑا ہوا ہو۔

شریف دالان کے باہر ہی بارش میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہ حوض پر پڑی۔ لیمپ کی روشنی میں بارش کے قطرے نیلگوں پانی پر یوں گر رہے تھے جیسے آسمان پر ننھے ننھے ستارے ٹوٹ رہے ہوں۔ شریف انہیں بے حس و حرکت کھڑا گھورتا رہا۔ یہ وہی حوض تھا جس کے کنارے بید تلے اس نے مجید کے ساتھ اپنی زندگی کے نہایت کیف آور اور مسرّت آفریں لمحات گزارے تھے۔

مجید کے آنے سے پہلے شہر میں اس کی زندگی دفتر کی میز، کھانے کے دسترخوان، بید کے درخت، تریاک نوشی، اور سدھائے ہوئے تیتر تک محدود تھی۔ یہ زندگی کس قدر پست، بے پردہ اور مضحکہ خیز تھی۔ لیکن مجید نے آ کر اس زندگی میں نئے معانی، نیا ولولہ اور جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔

شریف کی نگاہیں حوض پر جمی تھیں مگر پانی میں جو انسانی ہیکل ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، وہ کون تھا؟ وہ چشم تصور سے مجید کو دیکھ رہا تھا کہ اپنا سفید لاغر بازو جس پر نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں اوپر اٹھائے پکار رہا ہے:!

"آؤ... آؤ... آ... ؤ"

کس قدر دردناک اور جاں گزار تھی یہ آواز! شریف کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ نہایت بے اعتنائی سے جس راہ سے آیا تھا، لوٹ گیا۔ وہ اپنے ہاتھ پشت پر باندھے بارش ہی میں گھر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ محسن کی موت پر جو عالم اس پر طاری ہوا تھا، اب مجید کی موت پر پھر عود کر آیا۔ وہ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہا تھا:

"عجیب اتفاق ہے!"

بارش زیادہ تند ہو گئی تھی مگر اسے اس کا قطعاً احساس نہ تھا۔ وہ مازندران کی بھولی بسری یادوں میں محو تھا۔ ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش کہر اور تاریکی میں سے ابھر کر اس کے تخیل کے پردے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ ایک بھیانک آواز اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل رہی تھی

"تو پست ہے! تو مجرم ہے! تو قاتل ہے!"

وہ یہ عزم مصمم کر کے گھر سے باہر نکلا تھا کہ کبھی وہاں نہیں لوٹے گا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک موہوم دنیا میں سانس لے رہا ہے اور اب اپنے ماضی اور حال سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ سب حادثات، یہ عجیب اتفاقات اب اس کی زندگی سے خارج ہو گئے ہیں۔ اب موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ بارش نے اس کے گرد و پیش تار بُن دیے تھے۔ شریف ایک بھٹکی روح کے مانند بارش میں خاموش و غمناک گلی کوچوں میں گشت کرتا کہیں دور جا رہا تھا۔

نفسیات

ارم ناز

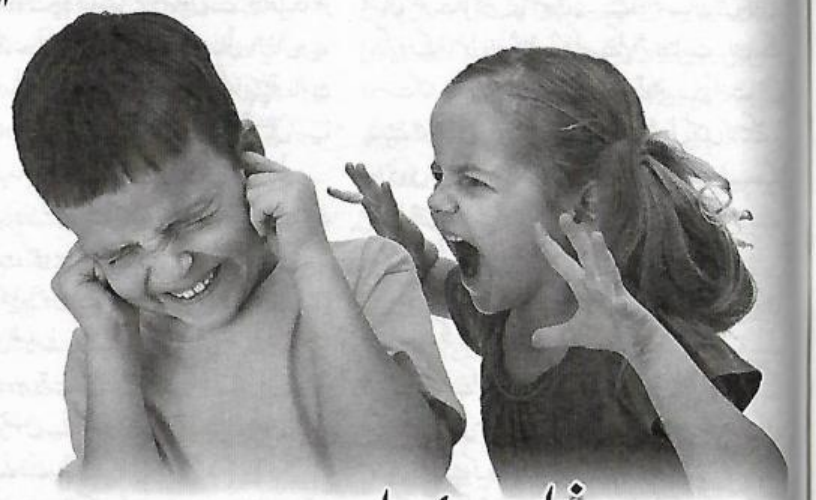

فطری طور پر انسان اچھا ہے یا بُرا؟

سائنسی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ایک اہم سوال کا شافی جواب

رات کا سناٹا ہر سو پھیلا ہوا تھا، ۲۳ سالہ محقق ربر تیمی جو ییل یونیورسٹی میں بچوں کی اخلاقیات پر تحقیق کرتے تھے، اپنے دوست کے ساتھ کھانے کے بعد پیدل اپارٹمنٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی وہ فلیٹ سے دور ہی تھے جب انھیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک تاریک موڑ پر سخت رسی تیمی کے گلے میں ڈال کر کھینچی گئی۔ وہ رسی گلے سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ تبھی سات نوعمر لڑکوں کا ایک گروہ اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا اور انھیں گھیرے میں لے لیا۔

وہ مدد کے لیے چیخنے کی کوشش کرنے لگے مگر لڑکوں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ہر طرف سے ان پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ اسی دوران ایک نے چاقو نکالا اور تیمی کو محسوس ہوا جیسے ان کا جسم کاٹا جا رہا ہے۔ جب وہ ان کو زدوکوب کرتے تھک گئے تو ساری قیمتی چیزیں لے کر چلتے بنے اور تیمی کو درد میں تڑپتا چھوڑ گئے۔

www.urdugem.com

زخمی حالت میں جب انھیں اسپتال پہنچایا گیا تو ان کا سنہ صرف بایاں بازو ٹوٹ چکا تھا بلکہ جسم بھی زخموں سے چور تھا۔ ڈاکٹر نے ٹوٹا بازو جوڑنے کے لیے اس میں دھاتی راڈ ڈال دیا۔ اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ واپس گھر پہنچے تو حالت ان بچوں جیسی ہو چکی تھی جن پر وہ ییل یونیورسٹی میں تحقیق کیا کرتے تھے۔ ماں ان کا منہ ہاتھ دھلاتی اور بہن کھانا کھلاتی۔

ان دنوں وہ اکثر سوچا کرتے، اتنے کم عمر بچے برے کیسے ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی پر اتنا تشدد کریں اور مرنے کے لیے چھوڑ دیں؟ کیا ماحول نے ان لڑکوں کو غنڈہ، بدمعاش بنایا یا وہ فطرتاً ایسی طبیعت رکھتے تھے؟ کیا انسان فطری طور پر برا ہے یا اچھا؟ وہ ہر وقت انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہتے۔ تب انھوں نے انسان کے اچھا یا برا ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے تحقیق کا آغاز کر دیا۔

بنیادی طور پر یہ سوال تقریباً ہر دور میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا انسان فطری طور پر اچھا ہے یا برا؟ ہزاروں سال قبل مختلف فلسفیوں نے بھی اس بات پر بحث کی ہے کہ آیا انسان بنیادی طور پر اچھی فطرت رکھتا ہے جو معاشرے کے رنگ ڈھنگ سے خراب ہو جاتی ہے یا پھر وہ بری فطرت لیے جنم لیتا ہے۔

عیسائی بزرگ آگسٹائن کے نظریے کی رُو سے تمام انسان کمزور اور خود غرض پیدا ہوتے ہیں جن کو صرف اللہ کی طاقت ہی برائی سے بچا سکتی ہے۔ مشہور فلسفی ہوبز بھی یہی کہتا ہے کہ انسان بے رحمانہ حد تک خود غرض ہے لیکن اس کو خدائی طاقت نہیں بلکہ معاشرتی قوانین کے ذریعے برائی سے بچایا جا سکتا ہے۔ ان کے برعکس ممتاز فلسفی روسو کا کہنا ہے کہ انسان نہ صرف فطری طور پر اچھا ہے بلکہ اس میں فلاحی کاموں کا جذبہ بھی موجود ہے۔

جدید نفسیات کہتی ہے کہ انسان کی فطرت کے بارے میں جاننے کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی انسانی خصوصیات کو جانچا جائے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم بچوں کی طرف دیکھیں اور ان کی نفسیات کا تجزیہ کریں کیونکہ ان کے اذہان انسانی فطرت کا بہترین مظہر ہیں۔ بچے وہ انسان ہیں جن پر اردگرد کے ماحول اور ثقافت کا کم سے کم اثر ہوتا ہے۔ ان کے دوست نہیں ہوتے، وہ اسکول نہیں جاتے اور نہ ہی کتابیں پڑھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنے تاثرات بھی کنٹرول نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ہی زبان بولتے ہیں۔ ذہن معصوم اور فطرت کے قریب ترین ہوتے ہیں اس لیے ان پر تجربات کی مدد سے انسانی دماغ کی اچھی یا بری فطرت کو پرکھا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں امریکا کی ییل (Yale) یونیورسٹی میں بچوں پر فکر انگیز تجربات کیے گئے۔ ان کے نتائج بتاتے ہیں کہ سب سے کم عمر انسانوں یعنی بچوں میں بھی فطری طور پر صحیح اور غلط کا احساس موجود ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان میں یہ صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے کہ وہ اچھائی کو برائی پر ترجیح دیں۔

ایک کٹھ پتلی شو میں بچوں کے سامنے مختصر کھیل پیش کیا گیا۔ ایک کٹھ پتلی پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرتی مگر ہر بار گر جاتی۔ دوسری کٹھ پتلی چڑھائی میں اس کی مدد کرنے لگی۔ جبکہ تیسری اُسے روکتی رہی۔ شو میں کٹھ پتلیوں نے کوئی بات نہیں کی، صرف حرکات انجام دیتی رہیں۔ خاتمہ شو کے بعد بچوں نے اس کٹھ پتلی کو سب سے زیادہ پسند کیا جو پہلی کٹھ پتلی کی مدد کر رہی تھی۔

اس تجربے سے عیاں ہوا کہ بچوں نے کٹھ پتلیوں کی حرکات کو بے معنی نہیں بامقصد سمجھا نیز اپنے اس فطری جذبے کا اظہار کیا کہ کسی کی مدد کرنا اچھا کام ہے۔

نتائج کی مزید تصدیق کرنے کے لیے محققین نے ایک اور تجربہ کیا۔ بچوں کو ایک دوسرا منظر دکھایا گیا جس میں پہاڑی پر چڑھنے والی کٹھ پتلی کے سامنے اختیار رکھا گیا کہ یا تو وہ مدد کرنے والی کٹھ پتلی کے پاس جائے یا پھر رکاوٹ ڈالنے والی کے۔ اگر وہ مدد کرنے والی کٹھ پتلی کے پاس جاتی تو بچوں کے نزدیک یہ اچھا عمل ہونا تھا جس کے متعلق انھوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

یہ نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ بچوں نے کٹھ پتلیوں کی حرکت سے نہ صرف تحریک لی بلکہ اچھائی کو برائی پر ترجیح بھی دی۔ بچے کیونکہ خود بھی اچھائی میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے دوسروں سے بھی اسی طرح کی امید رکھتے ہیں۔

تجربات و مشاہدات ظاہر کرتے ہیں کہ بچے فطری طور پر اچھائی کو پسند کرتے اور اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نفسیات دانوں میں یہ بحث بھی شروع ہو گئی کہ کیا بڑوں میں بھی یہ جذبہ قدرتی طور پر موجود ہے یا نہیں؟ ہارورڈ یونیورسٹی کے سائیکالوجسٹ نے اس حوالے سے تجربات کیے کہ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں ہمارا وجدان یا خود کار نظام ہمیں خود غرضی سے کام کرنے کو کہتا ہے یا دوسروں سے تعاون کر کے مل جل کر کام کرنے کو؟ نتائج انھوں نے دو طریقوں... وجدان اور ردعمل سے جانچے۔

پہلے وضاحت کرتے چلیں کہ وجدان اور ردعمل کے نظام ہیں کیا؟ وجدان وہ خود کار اور قدرتی نظام ہے جو کسی بھی وجوہ کے وقوع پزیر ہونے پر بغیر سوچے سمجھے اور کوشش کے، آسانی سے ہمارے اعمال کی راہنمائی کرتا ہے۔ دوسری طرف ردعمل وہ نظام یا سوچ ہے جو ہم کسی بھی معاملے کے حوالے سے اپنے پورے ہوش و حواس میں رہ کر ممکنہ طرز عمل، فوائد و نقصان کا جائزہ لے کر اور منطقانہ طور پر ظاہر کرتے ہیں۔

ہارورڈ اور ییل یونیورسٹی کے ماہرینِ نفسیات کے ایک گروہ نے ۸۳۴ افراد پر تجربہ کیا جس میں عام لوگوں اور انڈر گریجویٹ طلبہ کو برابر تعداد میں شامل کیا گیا۔ اس تجربے میں طلبہ سے انفرادی اور اجتماعی فیصلہ سازی کے حوالے سے کچھ سوالات پوچھے گئے۔ ان سوالات کے جوابات فوری طور پر دینے تھے۔ تجربے کے بعد حیران کن نتائج سامنے آئے۔ جن طلبہ نے وجدان پر عمل کرتے ہوئے وقت ضائع کیے بغیر فوراً جواب دیے انھوں نے اچھے اور دوسروں کی مدد کرنے والے فیصلے کیے۔ جنہوں نے ردعمل کے نظام پر عمل کیا اور سوچ کر دیر سے جواب دیے، ان کے فیصلوں میں خود غرضی اور ذاتی اغراض و مقاصد اجتماعی فوائد کی نسبت زیادہ تھے۔ ان نتائج نے ثابت کیا کہ انسان فطری طور پر اچھا ہے کیونکہ فوری جوابات میں انسان کا خود کار نظام وجدان یا الہام کارفرما ہوتا ہے اور دیر سے سوچ کر کرنے والے فیصلوں میں ردعمل۔

ان تجربات کے بعد یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ مانا انسان فطری طور پر اچھا ہے لیکن اس ماحول کے کیا اثرات ہیں جس میں رہ کر وہ پرورش پاتا، پروان چڑھتا ہے۔

سائنسدانوں نے ۷ مزید تجربات کیے جس میں ۲۰۶۸ افراد نے شرکت کی۔ ان کے نتائج نے افشا کیا کہ ہم انسان ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہمارے دوست ہیں اور عزیز رشتے دار بھی۔ ان سے داد و تحسین حاصل کرنے کے لیے ہم اچھے کام کرتے ہیں اور برے بھی۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارا حلقہ احباب ہمیں پسند کرے۔ اس لیے انسان نہ تو فطری طور پر برا ہے اور نہ ہی اچھا۔ وہ دوسروں کی مدد صرف اس لیے کرتا ہے کہ لوگ اس کو اچھا سمجھیں۔ یہ دوسروں کی طرف سے ملنے والی پزیرائی ہی ہے جو انسان کو اچھا یا برا بنا دیتی ہے۔ پھر یہی خاصیت اس کی ذات کا حصہ بن جاتی ہے۔

سائنس نے جن حقائق کو اب تجربات کی روشنی میں ثابت کیا قرآن مجید نے انھیں ۱۴ سو سال پہلے بیان کر دیا تھا۔ بحیثیت مسلمان بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیے ہیں اور فطری طور پر اچھائی و برائی کا احساس دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ خیر و شر کا شعور انسان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ اس کی بدولت وہ نیکی اور بدی کا اسی طرح ادراک کرتا ہے جیسے سمع و بصر سے اشیاء کو پہچانتا ہے۔

انسان اپنی فطرت پہچانتے ہوئے نیکی اور اچھائی کی راہ اختیار کر دوسروں کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرتا یا پھر بری صحبت میں مبتلا ہو کر سب کے لیے پریشانیوں اور تکالیف کا باعث بنتا ہے... یہ فیصلہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔

www.urdugem.com

حمزہ کامران

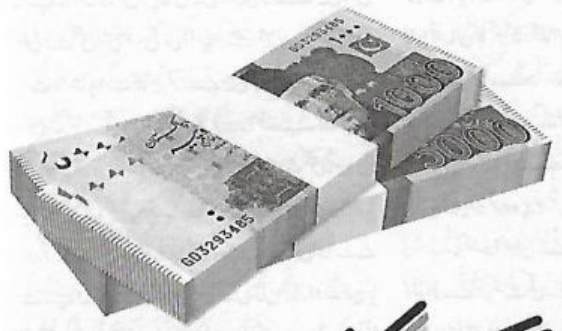

گھر کا بھیدی

جب بھی اُسے قوتِ گویائی ملی،
اُس کی گواہی سبھی کے پول کھول دے گی

وہ بہت تھک چکا تھا اور اس کا تھکنا بنتا بھی تھا۔ اس نے کیا کیا نہیں دیکھا تھا۔ ماضی نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اس کا یہ بڑھاپا بدن کے داغوں سے عیاں تھا۔ زندگی کا ہر تجربہ اس پر اپنا نشاں چھوڑ گیا تھا۔ چاہے وہ آستین پر موجود گریس کا دھبہ ہو یا جسم سے اٹھتی بدبو، اپنے کپڑوں کی گہری سلوٹیں ہوں یا ٹانگ پر آئے زخم، چھلنی کیے ہوئے ہاتھ ہوں یا چہرے پر پڑی گرد، ہر چوٹ ایک داستان رقم کیے ہوئے تھی۔ وہ بھی ان داستانوں کا بوجھ اٹھائے ماضی کی کتاب میں کھو چکا تھا۔

''سیٹھ صاحب! اب تو عدالت سے آرڈر آنے والا ہے۔ مجھے تو یہی ڈر ہے کہ اگر فیصلہ آپ کے خلاف آیا تو پھر مجھے یہ چمڑے کی فیکٹری مجبوراً بند کرنی پڑے گی۔'' ڈی آئی جی صاحب نے سیٹھ کی بڑی بڑی موچھوں سے تائب ہو کر دبی آواز میں کہا۔

سیٹھ کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا۔ وہ بولا ''کیسی بات کر رہے ہیں ڈی آئی جی صاحب! یہ میڈیا والے تو پاگل ہو گئے ہیں۔ انھیں میری چمڑے کی فیکٹریوں سے شہر میں کینسر ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے! اب آپ ہی بتائیں، فیکٹری کے گند کو دریا میں نا پھینکوں تو کیا چوک پر سجاؤں؟ یہ کسی نے سوچا ہے کہ اس طرح فیکٹریاں بند ہونے لگیں تو ملازموں کے گھر کے چولہے کیسے جلیں گے؟'' سیٹھ صاحب نے اپنا پرانا پتا پھینکا۔

''بات تو آپ کی درست ہے سیٹھ صاحب، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ عدالت میں جان پہچان سے مجھے پتا چلا ہے، آپ کے خلاف کیس بہت مضبوط ہے۔ معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے کچھ خرچہ کرنا پڑے گا۔'' ڈی آئی جی صاحب نے آنکھیں گھماتے ہوئے دل کی بات کر ڈالی۔

سیٹھ صاحب کو بھی اندازہ تھا کہ پانی سر سے گزر رہا ہے۔ اس نے ڈی آئی جی کی خواہش کے مطابق تواضع کی اور آئندہ تعاون کی بھی یقین دہانی کروائی۔

''وہ'' بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس جگہ چربی جلنے سے اتنا تعفن پھیل چکا تھا کہ لباس میں بھی یہ بدبو رچ بس گئی اور آج تک کم نہیں ہوئی۔ ابھی ''اس'' کی عمر ہی کیا تھی مگر یہ دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا، لیکن ''وہ'' سمجھ گیا کہ اسے ابھی بہت کچھ برداشت کرنا ہے۔

اچانک ''اس'' کے چھلنی ہاتھوں کی ٹیس اسے خیالوں کی دنیا سے واپس لے آئی۔ یہ سوراخ کبھی نہ بھرنے والے سوراخ تھے۔ اصل زخم تو اس کے دل پر آئے تھے جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماضی کی گرد نے اس کے زخم دھندلا دیے۔

''مس رابعہ، پلیز تشریف رکھیں۔'' مس سارا نے رابعہ کے انداز کو نظروں میں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ مس سارا ملک کی سب سے بڑی این جی او کی مالک تھی۔ اس کے دفتر کی اٹالین سجاوٹ اس بات کی غماز تھی۔ اس نے رابعہ کو ملک کی بہترین یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ دیکھ کر اکاؤنٹنٹ کے طور پر ملازمت دی تھی لیکن رابعہ کا رویہ اس کے لیے پریشان کن تھا۔

''مس رابعہ، میں آپ کے تعلیمی ریکارڈ سے بہت متاثر ہوں۔ مگر آپ جانتی ہوں گی کہ اصل دنیا میں بہت سے کام مختلف انداز میں ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ ادارہ بہت محنت سے اور ایک عظیم مقصد کے لیے بنایا ہے۔ یہ ادارہ دوسروں کے صدقات پر چلتا ہے جو کبھی بھی بند ہو سکتے ہیں۔ یہ بات سمجھتے ہوئے ہم نے ادارے کو مستحکم بنانے کے لیے کچھ رقم سے سرمایہ کاری کی ہے تاکہ حاصل شدہ منافع ادارے کے خرچے پورے کرتا رہے۔ مگر مجھے علم ہوا ہے کہ آپ کو اس نظام سے کوئی شکایت ہے؟'' مس سارا نے اپنی آواز حد درجہ نرم رکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

''میڈم، مجھے صرف یہ بات چبھ رہی ہے کہ این جی او ہونے کی وجہ سے ہمیں مختلف قوانین سے چھوٹ ہوتی ہے۔ اس طرح رقم باہر بھیجنا ''منی لانڈرنگ'' کے زمرے میں آسکتا ہے۔ رابعہ مس سارا کی بارعب شخصیت سے متاثر ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

مس سارا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بولی ''آپ کے اندیشے میں سمجھ سکتی ہوں لیکن آپ خاطر جمع رکھیں۔ جب ہماری نیت صاف ہے تو کسی دوسرے کو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس سے ہمارے ادارے کی سلامتی اور اس پر انحصار کرنے والے خاندانوں کی بقا منسلک ہے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نہیں تو کوئی دوسرا اس ادارے کی خدمت کے لیے آجائے گا لیکن ہمارے معاشرے میں خاتون ہونے کے ناتے اس سے بہتر اور پروقار نوکری آپ کو دوبارہ نہیں مل سکے گی۔'' مس سارا نے ڈھکے چھپے الفاظ میں رابعہ کو دھمکی دی۔

اس نے بات بگڑتے دیکھ کر معافی مانگنے میں ہی اپنی عافیت جانی اور مس سارا کو رقم سے بھرا ہوا خاکی لفافہ پیش کر دیا جو اس نے بینک سے منگوایا تھا۔

''وہ'' اندھیرے میں لیٹا یہ سب سن رہا تھا۔ اس کے ہاتھ چھلنی ہو چکے تھے لیکن جو تکلیف یہ باتیں سن کر اسے پہنچی تھی، وہ اس کے ہاتھوں کی ٹیس سے کہیں زیادہ تھی۔

یہ سب باتیں ''اسے'' بے چین کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں غم کی شدت سے آنسو ٹمٹمانے لگے۔ وہ اپنی آستین سے آنسو پونچھنے ہی لگا تھا کہ گریس کا دھبہ دیکھ کر رک گیا۔ یادوں کے سانپ نے اسے دوبارہ ڈس لیا تھا۔

''یار، انعام مستری کہاں ہے؟ اسے کہو کہ گاڑی کا تیل تبدیل کروانا ہے۔'' وکی اپنے دوست وقار کے ساتھ ایک اندھیری سی ورک شاپ میں داخل ہوتے ہی چیخ کر بولا۔

اس کا یہ مخصوص جملہ سن کر وہاں موجود سب لوگ زیر لب مسکرانے لگے۔ انعام مستری اپنے گریس والے ہاتھ قمیص سے صاف کرتا آگے بڑھا اور کہا ''کیا حال ہے وکی بابو! آج تو دوست کو بھی ساتھ لائے ہو۔ اعتماد والا ہے نا؟'' انعام نے وقار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

www.urdugem.com

وکی ہاتھ نچاتے ہوئے بولا ”ہاں یار، اپنا ہی بندہ ہے۔ لاؤ جلدی سے میرے امپورٹڈ کین تو لے کر آؤ۔ آج رات دوستوں کی دعوت ہے“، وکی نے آنکھ مارتے ہوئے انعام کے ہاتھ پر پیسے رکھے۔

انعام مستری نے جلدی جلدی پیسے گنے اور اندر سے لفافہ اٹھا لایا۔ ”یہ لو بابو۔ اِس دفعہ کا مال بہت خاص ہے۔ افغانستان سے سمگل کروائی ہے جو امریکی فوجیوں کے لیے جاتی ہے۔ ایک کین سے ہی دُھت ہو جاؤ گے“، انعام مستری نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

وکی نے پر جوش انداز میں لفافہ تھاما اور باہر نکل گیا۔ لیکن ”وہ“ ورک شاپ میں ہی رہ گیا تھا۔ ”اُس“ کا یہ سب دیکھ کر دم گھٹنے لگا مگر کسی کو پروا نہیں تھی۔ سب اپنے حال میں مست تھے۔

ایسے واقعات سے تو اس کی زندگی بھری پڑی تھی۔ ”اُس“ نے اپنی زندگی میں فرشتہ چہروں سے سجے شیطان بھی دیکھے اور گناہ گار بندوں کے اندر فرشتہ صفت بھی۔ وہ کڑھتا تھا مگر بول نہ پاتا۔ ابھی اسے بولنے کی صلاحیت نہیں ملی تھی کیونکہ ”وہ“ کرنسی نوٹ تھا۔ کبھی وہ مس سارا کے خاکی لفافہ میں پیوستہ پن سے لگا ہوتا تو کبھی انعام مستری کے گریس والے ہاتھوں میں موجود ہوتا۔ وہ گلی گلی چپہ چپہ گھوم چکا تھا۔ اس کا سینہ بہت سے راز سنبھالے ہوئے تھا، ایسے بھید کہ اگر کوئی چیز عام میں کھل جائیں تو بہتوں کو منہ چھپانے کی جگہ نہ ملے۔

مگر وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ جس دن اسے زبان مل گئی اور بولنے کی طاقت عطا ہوئی تو اس کی گواہی ان کے سارے پول کھول دے گی۔ کہیں آپ بھی تو اپنے کرنسی نوٹ کو بے زبان نہیں سمجھ رہے؟ ◆◆◆

عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے

کہتے ہیں کہ ایک جواں مرد کو جنگِ تاتار میں زخم لگا۔ وہ زخم اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ ایک ساتھی نے کہا کہ شہر کے فلاں دوکاندار کے پاس اس کی دوائی ہے، اگر تُو اس سے مانگے تو ہو سکتا ہے کہ دینے سے دریغ نہ کرے مگر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دوکاندار بڑا کنجوس مشہور ہے۔ سچ ہے کہ اگر اس کے دسترخوان پر روٹی کی بجائے سورج ہوتا تو قیامت تک دنیا میں کوئی روشن دن نہ دیکھ پاتا۔ ساتھی کی بات سن کر زخمی جواں مرد نے کہا اگر میں اس سے وہ دوائی مانگوں تو کیا معلوم وہ دے یا نہ دے اور اگر دے تو وہ دوا فائدہ کرے یا نہ کرے گویا کہ اس سے دوائی کا مانگنا زہرِ قاتل لینا ہے۔

کسی نے کیا خوب عقل کی بات کہی ہے کہ کمیوں سے خوشامد کر کے تو نے جو کچھ مانگ لیا بدن میں تو تُو نے اس کا فائدہ پایا لیکن روح کو تو نے گھٹا لیا۔ عقل مندوں کا بیان ہے کہ اگر آبِ حیات آبرو عزت کے بدلے بکتا تو کوئی عقل مند اسے ہرگز نہ خریدے گا۔ اس لیے کہ عزت سے مرنا ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ کسی عقل مند نے کیا خوب نکتہ بخشا ہے کہ اگر اچھی عادت والے کے ہاتھ سے تو کڑوی دوا لے کر پی لے یہ بہتر ہے بہ نسبت کسی بدمزاج کے ہاتھ سے میٹھی مٹھائی کھا کر مزہ اٹھانے سے۔

درسِ حیات:

1. کمینے اور کم ظرف آدمی کے ہاتھ سے کھانا پینا زہر کھانے کے برابر ہے۔
2. کمینہ کچھ دے کر طعنہ زنی کرے گا جس سے روح مجروح ہو جاتی ہے۔
3. کنجوس اور کم ظرف کا احسان لینا ضمیر کی موت کو قبول کرنا ہے۔
4. کسی کو اگر کچھ دو تو نہایت خندہ پیشانی سے۔
5. اگر کسی کو کچھ نہ دے سکو تو خندہ پیشانی سے معذرت کر لو تا کہ وہ مانگنے والے دکھی اور بددل ہو کر نہ جائیں۔

ابو صارم

مالدیپ میں گریٹ گیم

جیو پالیٹکس کے بطن سے جنم لینے والے سنسنی خیز ڈرامے کی رُوداد جو دو طاقتوں کو مدمقابل لے آیا

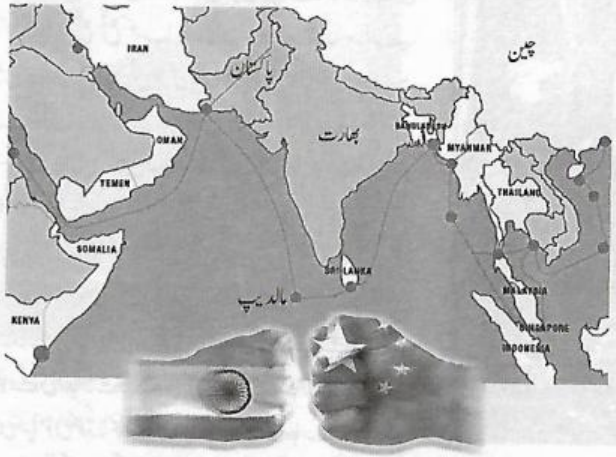

پچھلے دنوں براعظم ایشیا کا سب سے چھوٹا ملک مالدیپ عالمی قوتوں کی گریٹ گیم کے باعث مشکلات میں پھنس گیا۔ بھارت کے عین نیچے واقع یہ مملکت ہزار سے زائد جزائر کا مجموعہ ہے جن پر چار لاکھ ستائیس ہزار مرد و زن بستے ہیں۔ یہ سبھی مسلمان ہیں۔

مالدیپ اس لیے بھی مشہور ہے کہ یہ دنیا میں سب سے کم سطح مرتفع رکھتا ہے۔ ملک کا بلند ترین مقام سطح سمندر سے صرف سات فٹ دس انچ بلند ہے۔ جبکہ عام زمین صرف چار فٹ گیارہ انچ اونچائی رکھتی ہے۔ خیال ہے کہ عالمی گرماؤ (گلوبل وارمنگ) کے باعث سمندروں میں پانی بڑھتا رہا تو اگلے پچاس ساٹھ سال میں مالدیپ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔

یہ خوفناک تباہی تو دور ہے، فی الحال یہ ملک بڑی طاقتوں کی ارضی سیاست (جیو پالیٹکس) کا شکار بن چکا۔ اس ارضی سیاست کا تعلق دنیا کے بڑے سمندروں میں سے ایک... بحرِ ہند پر قبضے کی ”گریٹ گیم“ سے ہے۔ اس کھیل میں ایک طرف بھارت و امریکا اور ان کے ساتھی کھڑے ہیں۔ جبکہ دوسری سمت چین، پاکستان اور ان کے دوست استادہ ہیں۔

چین کے اہم بحری تجارتی راستے بحرِ ہند میں واقع ہیں۔ لہٰذا چینی حکومت کی خواہش ہے کہ وہ دوست ممالک کی بندرگاہوں میں اپنے سول و فوجی اڈے قائم کر لے۔ اس غرض سے وہ جبوتی میں اپنا فوجی اڈہ بنا چکا۔ جبکہ پاکستان میں گوادر اور جبوتی، سری لنکا میں ہمبانتوتا بھی چینی بحری اڈے بننے کے مراحل میں ہیں۔ چین مالدیپ میں بھی اپنا اڈہ بنانا چاہتا ہے کیونکہ یہ اہم جغرافیائی پوزیشن کا حامل ہے۔

بھارت سے قریب ہونے کے باعث ماضی میں

www.urdugem.com

مالدیپ بھارتی حکومت کے دائرہ اثر میں شامل رہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب مالدیپی صدر مامون عبدالقیوم کے خلاف بغاوت ہوئی، تو بھارتی فوج ہی نے مالدیپ پہنچ کر اس کا قلع قمع کیا تھا۔ ۲۰۱۰ء تک مالدیپ میں بھارتی کمپنیوں کی بڑی تعداد کاروبار اور صنعت وحرفت سے منسلک رہی۔

اس زمانے میں محمد نشید مالدیپ کا صدر بن چکا تھا۔ نشید ۱۹۸۲ء میں بسلسلہ تعلیم برطانیہ چلا گیا تھا۔ وہ پھر دس برس وہاں مقیم رہا اور مغربی تہذیب وتمدن میں رنگا گیا۔ ۲۰۰۹ء میں صدر بنا، تو اسی نے مالدیپ کے ہوٹلوں اور سیاحتی مقامات پر سیاحوں اور مقامی باشندوں کو شراب پینے اور خزانہ نکالنے کی اجازت دے دی۔ امکان یہی تھا کہ اگلے مرحلے میں سیاحوں کو زنا کاری کی اجازت بھی مل جائے۔ صدر نشید اس طرح حکومت کی آمدن بڑھانا چاہتا تھا۔ واضح رہے، سیاحت سے مالدیپی حکومت کو کثیر آمدن ہوتی ہے۔

لیکن مالدیپی عوام کو اپنے حکمران کی غیر شرعی سرگرمیاں بالکل پسند نہیں آئیں۔ یہ عوام بڑے شوق سے اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ انھوں نے پہلے اپنے صدر کو وارننگ دی کہ وہ غلط راستہ چھوڑ کر سچائی کے راستے پر آجائیں مگر صدر نشید نے اپنا طرز عمل نہ بدلا۔ اس کے بعد مالدیپی عوام صدر کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ جب مظاہروں میں شدت آگئی، اور ملک میں امن وامان خطرے میں پڑ گیا، تو فوج نے نشید کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

نومبر ۲۰۱۳ء میں نئے صدارتی انتخابات ہوئے جو عبداللہ یامین عبدالقیوم نے جیت لیے۔ یہ سابق صدر، مامون عبدالقیوم کے سوتیلے بھائی ہیں۔ صدر نشید بھارت کے طرف دار تھے، مگر نئے حکمران چین سے دوستی کی پینگیں بڑھانے لگے۔

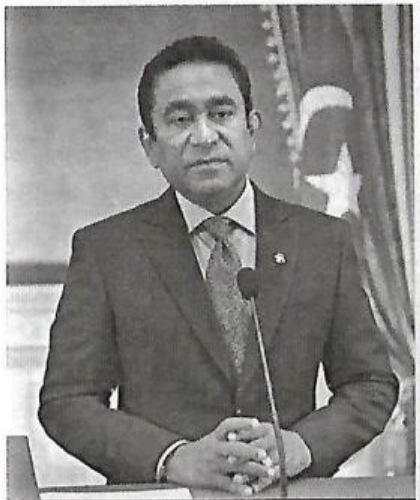
صدر عبداللہ یامین

چین ۲۰۱۱ء تک مالدیپ میں سفارت خانہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ مگر جب چینی صدر، شی جن پنگ برسر اقتدار آئے، تو وہ مالدیپ سے تعلقات بڑھانے لگے۔ ۲۰۱۴ء میں بھارتی کمپنی کے بجائے ایک چینی کمپنی دارالحکومت مالے کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کا انتظام سنبھالنے میں کامیاب رہی۔

رفتہ رفتہ چین کے سیاح بڑی تعداد میں مالدیپ آنے لگے اور تجارتی وفود بھی۔ مزید برآں چینی حکومت مالدیپ کو قرضہ اور امداد بھی دینے لگی۔ اس تمام سرگرمی کا مقصد یہ تھا کہ مالدیپ چین کے دائرہ اثر میں آجائے۔

چین اور مالدیپ کے تعلقات کا نیا باب دسمبر ۲۰۱۷ء میں شروع ہوا جب صدر عبداللہ یامین نے بیجنگ کا دورہ کیا۔ اس موقع پر صدر شی جن پنگ نے مہمان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ اسی دورے کے دوران دونوں ممالک نے آزاد تجارت کے معاہدے پر دستخط کیے نیز طے کیا کہ وہ ہر

شعبہ ہائے زندگی میں روابط بڑھائیں گے۔

مالدیپ اور چین کے بڑھتے تعلقات نے بھارتی حکمرانوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا چنانچہ کثیر سرمائے سے یہ سازش تیار کی گئی کہ صدر عبداللہ یامین کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے مالدیپی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو سازش میں شریک کیا گیا۔ اس کے بعد مامون عبدالقیوم اور محمد نشید، دونوں سابق صدور پر مشتمل ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیا گیا۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ دونوں راہنماؤں میں اینٹ کتے کا بیر تھا۔ لیکن امریکی خفیہ ایجنسی، را اور امریکی سی آئی اے نے ترغیبات ومراعات کی مدد سے انھیں یکجا کر دیا۔

۲۰۱۴ء میں دونوں خفیہ ایجنسیاں پیسے کی طاقت اور ترغیبات دے کر سری لنکا میں بھی اسی قسم کا "اعلیٰ" کھیل دکھا چکی تھیں۔ اس وقت کا سری لنکن صدر، مہندرا راجاپاکسا چین کا حامی تھا۔ اس کے دور میں سری لنکا تیزی سے چین کے دائرہ اثر میں آرہا تھا۔ تبھی بھارت اور امریکا نے مل کر سری لنکن حزب اختلاف کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ دلچسپ بات یہ کہ اکثر پارٹیاں ایک دوسرے کی شدید مخالف تھیں مگر بھارتی وامریکی اشیر باد سے متحد ہوگئیں۔ نتیجتاً صدر راجاپاکسا کو آئندہ الیکشن میں ہار کا مزا چکھنا پڑا۔

مالدیپ میں الیکشن ہو رہے تھے، اس لیے صدر عبداللہ یامین کا اقتدار ختم کرنے کے لیے چیف جسٹس کو خرید لیا گیا۔ اُسے ۲۰۰۹ء میں صدر نشید نے تعینات کیا تھا اور وہ سابق صدر سے قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ لہٰذا اُسے حکومت مخالف سازش کا حصہ بنانا آسان تھا۔ گویا چیف جسٹس اپنے مقام ومرتبے سے گر کر مخالف قوتوں کا آلہ کار بن گیا۔

یکم فروری کو چیف جسٹس، عبداللہ سعید نے حکومت

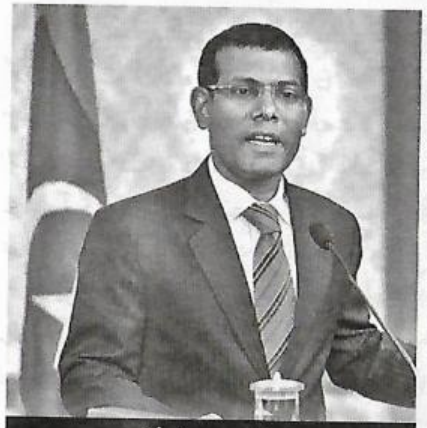
سابق صدر محمد نشید

پر وار کرتے ہوئے حکم دیا کہ مجلس (پارلیمنٹ) کے ۱۲ ارکان رہا کر دیے جائیں۔ یہ بارہ ارکان جولائی ۲۰۱۷ء تک حکومت کا حصہ تھے۔ پھر پُراسرار طور پر حزب اختلاف میں شامل ہوگئے۔ حکومت نے ان پر کرپشن کا الزام لگایا اور انھیں قید کر دیا۔ اب گیم پلان کی رو سے عبداللہ سعید نے انھیں رہا کرنے کا حکم جاری کر ڈالا۔

گیم پلان یہ تھا کہ رہا ہونے والے بارہ ارکان مجلس میں پہنچ جاتے، تو حزب اختلاف کی پارٹیوں کو اکثریت حاصل ہو جاتی۔ تب وہ صدر عبداللہ یامین کے خلاف تحریک عدم اعتماد لے آتیں اور یوں انھیں اقتدار سے محروم ہونا پڑتا۔ تاہم صدر عبداللہ نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چیف جسٹس کا فیصلہ قبول نہ کیا اور انھیں پولیس سے گرفتار کروا دیا۔

بعد ازاں سپریم کورٹ کے بقیہ ججوں نے چیف جسٹس کا فیصلہ کالعدم قرار دے ڈالا یوں بارہ ارکان مجلس بدستور جیل میں ہیں۔ اسی دوران صدر مالدیپ نے مملکت میں ایمرجنسی بھی لگا دی تاکہ مخالفین کی سازشوں کا قلع قمع کیا جا سکے۔

www.urdugem.com

ایمرجنسی نافذ ہوتے ہی سابق صدر نشید نے بھارت کو دعوت دے ڈالی کہ وہ مالدیپ میں فوج بھجوا دے۔ مقصد یہ تھا کہ بھارتی فوج صدر یامین کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار اُسے سونپ دے۔ یوں بلی آخر کار تھیلے سے باہر آ گئی اور نشید نے بھارت و امریکا کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

یہ عین ممکن ہے کہ جنگجو نریندر مودی بھارتی فوج مالدیپ بھجوا دیتا مگر چین کے ترنت و مسکت ردعمل نے اُس کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۴ فروری کو چین کے مشہور سرکاری اخبار، گلوبل ٹائمز نے اپنے اداریے میں لکھا:

''بھارت کو صبر و برداشت سے کام لینا چاہیے۔ اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر (مالدیپ میں) فوج بھجوانا درست عمل نہیں ہوگا۔ چین مالدیپ کے اندرونی مسئلے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر نئی دہلی نے اُصول توڑا تو چین ہاتھ باندھ کر بیٹھا نہیں رہے گا۔ اگر بھارت نے یکطرفہ فیصلہ کرتے ہوئے مالدیپ میں فوج بھیجی، تو چین نئی دہلی کو روکنے کی خاطر ہر ممکن اقدام کرے گا۔ چین (مالدیپ میں) فوجی جارحیت کا مخالف ہے اور بھارت ہمارے اس فیصلے کو عام انداز میں نہ لے!''

اس اداریے کی زبان سے صاف آشکارا ہے، چینی حکومت نے بھارت کو خبردار کر دیا کہ وہ مالدیپ میں کوئی خفیہ گیم کھیلنے سے دور رہے۔ یہی وجہ ہے، مودی حکومت کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ مگر اس تمام حیران کن واقعہ سے عیاں ہے کہ بھارت و امریکا مستقبل میں بھی صدر یامین کی حکومت گرانے کی سر توڑ کوشش کریں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ چین بحر ہند میں اپنا اثر و رسوخ پھیلا رہا ہے۔ بھارت دنیا کے اس تیسرے بڑے سمندر میں چین کے بڑھتے اثر و رسوخ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ اسی لیے وہ چینی پھیلاؤ کا توڑ کرنے کی خاطر خود بھی بحر ہند میں پر پھیلا رہا ہے۔

بھارت نے پچھلے چند برس میں ویت نام، تائیوان اور سنگاپور سے مختلف بحری معاہدے کیے ہیں۔ چند دن قبل عمان نے اپنی بندرگاہ، دقم میں بھارتی تجارتی و جنگی بحری جہازوں کو لنگر انداز ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ یہ بندرگاہ بحیرہ عرب میں واقع ہے۔ غرض بھارت جنوبی بحیرہ چین سے لے کر بحیرہ عرب تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر چینی حکومت کو دکھا دینا چاہتا ہے کہ وہ بھی علاقائی سپر پاور کی حیثیت رکھتا ہے۔

دراصل بنگلہ دیش، برما، سری لنکا، مالدیپ اور پاکستان میں چین وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کر چکا۔ نیز چین افغانستان میں بھی اپنی سرمایہ کاری بڑھا رہا ہے۔ چینی حکومت کے اس اقدام سے بھارتی حکمران خود کو چاروں طرف سے گھرا محسوس کرنے لگے ہیں۔ خاص طور پر چین اب بحر ہند میں ایک بڑا کھلاڑی بن چکا۔ گویا یہ خدشہ ہے کہ مستقبل میں بحر ہند دونوں بڑی طاقتوں کے ٹکراؤ کا نشانہ بن سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ ٹکراؤ عسکری چولا بھی زیب تن کر لے۔

عالمی سمندری راستوں نے اب ارضی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ عالمی سطح پر سمندری راستے اپنے قبضے میں کرنے کی خاطر امریکا اور چین میں زبردست ٹسل جنم لے چکی۔ یہی وجہ ہے، ٹرمپ حکومت وقتاً فوقتاً اپنے طیارہ بردار جہاز کبھی بحر الکاہل اور کبھی دوسرے سمندروں میں بھجوانے لگی تاکہ ثبوت دے سکے کہ وہ دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہے۔ چین اب اس امریکی یک قطبی طاقت ہی کو توچیلنج کرنے کی تیاری میں ہے۔ ◆◆◆

افشاں کرن

آج بھی وہ بے چین نظروں سے اُسے تلاش کر رہا تھا۔ جیسے ہی روشنی کی کھنکتی پیاری سی دلربا آواز اشعر نے سنی تو پلٹ کر دیکھا۔ وہ حسب معمول دالان کے دائیں طرف پہلے بینچ پر بیٹھی ردا کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ وہ ہلکے فیروزی رنگ کے لباس میں سر پر دوپٹہ جمائے بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔

اشعر کو اس کی سچی اور منافقت سے پاک ہنسی بہت بھاتی۔ یونیورسٹی میں روشنی کبھی دالان کبھی کینٹین کے قریب کبھی بائیں باغ میں ادھر ادھر منڈلاتی ہوئی تتلی کے مانند لگتی جو زندگی کی تلخیوں کی تپش سے نا آشنا اور اپنی سکون اور راحت بھری زندگی کے اختصار سے نابلد تھی۔

اشعر اسے دور سے تکتا رہتا۔ کبھی اس کی محبت بھری نگاہوں کی تپش روشنی کو محسوس ہوتی تو وہ گھنی طویل پلکیں اٹھا کر دیکھتی۔ اسی ایک لمحے دونوں کی نظریں ملتیں۔ اشعر چوری پکڑے جانے پر فوراً اپنا دھیان کہیں اور کر لیتا۔ وہ ایک لمحہ آہستہ آہستہ اشعر کی زندگی کا کل کائنات بن گیا۔ وہ سوچتا، کچھ رشتے اور تعلق روح کے بندھن بن جاتے ہیں جن سے انسان چاہ کر بھی دامن نہیں چھڑا سکتا۔ جب حقیقی رشتوں کی تلخیاں بڑھتے بڑھتے زخم بن جائیں تب ایسے ہی نامعلوم اور نازک سے بے عنوان رشتے انسان کو حقیقت کی کڑی دھوپ میں چند ساعتوں کے لیے سہی سایہ ابر لگتے ہیں۔

اشعر بھی جب اپنی مشقت بھری زندگی پر نظر ڈالتا تو اپنے اردگرد ذمہ داریوں کا طوفان سا دیکھتا جو ہر آنے والے دن شدید تر ہو رہا تھا۔ اشعر دراصل پشاور کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ چار بہنوں اور والدین کے جھکے ہوئے کندھوں کا واحد سہارا تھا۔ یہ چھ رشتے ہی اشعر کی کل کائنات تھے۔ والد

بے غرض رشتے

حقیقی رشتوں کی خاطر اپنا دل توڑ دینے والے ایک فرمانبردار بیٹے کا سبق آموز ماجرا

www.urdugem.com

نے بیٹے کو شہر پڑھنے بھیجنے سے پہلے بھائی کی بیٹی کے ساتھ منگنی کا رشتہ قائم کر دیا تھا۔ انھیں خوف تھا، شہر جا کے وہاں کی پڑھی لکھی لڑکیوں سے متاثر ہو کر بیٹا گاؤں کی مٹی سے تعلق توڑ نہ بیٹھے۔ گاؤں کی مٹی اور اس میں پنپنے والے رشتے ہی اشعر کا اصل تھے۔ صدیوں سے آباد اس کے آباؤ اجداد نے وہیں اپنی زندگیاں تمام کی تھیں۔

اشعر چچا زاد سے رشتے پر خوش نہ تھا مگر بوڑھے باپ کا جھریوں زدہ چہرہ دیکھ کر انکار نہ کر سکا۔ ماتھے کی ایک ایک شکن میں اولاد کے لیے دی گئی قربانیوں کی داستان رقم تھی اور جس کے ہاتھوں کی مشقت کی بدولت وہ آج ایک تناور درخت بن گیا تھا۔ کبھی کبھی انسان دوسروں کے لیے اپنی زندگی، سوچ، ذات سب کچھ وقف کر دیتا ہے۔ شاید یہی ہمارے مالک کی رضا ہوتی ہے۔

اشعر نے بھی اپنے رشتوں کی خاطر دل میں پنپتی خواہشات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا کہ ان کا پنپنا روح کی تکلیف کے سوا کچھ نہ تھا۔ چار بہنوں کا بوجھ کندھوں سے اتارنے کی لگن میں اور والدین کو پر آسائش بڑھاپا دینے کے لیے اشعر نے گاؤں کی تعلیم کے بعد شہر کا رخ کیا۔ کالج میں پوزیشن لے کر اس نے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لیا جہاں روشنی اشعر کے لیے جدوجہد زندگی کی تکان میں راحت کا باعث بن گئی۔

اشعر میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ روشنی سے بات کرے، اپنے جذبات بتا سکے مگر وہ بتانا بھی تو نہ چاہتا تھا کیونکہ وہ یہاں سی نئے رشتے کو بنانے نہیں بلکہ پرانے رشتوں کو مضبوط کرنے کی لگن لے آیا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کے دو چار دوست ہی تھے جو اشعر کے ساتھ ہاسٹل میں رہتے۔ وہ بھی دوسرے شہروں سے آئے تھے اور معصومیت سے بھرے ہوئے۔ لاہور کی رنگینیوں اور ماحول دیکھ کر خوش کم اور حیرت زدہ زیادہ ہوتے۔ ان کی توجہ کا مرکز تعلیم تھی۔

روز و شب کی محنت کے باعث اشعر انجینئرنگ کے ہر سال اول آنے والے طالب علموں میں شمار ہوتا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب اسے ہاسٹل اور یونیورسٹی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح کی جڑیں یہی کہیں ہیں۔ آج اجنبی ماحول چھوڑتے ہوئے اشعر کو تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ جانے سے ایک دن پہلے اسے روشنی بھی نظر آئی۔ پسندیدگی اور محبت کا اظہار اس کی نظروں میں تو موجود تھا مگر زبان تک کبھی نہ آیا۔ روشنی کو اس بات کی خبر ہی نہ تھی کہ کوئی اس سے روح کا گہرا تعلق استوار کر چکا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اشعر گاؤں واپس آ گیا اور کچھ دن وہاں رہا۔ وہ مختلف جگہوں پر ملازمت کی خاطر درخواستیں بھی بھیجتا رہا۔ وہ بوڑھے باپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ماں اور بہنیں اس پر صدقے واری جاتی تھیں اور خوب خاطر مدارت کرتیں کہ ان کا بھائی چند دنوں کا مہمان ہے۔ ملازمت ملی، تو پھر کئی دن بعد گاؤں چکر لگایا کرے گا۔

ایک دن اشعر اپنے گھر کے پچھواڑے بیٹھا اپنی نوکری کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ چھوٹی بہن پلوشہ ایک لفافہ اٹھائے بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی "لالہ، لالہ! اس میں دیکھو کیا ہے"

اشعر نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک پرائیویٹ کمپنی کی طرف سے نوکری کی پیشکش کا خط موجود تھا۔ دونوں بہن بھائی بھاگ کر گھر کے اندر گئے۔ ماں باپ سے لپٹ گئے اور جھوم جھوم کر نوکری کی خوشخبری سنائی۔

اشعر کو بہت اچھا لگا کہ جس پیڑ کو اس کے باپ نے پوری زندگی محنت و سخت کوشی کا پانی دیا اس پر اب پھل لگنے کا وقت آ گیا تھا۔ سب بہنوں نے مل کر اس کا ایک بیگ تیار کیا کیونکہ صبح پانچ بجے اشعر کو اسلام آباد روانہ ہونا تھا۔ پشاور سے اسلام آباد تک کا سفر اس نے بڑی بے تابی سے گزارا۔ اسلام آباد پہنچ کر دوست کے چھوٹے بھائی کی ہمراہی میں پرائیویٹ کمپنی جا پہنچا۔

اشعر کو جس تنخواہ کی پیشکش ہوئی وہ اس کی سوچ سے زیادہ تھی۔ اس کے چہرے پر تاثرات بدل گئے۔ اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ محنت کا پھل اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے۔ وہ محنت کا صلہ پا کر بہت مطمئن تھا۔ وقت گزرتا رہا جب خاصی رقم جمع ہوئی، تو اشعر نے دو بہنوں کو اکٹھے ہی رخصت کر دیا۔

اب اس کی ذمہ داری کچھ کم ہوئی تھی۔ جب بھی وہ گھر جاتا، ماں اشعر کی منگیتر کے بارے میں بات چھیڑ دیتی۔ اشعر پریشان ہو جاتا اور یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ابھی دو چھوٹی بہنوں کو رخصت کر دوں، تب دلہن گھر لاؤں گا۔ یہ ذمہ داریاں میرے لیے زیادہ اہم ہیں۔ یہ سن کر ماں چپ ہو جاتی اور دل ہی دل میں سوچتی سات سال منگنی کو ہو گئے اور یہ شادی کی بات ہی نہیں کرتا۔

اشعر کے قلب و ذہن میں روشنی کا خیال مٹا تو نہیں تھا مگر وقت کی گرد نے مدھم ضرور کر دیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شب تنہائی میں اسے روشنی کا خیال جگنو کے مانند چمکتا محسوس ہوتا۔ وہ اس کے قلب کی تاریکیوں میں روشنیاں بکھیر دیتا۔ اسے اس بات پر پختہ یقین ہو گیا کہ آج کل کے خود غرضانہ اور مطلب پرستی کے دور میں بھی بے لوث اور بے غرض رشتے وجود پانا ممکن ہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس کی دو چھوٹی بہنوں کے بیاہ ہونے تھے۔ دفتر میں نئے ملازمین کے انٹرویو ہو رہے تھے۔ وہ اپنے افسر سے معذرت کر چھٹی لے پشاور آ گیا کیونکہ وہ انٹرویو لینے والوں میں شامل تھا۔ پشاور پہنچ کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور بہنوں کو خوشی خوشی رخصت کیا۔ گھر میں سبھی اداس اور افسردہ ہو گئے تھے ایسے اداسی بھرے ماحول میں اشعر کے والد گویا ہوئے "اب میں بہو گھر لانے کی تیاری کروں گا۔ تم بھی چلے گئے تو ہم بوڑھا، بوڑھی اس اداس اور بیابان گھر میں کیسے رہیں گے؟"

اشعر نے ماں باپ کو تسلی دی اور شادی کے لیے ہامی بھر لی۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد وہ اسلام آباد واپس پہنچا۔

کافی دن بعد اشعر جب دفتر آیا تو ایک نئے چہرے کو دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ جس سے وہ بار ہا دامن بچانے کی کوشش کرتا رہا وہی شناسا چہرہ اس کے سامنے مسکرا رہا تھا۔ روشنی نے اس کی غیر موجودگی میں اسی کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ اب وہ بھی اشعر کی طرح اس کا حصہ تھی۔

اشعر وقت کے اس ستم یا کرم کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ جس چہرے کی جھلک اور سچے کھرے جذبات سے بھرپور آنکھوں نے اُسے ایک ہی نظر میں راکھ کر دیا تھا، اب وہ ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتا، تو زندگی بہت مشکل ہو جاتی۔ اشعر ان ہی خیالوں میں گم تھا جبکہ روشنی اشعر کو وہاں دیکھ کر خوش تھی کہ کوئی شناسا چہرہ مل گیا مگر وہ روشنی کے سامنے جانے سے کترانے لگا اور بہت کم بات کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔

مسلسل ایک ماہ تک کشمکش کی کیفیت اور اضطراب سے دوچار رہنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا..... یہ کہ اسے یہ نوکری چھوڑ دینی چاہیے کیونکہ وہ جانتا تھا ماں باپ نے جہاں منگنی کر رکھی ہے، وہ تعلق کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ منگیتر سات برس سے اسی کے نام کی انگوٹھی ہاتھوں میں سجائے سپنے دیکھ رہی تھی۔

اشعر نے سوچا، میرا تو دل کا تعلق ہے، اسے توڑتے ہوئے صرف مجھے تکلیف ہو گی جبکہ والدین کے باندھے گئے رشتے کے ٹوٹنے پر کئی دل دکھی ہوں گے، کئی زندگیاں متاثر ہوں گی۔ چنانچہ اشعر نے چند ذاتی مجبوریاں ظاہر کر کے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔

وہ مختلف جگہوں پر ملازمت کے سلسلے میں درخواستیں بھیجتا رہا۔ آخر اسے لاہور میں ایک اچھی کمپنی میں نوکری مل گئی اور اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ اب وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھا کہ اس نے اپنے حقیقی رشتوں کے ساتھ دغا نہیں کیا۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

اُف یہ بے خبری!

علم و ادب سے دوری نئی نسل کو علمی طور پر بانجھ بنا رہی ہے

افتخار مجاز

میرے سینئر صحافی دوست، اسلم ملک نے فیس بک پر ایک پوسٹ لگائی ہے، ''دو تین برس پہلے ایک ٹیلی ویژن چینل کی خاتون پروڈیوسر کو ''ماڈرن حقے'' یعنی شیشے پر ایک فلم رپورٹ بنانے کے لیے کہا گیا۔ وہ خاتون رپورٹ تیار کر کے لائیں۔ ایڈیٹر نے دیکھا تو پسند کیا اور داد بھی دی، پھر کہا، کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ ''حقے'' کا تذکرہ کرتے ہوئے نوابزادہ نصراللہ کا بھی ذکر کر دیتیں۔

''کون نوابزادہ نصراللہ؟'' خاتون نے حیرت سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ میری دانست میں مذکورہ صحافی خاتون یقیناً خیر سے بی اے، یا ایم اے پاس ضرور ہوں گی۔ اتنی تعلیم کی حامل خاتون اور وہ بھی صحافت کی راہرو کے مسافر کی یہ بے خبری، یا کم علمی، بجائے خود ایک خبر ہونی چاہیے، کہ نہ اُسے سیاست کی شد بد ہے نہ سیاستدانوں کا پتا۔ قومی سیاست کے ایک انتہائی متحرک کردار نوابزادہ نصراللہ جو ۷۰ برس سے زائد عرصے تک برصغیر اور پاکستان کی سیاست میں انتہائی فعال رہے، وہ یوں بھلا دیے گئے کہ ہمارے صحافیوں کی نئی نسل ان سے متعارف ہی نہیں۔ اسی نسل کی ایک رکن کا سوال ہے کہ کون نوابزادہ نصراللہ؟

مولانا ظفر علی خاں کی قدآوری یقیناً نوابزادہ نصراللہ سے بھی کہیں بڑھ کر ہے کہ آپ تحریکِ پاکستان کے ولولہ انگیز راہنما اور بابائے صحافت تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کا یہ کریڈٹ اور کارنامہ بھی انھیں بہت سوں سے ممتاز کرتا ہے۔ آپ نے ۱۹۴۰ء میں پیش کی جانے والی انگریزی متن کی حامل قرارداد کا اردو زبان میں فی البدیہہ ترجمہ کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ متذکرہ ٹیلی ویژن چینل کے ہیڈ نے خاتون پروڈیوسر سے نوابزادہ نصراللہ کا ہی ذکر کیا تھا، خدانخواستہ انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کا بھی ذکر کر دیا ہوتا تو وہ بے چارے بابائے صحافت بھی کون ہو کر رہ جاتے؟

متذکرہ بالا سطور میں جس المیے کا تذکرہ ہوا، اب یہ ''وبا'' کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ آگہی کے ذرائع پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو چکے ہیں پھر بھی بے خبری اور لاعلمی کی یہ انتہا ہے کہ الامان، الحفیظ! بہرطور ذرا آئیے چند مزید اسی نوعیت کی ''خبریں'' ملاحظہ فرمائیں۔

میں لاہور کی ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کے شعبہ میڈیا سٹڈیز (جرنلزم + ماس کمیونیکیشن) میں ایم اے کے طلبہ کو آخری سمیسٹر پڑھا رہا تھا۔ لیکچر کے دوران یکے بعد دیگرے دو تین مرتبہ فیض احمد فیض اور احمد فراز کی شاعری کا تذکرہ کیا۔ طلبہ کے سپاٹ چہرے دیکھ کر میں نے اِن سے پوچھا، ''ابھی میں یکے بعد دیگرے جن فیض صاحب اور فراز صاحب کا تذکرہ کر چکا، آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ آپ یقین کیجیے، ایم اے کی آخری سمیسٹر کے ۳۲ طلبہ کی کلاس میں کوئی ایک طالب علم بھی مجھے فیض اور فراز کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

میرا تاثر یہ ہے کہ ٹھیک ہے، یہ طلبہ براہ راست ادب یا لٹریچر نہیں پڑھتے، مگر ایسی بھی کیا جہالت کہ وہ فیض اور فراز سے متعارف تک نہ ہوں۔ بخدا، مجھے کوئی اور شخص یہ کہانی سناتا تو مجھے یقین کرنے میں تامل ہوتا، مگر یہ تو میری آپ بیتی ہے جناب۔ اسی جماعت کا ایک اور قصّہ ہے۔ ایک روز میں نے کلاس لینے کے بعد ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین صاحب کے کمرے میں چائے پیتے ہوئے کہا، ''یہ ایم اے آخری سمیسٹر کے طلبہ ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا، کسی نے گزشتہ دو برس کے دوران کوئی کتاب پڑھی ہو، تو وہ بتائے، مگر ۳۲ کے بتیس طلبہ میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ سر! میں نے فلاں کتاب پڑھی ہے۔'' جونہی میری بات مکمل ہوئی چیئرمین صاحب نے بے ساختہ کہا، سر! اب مجھ سے نہ پوچھ لیجیے گا کہ گزشتہ دو برس میں نے کونسی کتاب پڑھی ہے؟؟؟؟

اب آپ خود اندازہ کر لیجیے جہاں پڑھانے والوں کا یہ حال اور صورت ہو گی وہاں کے طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کون فیض، کون فراز اور کون نوابزادہ نصراللہ کہیں تو میری دانست میں حیرت و اچنبھا نہیں ہونا چاہیے۔

میں جب پاکستان ٹیلی ویژن میں بطور نیوز ہیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا تو ایم اے، ایم ایس سی کر کے آنے والے طلبہ میرے پاس انٹرن شپ کے سلسلے میں آتے تھے۔ ان سے انٹرویو کرتے ہوئے خود کو شرم آنے لگتی تھی کہ ہمارے ادارے یہ کیسی کھیپ تیار کر رہے ہیں؟

ماضی کا قصہ ہے، ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی، صحافت کے طلبہ کی تقریباً آدھی کلاس پی ٹی وی کے مطالعاتی دورے پر آئی۔ اٹھارہ بیس طلبہ میں سے کوئی ایک طالب علم نہ بتا سکا کہ اخبار کی پرنٹ لائن کیا ہوتی ہے۔ ایک طالب علم نے پُرجوش انداز میں ہاتھ کھڑا کر کے زور زور سے ہلایا تو مجھے خوشی ہوئی، مگر وہ اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ہونے والی بڑی ہیڈ لائن (Bannar Head Line) کو پرنٹ لائن بتا رہا تھا۔

میں اِن سطور میں صحافت سے وابستہ افراد یا طلبہ کی جہالت، کم علمی اور بے خبری کے واقعات آپ کی نذر کرتے ہوئے انھیں گلیمرائز نہیں کر رہا، نہ میرا مقصود ایسے طلبہ یا پروفیشنلز کی ''علمی بصیرت'' کا تذکرہ کر کے انھیں یا ان کے اساتذہ کو ہدفِ تنقید بنانا ہے۔ میں تو صرف اس امر کا اظہار کر رہا ہوں کہ کتاب اور مطالعہ سے دوری کے باعث شعبے میں آنے والوں کی کارکردگی اور معیار یہی ہو گا۔

میری دانست میں پاکستان ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر کے منصب پر فائز اگر کوئی شخص بابائے ٹیلی ویژن اسلم اظہر صاحب کا نام لینے پر یہ پوچھتا ہے کہ کون اسلم اظہر تو پھر اُسے اپنے منصب پر رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ تین برس پہلے پاکستان ٹیلی ویژن کے ابتدائی برسوں اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے نیوز کاسٹر سہیل ظفر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ سہیل ظفر معروف صحافی، صحافت کی ٹریڈ یونین کا ایک معتبر و باوقار نام اور ہماری ادبی سماجی زندگی کی جانی پہچانی شخصیت تھے، مگر اپنے انتقال کے وقت وہ پی ٹی وی سے وابستہ نہیں تھے۔ مجھے رحلت کی اطلاع ملی تو فوری طور پر پی ٹی وی کے شعبۂ خبر کو مطلع کیا۔ جواباً مجھ سے پوچھا گیا، یہ ظفر سہیل واقعی کوئی اہم آدمی تھے یا آپ محض اپنے مرحوم دوست کی خبر ٹی وی پر چلوانا چاہ رہے ہیں؟ یقین کیجیے اِس سے ملتے جلتے کئی اور واقعات ہیں جنھیں دہرانے سے سینہ سلگتا ہے۔

www.urdugem.com

نمک پارے

چلو اک بار پھر سے...

چلو، اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
تُو انٹرنیٹ کھولے اور چیٹنگ روم میں جا پہنچے
کسی رومانی چینل میں ہوں مَیں منتظر تیرا
بڑے مان سے میں تجھ سے پوچھوں تیرا اے ایس ایل
تُو لکھے سترہ برس کی، وطن انگلینڈ ہے میرا

میں لکھوں بیس کا سَن ہے، میں ٹورنٹو میں بیٹھا ہوں
یہیں اک اشتہاری کمپنی میں جاب ہے میری
تُو لکھے میں نمانی ہوں ادب سے شغل رکھتی ہوں
میں لکھوں، ہائے، اُف، اللہ، تُو ہی تو خواب ہے میری

بہت سی ہم میں باتیں ہوں، بہت سی فقرہ بازی ہو
بہت سے جھوٹے افسانے کہیں اک دوسرے سے ہم
یوں اک دوجے میں کھو جائیں، بُھلا دیں ساری دنیا کو
بُھلا دیں وقت کی ظالم حقیقت کو سرے سے ہم

بُھلا دیں وقت کو ایسے، خبر نا ہو سکے یکسر
یونیورسٹی سے بیٹا اور بیٹی لوٹ آئے ہیں
تو ان کی کھلکھلاہٹ سن کر سی پی یو کو شٹ کر دیں
انھیں معلوم ہے ماں باپ نے کیا گل کھلائے ہیں

ہمیں وہ لیلیٰ مجنوں کہہ کے چھیڑیں اور ہم بوڑھے
بہت جھینپیں بہت شرمائیں ہم دونوں
مگر جب اگلا دن آئے، یہی تجھ سے ہو فرمائش
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

حالِ پریشاں

جب بھی تجھے دیکھا کسی بحران میں دیکھا
نسیان میں دیکھا، کبھی ہذیان میں دیکھا

گو بھی بھی ہے گر پھول تو بس اتنا بتا دے
کالر میں کسی یا کبھی گلدان میں دیکھا

ایسا نہ ہو مُنّے کو کوئی چیل اُچک لے
ننگا اُسے دیکھا کبھی بنیان میں دیکھا

بیوی نے دبا رکھا ہے اب ٹینٹوا شاید
میں نے اسے حالِ پریشان میں دیکھا

کہتے ہیں کہ لیلیٰ کا تعلق تھا عرب سے
یہ رنگ تو افریقا و مکران میں دیکھا

رَس گنے کا پینے کو مِلا خوب ہمیں بھی
یہ فائدہ دیکھا ہے تو یرقان میں دیکھا

پستول چھپا رکھا تھا پتلون میں، میں نے
کسٹم کے سپاہی نے جو سامان میں دیکھا

وہ چور تھا یا عاشقِ دلگیر کسی کا
دیوار پہ چڑھتے جسے دالان میں دیکھا

☆☆☆

بال گے لیکو / راجپوت اقبال احمد

یونان میں کارنتھ نہر پر بنے پُل کے نیچے سے گزرنے والا جہاز دیکھنے بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے۔ پُل پر سے جہاز بچوں کے کھلونے کی طرح ننھا منا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے مسافر اور ملاح، جن کے چہرے تماشائیوں کی طرف اُٹھے ہوئے تھے، بالکل گڑیوں کی طرح لگتے تھے۔ تماشائی جہاز کے لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے خوشی سے چلا

جادوئی ٹوپی

قدم قدم پر انوکھے حادثوں اور اتفاقات کو جنم دیتی ایک سحر انگیز کہانی

www.urdugem.com

رہے تھے۔ جواب میں جہاز والے بھی برابر کے جوش اور مسرت کا اظہار کرنے لگے۔ یوں مسافروں اور مقامی لوگوں میں ایک طرح کا دوستانہ پیدا ہو گیا۔

جارج پیولانڈ بھی سڑک کوٹنے کے کام سے نمٹ کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ جہاز دیکھ کر پُل پر رک گیا۔ وہ خوش مزاج اور کھلنڈرا نوجوان تھا۔ ہمیشہ دوسروں کی خدمت کے لیے تیار۔ اُس نے ابھی تک زندگی میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی، مگر یہ ایسی فکر کی بات نہ تھی۔ اُس کے آگے ابھی طویل زندگی پڑی تھی۔ وہ صرف پچیس سال کا تھا۔ زندہ دل، خوش فکر اور خوب صورت!

اُس کے پاس پہننے کو لباس تھا اور کھانے پینے کی ضرورت جتنی مزدوری کر لیتا تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا، چوڑے مضبوط شانے، سیاہ گھنگھریالے بال، مونچھیں ابھی بھوری تھیں۔ فی الحال وہ اپنی زندگی سے بڑا مطمئن تھا۔

جہاز اب عین پُل کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ خوشی سے چلاتے اور ہاتھ ہلاتے لوگوں کا شور کچھ اور بڑھ گیا۔ جارج کی صحت مند آواز بھی تماشائیوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اب اپنے رُومال پکڑ کر ہلانے شروع کر دیے۔ جارج نے بھی اپنا ہیٹ اُتارا اور سلام کرنے کے انداز میں اُسے آگے پیچھے لہرانے لگا۔

جوش و مسرت کے باعث وہ اپنا ہیٹ اس تیزی سے ہلا رہا تھا کہ اچانک اُس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل گیا اور لہراتا ہوا اتفاقی طور پر ٹھیک جہاز کے ایک مسافر کے قدموں میں جا گرا۔ مسافر نے اُسے فوراً اُٹھایا، جھاڑا اور مضبوطی سے تھام کر جارج کی طرف ہلانے لگا۔

یہ دیکھ کر جارج کے حلق سے قہقہے پھوٹ پڑے۔ وہ چلایا، سیٹیاں بجائیں، ہاتھ لہرائے اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے اپنے برابر میں موجود ایک سپاہی کے کندھے پر ہاتھ مار دیا۔

"دیکھو، دیکھو!" وہ بولا، "میرا ہیٹ بھی بحری سفر پر جا رہا ہے۔ اچھا، کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ جہاز کہاں جا رہا ہے؟"

سپاہی نے جہاز پر لہراتا ہوا اٹلی کا جھنڈا دیکھ لیا تھا، مسکرا کر اُس کی طرف مڑا، "میرے خیال میں وینس! کیا وہ ایک اچھا ہیٹ تھا؟"

"آہ! میرا پُرانا دوست۔" جارج نے کہا، "وہ کئی سال سے میرے پاس تھا۔ واہ! کیسی دل دلچسپ بات ہوئی ہے۔"

جہاز نہر کی تنگ پٹی سے کُھلے پانی میں چلتا نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ جارج نے ہنستے ہوئے اپنے اوزاروں کا تھیلا اُٹھا کر کندھے پر رکھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے دوسرے لوگ بھی اپنی راہ پر ہو لیے اور جلد ہی پُل سنسان ہو گیا۔

لیکن یہ زندگی کی پہلی رات تھی جب جارج نے خود کو کسی قدر بے چین اور غیر مطمئن سا پایا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ ہیٹ اُس کے پاس عرصے سے تھا۔ اب اُسے اچانک چھوڑ کر دنیا کے سفر پر نکل گیا تھا۔ کیا اُسے ہیٹ کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے؟ کوئی اس طرح بھی اپنے پُرانے دوستوں، پرانی چیزوں سے بچھڑا کرتا ہے؟ اور پھر اس جدائی میں ہیٹ کا قصور بھی کیا تھا؟ اگر اُس کے سر کا ساتھی وینس گیا ہے تو پھر اُسے بھی وینس جانا چاہیے۔ یہ خیال جارج کے ذہن میں جڑ پکڑتا چلا گیا۔

اگلے دن جارج نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور مختصر زادِ راہ لے کر وینس روانہ ہو گیا۔ وہ خوش باش حالت میں وینس پہنچا اور بڑی حیرت اور پسندیدہ نظر سے شہر کا نظارہ کرنے لگا۔

جارج پیولانڈ کو اطالوی زبان کا ایک بھی لفظ نہیں آتا تھا اور اُدھر اُسے بُری طرح بھوک ستا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے ایک ریستوران ڈھونڈا اور اُس میں گھس گیا۔ خوش قسمتی سے وہاں چند یونانی ٹکرا گئے، جنہوں نے ریستوران

کے مالک کو اس خوب صورت اور مضبوط یونانی کے بارے میں بتایا کہ وہ یونان سے اپنے ہیٹ کے تعاقب میں یہاں آیا ہے تو وہ بہت محظوظ ہوا۔ اُس نے فوراً ہی جارج کو اپنے ریستوران میں برتن دھونے کی ملازمت پیش کر دی۔

جارج نے یہ پیش کش بہ عجلت قبول کر لی۔ جب اُسے کچھ اطالوی لفظ بولنے آ گئے تو مالک نے اُسے بیرا بنا دیا۔ ایک روز اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے جارج ایک جہاز راں دفتر کے قریب سے گزرا تو اُسے کھڑکی میں سے بالکل ویسے ہی جہاز کی تصویر نظر آئی جس میں اُس کا ہیٹ اُڑتے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ دفتر میں گھس گیا۔

عام حالات میں اگر کوئی ٹوٹی پھوٹی اطالوی زبان میں یہ پوچھتا کہ آٹھ ماہ پہلے یہ جاذبِ نظر جہاز کا رنتھ نہر کے پُل کے نیچے سے گزر رہا تھا تو میرا ہیٹ ہوا کے زور سے اُس میں جا گرا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اُس کا کیا ہوا؟ تو اُسے پاگل سمجھ کر دفتر سے باہر نکال دیا جاتا، مگر جارج کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایسی پُرخلوص مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا اعتماد تھا کہ اُس کی بات بڑی توجہ سے سنی گئی۔

یہاں بھی ایک کرشمہ ہی ہوا۔ آٹھ ماہ پہلے کی اتنی معمولی سی بات کا یاد آ جانا حیرت انگیز ہی تھا۔ ایک کلرک اُٹھ کر اُس کے قریب آ گیا۔ "ایسی ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے۔" اُس نے بتایا۔ "ایک مسافر نے دفتر میں آ کر ایسی کوئی بات کہی تھی، مگر وہ ہیٹ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ آدمی امریکا جا رہا تھا۔"

جارج شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر آ گیا۔ ریستوران پہنچا تو امریکا جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا ہیٹ امریکا جا چکا ہے۔ اب اگر میرے ہیٹ کی مرضی یہی ہے کہ میں امریکا جاؤں تو مجھے وہاں جانا چاہیے۔"

ریستوران میں موجود اطالویوں نے اُسے جو بھی سمجھا ہو، سوا لگ، مگر یونانیوں کو اُس کی زندہ دلی اور خوش فکری اتنی بھائی کہ اُنھوں نے اُسے امریکی قونصلیٹ کا راستہ دکھا دیا۔

امریکی افسر نے جارج سے پوچھا "وہ امریکا کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"کیونکہ میرا ہیٹ وہاں جا چکا۔" اُس نے مترجم کے ذریعے افسر کو بتایا، "اور جہاں میرا ہیٹ ہے، وہیں مجھے بھی جانا چاہیے۔" پھر اُس نے جہاز کے گزرنے اور اُس میں ہیٹ گرنے کی کہانی سنائی۔

مترجم سے جارج کی داستان سن کر امریکی کونسلر کے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔ "آج تک..." وہ خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے کلرک سے بولا، "آج تک میں نے امریکا جانے کا اس سے انوکھا سبب نہیں سنا۔ اس نوجوان کو اجازت دے دو۔"

یہی تو بات تھی، جارج کی سادگی، بے ساختگی، بھول پن اور دل کشی کی وجہ سے ہر شخص اُسے پسند کرنے لگتا تھا۔ چھ ماہ بعد وہ امریکا روانہ ہو گیا۔ چونکہ اُس نے تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھ لی تھی، اس لیے اُسے ایک امریکی جہاز راں کمپنی پر بیرے کی جگہ مل گئی۔ اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ خشکی پر قدم رکھنے سے پہلے کچھ رقم جمع کرنے کی خاطر سے کئی بحری سفر بھی کیے۔

ہاں! اُس نے شادی کر لی تھی۔ اُس کی بیوی کا نام صوفیا کارا کینوتھا۔ وہ دراز قد کی حسین یونانی لڑکی تھی۔ اُس کے سیاہ گھنیرے بال بہت لمبے تھے۔ وہ جزیرہ کاتھرا کی رہنے والی اور جہاز پر خادمہ کی حیثیت سے ملازم تھی۔

جارج اُسے اُس کی گرم جوشی اور خوش شعاری کی وجہ سے پسند کرنے لگا۔ اُس کی آنکھیں بھی بڑی حسین تھیں، جارج کی طرح سادہ، نرم اور دل نشیں۔ ان بحری اسفار کے دوران جارج نے کئی بار اُسے اپنا حال دل سنانا چاہا۔

"مجھ سے شادی کر لو۔" وہ اس سے بولا، "ہم دونوں امریکا چل کر رہیں گے، جہاں مجھے اپنا ہیٹ تلاش کرنا ہے۔"

www.urdugem.com

آخر اسی کی وجہ سے تو میں نے اتنا سفر کیا ہے۔ تم دیکھو گی کہ میرا ہیٹ شہرت اور شان دار مستقبل کی طرف ہماری راہنمائی کرے گا۔"

صوفیا نے بڑی مایوسی سے اس خوب صورت مگر غیر ذمے دار نوجوان کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اس نے اتنے طویل سفر کی صعوبتیں محض ایک پرانے، بے قیمت ہیٹ کی وجہ سے برداشت کی تھیں؟ جو بے پروائی سے کارنتھ نہر پُل سے گرایا گیا تھا؟

"تم جیسے آدمی کے ساتھ رہ کر کوئی کیا کر سکتا ہے۔" وہ بولی، "مجھے شادی کی خواہش نہیں، مگر ظاہر ہے تم جیسے شخص کی دیکھ بھال کے لیے کسی آدمی کا ہونا ضروری ہے۔ ٹھیک ہے، میں تم سے شادی کروں گی، مگر صرف ایک شرط پر کہ آئندہ اس بیہودہ ہیٹ کا کوئی تذکرہ تمہاری زبان پر نہ آئے۔"

جارج نے اثبات میں اپنا خوب صورت سر ہلا دیا۔ وقتی طور پر وہ مطمئن تھا کہ اُسے صوفیا جیسی خوب صورت لڑکی کا ساتھ حاصل ہو رہا تھا۔

❁❁

فلمی دُنیا کے دو عظیم آدمی، جارج پیولائڈ اور مسٹر میکمانس آف ہالی وڈ، تقریباً بیک وقت شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچے۔ دونوں کبھی نہیں ملے تھے مگر کاروباری مسابقت کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر ایک دوسرے سے شدید بُغض رکھتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

اخبارات میں جارج کا ایک بیان شائع ہو چکا تھا، "اگر کبھی مجھے اس گندے کنگیر سے کاروبار کرنا پڑا تو میں یونانی بچوں کے یتیم خانے کو دس لاکھ ڈالر نقد چندہ دوں گا۔"

میکمانس ڈبلن کا ایک یہودی تھا۔ اُس کی عجیب و غریب فطرت کی وجہ سے یہ جھگڑا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اُن کی بیان بازی کے نتیجے میں یتیم خانے بڑی آس لگائے اُن کی طرف دیکھ رہے تھے، مگر ایسا لگتا تھا ندی کے یہ دونوں کنارے کبھی آپس میں نہیں مل سکتے۔

میکمانس کا نام کنگیر اس لیے پڑ گیا تھا کہ پچیس سال سے خاندان کے قریبی افراد، یا چند گہرے دوستوں کے علاوہ کسی نے بھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس کے سر کے اُوپر کا حصہ کیسا ہے۔ وہ آج تک کبھی کسی پروڈکشن کانفرنس بورڈ میٹنگ، مالیاتی ایجنڈا، اسٹوری راؤنڈ ٹیبل یا انٹرورلڈ پریمیئر میں کُھلے سر نہیں آیا تھا۔

اس بارے میں بے شمار افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ وہ سرِعام سر ننگا کیوں نہیں کرتا۔ اُن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ کٹر مذہبی آدمی ہے۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ بچپن میں کسی عجیب و غریب بیماری کی وجہ سے اُس کی چندیا پر صرف کچھ بال باقی رہ گئے ہیں، باقی سر گنجا ہی تھا جس کے نیچے اُس کا عظیم کاروباری دماغ مصروفِ کار تھا۔

چاہے کچھ بھی سبب ہو، مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ انتہائی زیرک تھا۔ اُس نے پوری فلمی دُنیا اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ اس میدان میں اُس کے مدمقابل واحد شخصیت جارج پیولائڈ کی تھی، جو کسی زمانے میں یونان سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ آج وہ امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں فلموں کے وسیع تھیٹروں کا مالک تھا۔

جارج پیولائڈ کو اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اطالوی تو اب وہ بڑی روانی سے بول سکتا تھا، فرانسیسی میں ہکلا سکتا تھا اور انگریزی میں اپنا کام نکال لیتا۔ اُس نے خاصی دنیا دیکھ لی تھی اور کئی طور طریق سیکھ لیے تھے۔ اُس کے پاس ایک ایسا فن تھا جس کی وجہ سے وہ کہیں بھوکا نہیں مر سکتا تھا۔ اچھے بیرے کی ہر جگہ مانگ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اب وہ تنہا بھی نہیں تھا۔

خوش دلی، سخاوت اور کام سے لگن کی عادت اُس کے ساتھ تھی۔ سان فرانسسکو سفر کے دوران اُس نے ایک ریستوران میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔ وہ بڑا فن کار بیرا

تھا۔ مختلف کھانوں کی پلیٹیں وہ اپنے گاہکوں کے آگے اس طرح سجاتا جیسے کسی بادشاہ کی خدمت کر رہا ہو۔ اُس کے کام کا اثر دوسرے بیروں پر بھی پڑتا تھا۔

جلد ہی وہ 'ہیڈ ویٹر' بنا دیا گیا۔ بعد میں اُس نے ریستوراں کے حصص بھی خرید لیے۔ جب اُس کا ساجھے دار فوت ہو گیا تو وہ ریستوران کا بلا شرکت غیرے مالک بن گیا۔ اُس کی شخصیت، گاہکوں کے لیے فکر مندی اور چھوٹی چھوٹی سخاوتیں، جیسے ڈنر کے بعد کافی یا سگریٹ وغیرہ کی پیش کش اور بیوی کے شان دار کاروباری شعور نے اُسے جلد کامرانی سے ہمکنار کر دیا۔ بوسٹن، شکاگو، ڈیٹرائٹ اور فلاڈیلفیا میں یکے بعد دیگرے اُس کے اپنے ریستورانوں کی زنجیر سی بچھ گئی۔ جب پندرہ سال بعد وہ نیو یارک آیا تو کروڑ پتی تھا۔

اُس وقت تک شاید جارج کے ذہن سے اپنے گم شدہ ہیٹ کی یاد بالکل ہی ختم ہو چکی تھی، یا اُس نے جان بوجھ کر ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سان فرانسسکو کی ناب ہلز پر اُس نے اپنا شان دار پیولائڈ محل تعمیر کیا تھا۔ وہاں وہ اپنی حسین بیوی، تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا۔

۱۹۳۹ء میں ایک یونانی نے، جس کا سینٹ لوئس میں ایک تھیٹر تھا، اپنے آپ کو مشکلات میں گھرا ہوا پایا تو جارج کا شہرہ سن کر اُس سے مدد کی درخواست کی۔ جارج نے یونانی کے اندازے سے کہیں بڑھ کر اُس کی قیمت لگائی اور وہ تھیٹر خرید لیا۔ پھر فوراً ہی وہ سینٹ لائس چلا آیا اور خود کو فلم لائن میں ضم کر دیا۔ ایک سال کے اندر اندر اُس نے پیو لائڈ تفریح گاہوں کا جال سا بچھا دیا۔ جہاں نہ صرف وہ خود بہترین فلمیں پوری دلچسپی سے دیکھتا، بلکہ تماشائیوں کے آرام اور سہولت کا بھی اتنا اچھا انتظام کر دیا کہ لوگ اُس کی تفریح گاہوں کے دیوانے ہو گئے اور دیگر کاروباری لوگ اُس پر رشک کرنے لگے۔ وہاں اُس نے ایک نرسری بھی بنوائی، جہاں مائیں اپنے بچے چھوڑ جاتی تھیں۔ ٹیلی ویژن کمرا بنوایا۔ غرض کوئی بھی چیز، جس سے اُس کی تفریح گاہوں کا رخ کرنے والے لطف اندوز ہوں، انھیں سکون اور آرام کا احساس ہو اور اُن کا دل لگ سکے، مفت میں دی جانے لگی۔

نتیجے میں پیولائڈ پیلس کا شہرہ آسماں گیر ہوا اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے لگا۔ دس سال کے اندر اندر پورے امریکا کے ہر بڑے شہر میں پیولائڈ تفریح گاہیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ اب جارج پیولائڈ تفریحی دنیا کے بلند ترین مقام پر کھڑا تھا۔ آخر کار اُس نے اپنے ریستوران فروخت کر دیے اور پوری طرح اپنے تھیٹروں کی سلطنت سنبھالنے لگا۔

یہی وقت تھا جب وہ میکمانس کے جھگڑے میں پھنسا، جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا اور خود اُن دونوں کو بھی اس جھگڑے میں اپنی تباہی نظر آنے لگی۔ جھگڑا اُس وقت سے شروع ہوا جب جارج نے میکمانس کی ایک فلم اپنی تفریح گاہوں میں چلانے سے انکار کر دیا۔

"خراب فلم۔" جارج نے عام لوگوں میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ "میکی کی فلم بچوں تو کیا، اُن کی ماؤں کے قابل بھی نہیں۔ ہم اپنی تفریح گاہوں میں قائم تھیٹروں میں میکی کی کوئی پکچر نہیں لگائیں گے۔"

ظاہر ہے، میکمانس اُس تبصرے اور اقدام پر بُری طرح بھنایا مگر خوش قسمتی اُس کے ہم رکاب تھی۔ میکمانس کی یہ فلم دوسری جنگوں پر خوب چلی اور اُس نے بڑے فخریہ انداز میں اپنے حلقے میں اپنی فنکاری کے دعوے کیے۔

"یہ یونانی بٹلر فلمیں تو دیکھ لیتا ہے۔" اُس نے طنزیہ انداز میں کہا "مگر اُن کی باریکیاں کہاں سمجھ سکتا ہے؟"

یونانی بٹلر کا طعنہ جارج کے لیے انتہائی بھاری ثابت ہوا۔ زندگی میں پہلی بار لوگوں نے جارج کو غصے میں دیکھا۔

"آسٹریلینڈ کا یہودی، خراب نالی کا کیڑا۔" وہ غرایا۔

اور اس طرح دونوں میں شدید جنگ چھیڑ گئی۔

اب پیولائڈ تفریح گاہوں کے ہر تھیٹر کے دروازے

www.urdugem.com

میکمانس کی ’انٹر ورلڈ فلمز‘ کے لیے بند تھے۔ جواب میں ’انٹر ورلڈ‘‘ کی کوئی فلم ’پیولانڈ تفریح گاہوں‘ کے لیے بُک نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ دونوں شدید چپقلش کے باوجود اپنی اپنی راہوں پر بڑی کامیابی سے گامزن رہ سکتے تھے مگر محض اتفاقاً ہی دونوں سے بیک وقت ایک عظیم غلطی سرزد ہو گئی۔

جارج نے اپنے تھیٹروں کے لیے ’لائف اوا سکوپ‘ نامی تھیٹر کے جملہ حقوق خرید لیے۔ اس کے اداکار نہ صرف اسٹیج سے باہر آ کر تماشائیوں کے پاس بیٹھا کرتے تھے، بلکہ شو کے اختتام پر اُن کے گھر بھی چلے جاتے۔ یہ سارا کام اُس نے جس خاموشی اور تیزی سے کیا، اُسی خاموشی اور تیزی سے میکمانس نے بھی ’لائف اوا سکوپ‘ کے کیمرے، ساؤنڈ اور ری پروڈیوسنگ سامان کے جملہ حقوق اپنے نام خرید لیے۔

جب انھیں ایک دوسرے کے اس سودے کا علم ہوا تو دونوں چکرا کر رہ گئے۔ اس خبر نے فلمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا کیونکہ معاہدے کے تحت اب میکمانس کی فلمیں صرف پیولانڈ تھیٹروں میں دکھائی جا سکتی تھیں اور پیولانڈ تھیٹر صرف میکمانس کی فلمیں لگا سکتے تھے۔ ایک طرف یہ عالم تھا اور دوسری طرف دونوں کی ضد اور ہٹ دھرمی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک دوسرے سے مل کر معاملات طے کرنے کے بجائے دونوں دیوالیہ ہو جانا پسند کریں گے۔

دونوں پر ناقابل برداشت حد تک دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہ صرف اُن کی ذات کا سوال نہیں تھا بلکہ یہ فلمی دُنیا کے دو ایسے بڑوں کی بات تھی جن پر ہزاروں لوگوں کے روزگار کی ذمے داری تھی۔ آخر ایسی خبریں سنی جانے لگیں کہ دونوں نے اپنے درمیان حائل یہ آہنی دیوار گرانے کے لیے ایک کانفرنس میز پر بیٹھنا منظور کر لیا ہے۔

یہ اجلاس سانتا باربرا کے غیر جانب دار مقام پر ہونا قرار پایا۔ خاص احتیاط اور چھان بین کے بعد چند فوٹوگرافروں اور رپورٹروں کو بھی یہ اجلاس دیکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ معاہدے کے مطابق دونوں بڑوں کے ساتھ ایک ایک اٹارنی اور ایک سیکرٹری کی موجودگی منظور کر لی گئی تھی۔

بڑے غور و خوض کے بعد ایک مسودہ اور نظام الاوقات بنایا گیا۔ جس کے مطابق مقررہ اکھاڑے میں پنسل اور کاغذ کے ساتھ آنے والے سیکرٹریوں کو متعارف کروایا گیا، پھر بیک وقت بریف کیس ہاتھ میں لٹکائے دونوں بڑوں کے قانونی مشیر آئے اور اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔

ٹھیک دس بجے کانفرنس میز کے مخالف دروازوں سے دونوں بڑے اندر آ گئے تاکہ اپنے سیکرٹریوں اور وکلاء کی مدد سے مسئلے کا حل تلاش کر سکیں اور ہو سکے تو یہ جمود توڑنے کے لیے کوئی معاہدہ کر سکیں۔ کانفرنس کمرے کے دروازوں کے پیچھے وکلاء، جنرل منیجروں، نائب صدور اور پریس نمائندوں کا ہجوم تھا۔

ایک ہی منٹ بعد باہر موجود لوگوں میں سے ایک شخص، جو چابی کے سوراخ سے آنکھ لگائے اندر کا منظر دیکھ رہا تھا، چلا پڑا، ’’میرے اللہ! وہ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔‘‘

دراصل اُسے ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے دونوں بڑے میز پر کھڑے ایک دوسرے کے بال کھینچ رہے ہیں، گریبان پھاڑ رہے ہیں اور شاید غصے میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں؛ لیکن ایسا نہیں تھا، حقیقت مختلف تھی۔

جیسے ہی دونوں بڑے میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے۔ جارج اس طرح میکمانس کو دیکھنے لگا جیسے اس کے سامنے کوئی بھوت بیٹھا ہو۔ تاہم اس عظیم فلم پروڈیوسر میں بھوت جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بھی یونانی پیولانڈ کی طرح بھاری جسم اور اچھی صحت کا مالک تھا۔ چوڑی پیشانی، گھنی بھنویں اور تیز نیلی آنکھیں اُسے خاصا باوقار بنا رہی تھی۔ اُس نے انتہائی نفیس تراش کا گہرا سوٹ اور اُس سے میچ کرتی ہوئی شرٹ پہن رکھی تھی اور ایک شاندار بولگا رکھی تھی۔ صرف ایک چیز غیر معمولی تھی کہ اُس نے ایک ایسا. . . ’’یہ ہیٹ!‘‘ میکمانس کے سر پر رکھے سال خوردہ اور پچکے ہیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جارج چلایا، ’’یہ ہیٹ تم نے کہاں سے لیا؟‘‘

میکمانس اس غیر متوقع بات سے جھلا گیا۔ آج تک کسی نے اُس ہیٹ کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا چہ جائیکہ یہ پوچھنا کہ اُس نے اُسے کہاں سے لیا تھا۔

’’تمھیں اس سے کیا. . .‘‘ اُس نے کہنا چاہا۔

مگر اس سے پہلے ہی جارج میز پر گھونسا مار کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ’’یہ میرا ہیٹ ہے جو چالیس سال پہلے گم ہو گیا تھا۔‘‘ وہ دہاڑا۔

پھر باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی، دونوں طرف سے چھینا جھپٹی اور دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔

’’چھوڑو بدمعاش!‘‘

’’میرا ہیٹ، میرا ہیٹ، میرا پرانا دوست۔‘‘

’’میرا ہیٹ واپس کرو۔‘‘

’’میرا ہیٹ واپس کرو۔‘‘

’’او بدمعاش! تمھیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔‘‘

پھر اچانک جارج پیچھے ہٹ گیا۔ ہیٹ اُس کے ہاتھوں میں تھا اور اُس کی انگلیاں شدت جذبات سے لرز رہی تھیں۔ دونوں کے سیکرٹریوں اور قانونی مشیروں کی نظریں میکمانس کے ننگے سر پر جمی ہوئی تھیں۔ برسوں بعد اتنے اچانک اور ڈرامائی انداز میں انھوں نے اُسے ننگے سر دیکھا تھا، لیکن وہاں کوئی بھی غیر معمولی بات نہیں تھی، صرف بھنووں کی طرح کے کچھ بال تھے۔ کیا یہ بھی کوئی راز تھا؟

ہیٹ ہاتھ میں پکڑے ہوئے جارج اُسے بے تابی سے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا، پھر اُس نے ہیٹ اپنے سینے سے لگا لیا۔ ’’میرا ہیٹ، میرا ہیٹ، میں اسے خوب پہچانتا ہوں۔‘‘ اس کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔ ’’میں جانتا ہوں کہ تمھیں یہ ہیٹ کہاں سے ملا تھا۔‘‘ وہ میکمانس کی طرف دیکھ کر چلایا ’’کارنتھ نہر کے پُل کے نیچے سے ایک جہاز جا رہا تھا تو تیز ہوا اسے اڑا کے جہاز میں لے گئی تھی۔‘‘

میکمانس کا سارا غصہ اور جھنجھلاہٹ ہوا ہو گئی اور اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

’’میرے اللہ!‘‘ وہ گلوگرفتہ آواز میں بولا، ’’تم کیسے جانتے ہو؟‘‘

’’کیونکہ......‘‘ جارج اُسی انداز میں ہیٹ گھماتے اور لہراتے ہوئے بولا، جس انداز میں وہ برسوں پہلے پُل پر کھڑا اُسے گھما اور لہرا رہا تھا، ’’میں ہی وہ شخص ہوں جس کے ہاتھوں سے یہ ہیٹ چھوٹ گیا تھا۔‘‘

’’اوہ نہیں۔‘‘ میکمانس کے منہ سے ایک کراہ سی نکل گئی۔ اچانک وہ اپنی عمر سے بیس سال بڑا نظر آنے لگا تھا، ’’تم سچ کہتے ہو۔‘‘ وہ مدھم آواز میں بولا۔ ’’دنیا میں اور کوئی نہیں جسے یہ بات معلوم ہو۔‘‘ پھر اس نے ملتجیانہ انداز میں اپنے مخالف کی طرف دیکھا، ’’یہ ہیٹ مجھ سے مت چھینو۔‘‘ اُس کی آواز بھیک مانگ رہی تھی۔ ’’یہ مجھے فروخت کر دو۔ تم جو مانگو گے، میں اس کے عوض دینے کو تیار ہوں؛ تم صرف نام لو۔‘‘

یہ اس کی فطری نیکی تھی کہ اس نے سچائی تسلیم کر لی اور جارج سے زبردستی ہیٹ کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا۔ جارج پیولانڈ بھی ایسا آدمی نہیں تھا جو اپنے دشمن کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا۔ میکمانس کی حالت دیکھ کر اس کا دل پگھل گیا، ’’تم یہ ہیٹ کیوں مانگ رہے ہو؟ تمھارے لیے بھلا اس کی کیا اہمیت ہے؟‘‘ اُس نے نرمی سے دریافت کیا۔

ایک لمحے کے لیے میکمانس نے اپنے مقابل کا جائزہ لیا، پھر یہ فیصلہ کیا کہ سچ بولنے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک بہت بڑی بازی تھی جسے جھوٹ بول کر ہارنے کا خطرہ وہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

’’یہ میرا خوش قسمت ہیٹ ہے۔‘‘ وہ بولا، ’’یہ لہراتا ہوا پُل پر سے جہاز پر گرا اور میں نے اُسے سر پر رکھا۔ بس تب سے ہی میری قسمت جاگ اٹھی۔ اسی جہاز پر میں اس لڑکی

www.urdugem.com

سے ملا جو میری بیوی بنی۔ اُس آدمی سے بھی جس نے میری پہلی فلم میں پیسا لگایا۔ میں ہیٹ اُتارتا ہوں تو بڑی غلطیاں کرتا ہوں، مگر جب یہ میرے سر پر ہوتا ہے تو میری ذہانت کو پر لگ جاتے ہیں۔"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "یہ میں نہیں ہوں جس نے 'انٹرورلڈ پکچر' بنائی، بلکہ اُس کا بانی یہ ہیٹ ہے۔ مجھے ہمیشہ سے اس کا احساس رہا ہے۔ یہ ہیٹ ہی تھا جس نے ہمیشہ صحیح بات سوچی اور صحیح فیصلے کیے۔ "دی باڈی آف لو" جیسی فلم بھی فلاپ ہونے کے بجائے ہٹ کیوں ہوئی؟ صرف اس ہیٹ کی وجہ سے۔"

"ہا!" جارج چلایا، "تو تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ پکچر خراب تھی۔"

میکمانس نے بڑی بے چارگی سے جارج کو دیکھا اور پھر اُس کی نظریں جارج کے سینے سے لگے ہیٹ پر جم گئیں۔ اُس کی خاموشی جارج کی تائید کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے..." جارج پیولانڈ بولا، "اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں کیا کروں گا۔ میں تمھیں یہ ہیٹ دیتا ہوں اور یونانی یتیم بچوں کے فنڈ میں دس لاکھ ڈالر بھی دوں گا۔"

میکمانس کے چہرے پر ایسی رونق آ گئی جیسے عدالت نے اُس کی جاں بخشی کا حکم سنا دیا ہو۔ آہستہ آہستہ اُس کا ہاتھ ہیٹ کی طرف بڑھا، جو جارج نے میز پر رکھ دیا تھا۔ میکمانس نے اُسے اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس کی گم شدہ عمر بحال ہو گئی اور وہ جوان اور پُراعتماد نظر آنے لگا۔

"او کے۔" جارج بولا۔ اُس کا چہرہ اندرونی مسرت سے چمک رہا تھا، "اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ ہم دونوں کیا کریں۔ ہم دونوں ہی ریاست ہائے متحدہ امریکا کے یتیموں کو ایک ایک ملین ڈالر دیں گے، کیونکہ یہی وہ ملک ہے جہاں ہم جیسے خستہ حال لوگ کروڑ پتی بن گئے۔"

"مجھے منظور ہے۔" میکمانس نے خوش دلی سے کہا۔

"اور اب۔" جارج اُس کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا، "تم نے چالیس سال تک میرا ہیٹ پہنا ہے۔ اور جس نے چالیس سال تک میرا ہیٹ پہنا، وہ میرا بھائی ہے۔ میں بھائیوں سے نہیں لڑتا۔ آج سے میکمانس پکچرز پیولائڈ تھیٹروں میں چلیں گی۔"

"میکمانس انٹرورلڈ پکچرز صرف پیولائڈ تفریح گاہوں کے لیے بُک ہوں گی۔" میکمانس نے یقین دہانی کروائی۔

"لیکن..... اگر میں کسی پکچر کو خراب کہوں..... تو وہ خراب ہو گی۔"

ایک رنگ سا میکمانس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ اُس نے بڑے پیار سے اپنے سر پر رکھے ہیٹ کا کنارا سہلایا، "ہاں، وہ خراب ہو گی۔" اُس نے کہا۔

دونوں نے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی سے ملائے۔

اُس رات جارج گھر پہنچا تو چلا اُٹھا۔ "صوفیا! تمھیں پتا ہے، آج کیا ہوا؟ آج مجھے میرا وہ ہیٹ مل گیا جو میں نے کارنتھ نہر سے گرا دیا تھا۔ تمھیں پتا ہے، اُس کے نیچے کون تھا؟..... میکمانس! اب وہ میرا بھائی ہے۔ اب ہم جھگڑا نہیں کریں گے۔ یہ میرے لیے بڑا ہی خوش نصیب دن ہے۔ آہ! وہ وقت کتنا اچھا تھا جب میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جہاں میرا ہیٹ جائے گا، وہیں میں جاؤں گا۔"

صوفیا پیولائڈ کو عمر نے اور بھی حسین اور باوقار بنا دیا تھا۔ وہ پورے سان فرانسسکو میں بہترین ماں کی حیثیت سے خاصی محترم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے قریب گئی جو اپنے گھنگھریالے بالوں سے ڈھکے سر سے لے کر چمکدار جوتے کی نوک تک بڑا شاندار لگ رہا تھا۔

صوفیا نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور پیار سے بولی، "کتنی اچھی بات ہے بے وقوف آدمی! تم نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ جہاں تمھارا ہیٹ جائے گا وہاں تم جاؤ گے اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جہاں میرا دل جائے گا، وہیں میں جاؤں گی۔"

عبدالرحمٰن بابا نے کہا

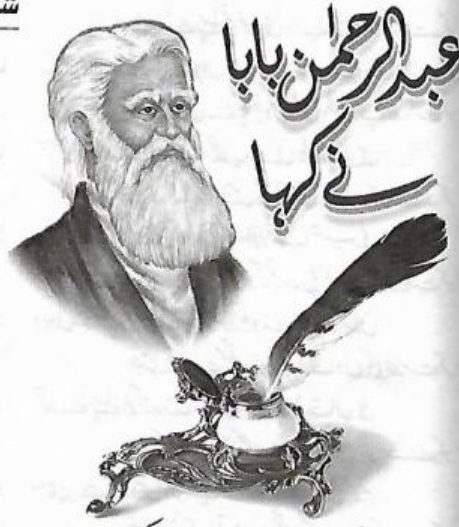

مشہور پشتو شاعر کی غزلوں کا فکر انگیز انتخاب

مترجم امیر حمزہ شنواری

پشتو کے شعرا میں عبدالرحمٰن بابا کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ آپ ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۰۶ء میں وفات پائی۔ آپ کی صوفیانہ شاعری امن اور محبت کی تلقین کرتی ہے۔ شاعری کا انتخاب درج ذیل ہے۔

وہ جس کی شادی میں بجتے ہیں ڈھول اور سرنا
اسی پہ کرتا ہے ماتم یہ دھر جلد بپا
اگرچہ کرتا ہے وہ دلبری و دلجوئی
نہ چھپ سکے گا مگر مجھ سے اس کا استغنا
کبھی تو یار وہ بنتا ہے اک گھڑی بھر کو
کبھی یہ حال کہ وہ مجھ سے آشنا ہی نہ تھا
بغیر عشق نہیں کچھ ہنر مرا ناصح
معاف کیجیے ناداں ہوں یا ہوں میں دانا

❁

کوئی فقیر جو سمجھے مجھے تو ہوں میں فقیر
کرے شمار امیروں میں بھی تو ہوں میں امیر
مجھے طلب ہے، تو ہے ہر صدقہ خوباں
یہ مت سمجھ کہ ہوں دولت کے واسطے دلگیر
گراں نہ خدمت خرقہ اگر ہوا ے ہمدم
تو میرے واسطے یہ مشغلہ ہے روح پذیر
میں پند لیتا بھی ہوں اور پند دیتا بھی
مرید ہوں میں کسی کا، تو ہوں کسی کا پیر
خیال یار ہے یوں ہجر میں رفیق مرا
ہوں قید خانہ میں یوسف کے ساتھ گویا اسیر
نگاہ خلق سے پنہاں یہ سوز خود دلگیر
جہاں میں اس سے تو بڑھ کر نہیں ہے آزادی
کہ اب ہے زیب گلو زلف یار کی زنجیر
رخ حبیب کو جی بھر کے دیکھیے رحماں
کہ سن رہا ہوں جدائی کی آہٹی ہے نفیر
مرے غلام ہیں خوشحال خاں و دولت خاں
زبان پشتو کا رحماں میں ہوں عالمگیر

❁

جہاں سے جا کے دوبارہ نہیں ہے لوٹ آنا
کرو گے زشت کہ زیبا تو ہے یہی دنیا
جو پانی بند پہ چڑھ کر بہا، نہ واپس ہو
نہ لوٹ کر کبھی آئے جو وقت ہے گذرا
گیا جو وقت اسے مردہ لحد سمجھو
بتاؤ، گریہ سے مردے کو زندہ کسی نے کیا
اگر ہو صاحب مقصود وقت ہے کوتاہ
یہ مت سمجھ کہ تیری عمر کو رہے گی بقا

www.urdugem.com

جو سہل سمجھا ہو دل میں کوئی ہدف تم نے
اگر غرور ہے دل میں تو وہ ہدف ہو خطا
دھن شکستہ ہو جب مرگ کے تپنچے سے
تو کر سکو گے شکستہ دھن سے کیسے شنا
یہ سب اشارہ ہے تیری طرف، اگر سمجھو
اگر ہو تم نے کبھی عورتوں کا بین سنا
نہیں ہو طفل، کہ تعلیم ہو بہ جبر تری
ہو عاقل اور سمجھدار و بالغ و دانا
اگر ہو فہم تو ہو امتیاز نیک و بد
رہے یہ فکر کہ کسی میں برا ہے کسی میں بھلا
سوال تجھ سے یہ ہوگا ترا عمل کیا ہے
نہ یہ کہ نور نظر کس کا، سبط ہے کس کا
تو خود ہی نیک عمل کر نہ اس پہ ہو غرہ
کہ نیک بخت تھی مادر تو نیک تھا بابا
کسی سے کیا ہے غرض، ہے مخاطب خود سے
خفا نہ ہو جو لیا میں نے یاں ہے نام ترا
میں اپنا آپ مخاطب ہوں، نام لوں جس کا
کسی سے واسطہ کیا میرا، اور غرض ہے کیا
جو مرگ و نزع کی ہیں سختیاں تجھے درپیش
تو اس سے قبل ہی رحماں، تو کیوں نہیں مرتا

❁

بند بنا دے باڑہ[1] پر، پھر کشت و زراعت کر
دنیا ہی میں تقویٰ سے عقبے کی حفاظت کر
عاقل آگے بڑھتے جائیں اور قضا کو بھی دیکھیں
عقبے کے سب کاموں پر، دنیا ہی میں سبقت کر
ہدف ملامت عالم میں، بنتے ہو جب لوگوں کے
اس سے پہلے تم خود ہی، اپنے تئیں ملامت کر
تلنے والا ہے جبکہ، میزاں میں سب نیک و بد
خود میزاں لے ہاتھوں میں، خود آپ عدالت کر
حرص و ہوا کے لشکر جب، تجھ پہ ماریں یلغاریں
قلعہ اپنے مامن کا تقویٰ و قناعت کر
یہ کب ممکن ہے رخ ہو، حق کا، اور قفا تیری
حق کے طالب ہو گر تم، رخ کو سوئے حقیقت کر
وہ دل جو ہے عرش اللہ، دیکھو ڈھونڈو، ہے وہ کہاں
جتنا تجھ سے ممکن ہو، ہر اک دل کی خدمت کر
تجھ سے پہلے جو گزرے، وہ بھی تو تھے انساں ہی
ان کی ماند آ تو بھی، انسانوں کی خدمت کر
دانا پر ہے یہ روشن، دنیا کے ہیں فانی کام
اس فانی کو باقی میں، رنگیں کر، یوں حکمت کر
جب تک حق مل جائے نہیں، رجعت کا تو نام نہ لے
آگے بڑھتا جا طالب، اک عالم کو لت پت کر
اے رحمان پہلے تو خود، سن نصیحت دانا کی
بعد اس کے تو اوروں کو، چاہے تو نصیحت کر

❁

گاہ گرمی سے تڑپنا، کبھی سردی سے لرزنا
کبھی بسیار خوری سے ہے کبھی بھوک سے مرنا
نہ یہاں سیر کو تسکین ہے نہ بھوکے کو تسلی
وہ جو دنیا میں ہے آیا، اسے کرنا پڑا غوغا
کبھی ماتھے کو اٹھے ہاتھ، تواضع ہو کسی کی
کبھی باہم چلے شمشیر و ساں تیر و کٹارا
خاک انساں کی فرشتوں نے کی جس وقت فراہم
تو اسے رنج و الم سے غم و اندوہ سے گوندھا
سامنا ہونا ہے اسکا، جو قوی اس سے ہے بڑھ کر
کیا ہوا آج جسے کشتن و بستن کا ہے یارا
کارواں ہے جو رواں ہے، کوئی یاں رہ نہیں سکتا

[1] باڑہ۔ وہ پانی جو علاقہ تیراہ کے باڑہ نامی گاؤں آتا اور پشاور کے بیشتر علاقہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کے متعلق پشتو میں ضرب المثل ہے: ''باڑے کا ایک پیالہ پانی سو من گھی سے بڑھ کر ہے۔'' (مترجم)۔

ہے اسی راہ کا راہی، ہو کوئی پیر کہ برنا
زلف دلدار کا ہر فرد، جہاں میں ہے طلبگار
یہ ہمہ خورد و کلاں کیا؟ یہ ہمہ شاہ و گدا کیا
مثل رحماں اسے کرتے تھے سلام آج ہزاروں
مگر اس ترک نے جانے کسے منظور کیا تھا

❁

غیروں کے عیب ہی پر، جب یوں تجھے نظر ہو
پھر اپنے عیب سے تم کیوں ایسے بے خبر ہو
غریبوں میں عیب دیکھا، گر ایک دانہ جو
بڑھ کر تیری نظر میں، وہ کوہ سے مگر ہو
تیرا قصور گرچہ اک کوہ سے بڑا ہو
حیلے سے تیرے کمتر، جیسے مگس کا پر ہو
گر تیرے ہاتھ میں دے، میزان عدل کوئی
ٹٹولو بھی تیرا بھاری، غیروں کے اسپ پر ہو
لعنت ہو اس پہ، تیری گر منصفی یہی ہے
یوں حق سے سوئے باطل، تیرا اگر گذر ہو
بخشا مقام تجھ کو، حق نے ملائیکہ کا
اپنے عمل سے بنتے، تم خود ہی گاؤ خر ہو
ہوتا نہیں ہے تجھ سے، جب شکر نعمتوں کا
پھر اس سے زحمتوں پر، کیوں تیرا شور و شر ہو
گر بال ٹوٹ جائے، اک بھی تیرے بدن کا
شکوہ شکایتیں ہوں، حق سے، وہ بد گہر ہو
دیتا نہیں عدو کو، کوئی نصیحت اچھی
رحماں ہے تیرا ہمدم، باور تجھے اگر ہو

❁

فہم میں اپنے کسی کی نہ اگر ہو تقصیر
جو مقدر ہے نہ تدبیر سے ہو وہ تغیر
پیش آنا ہے جو جس کے ہو مقدر میں لکھا
ہو کسی کے نہ اگر پیش نظر بھی تقدیر
بخت بیدار ہے جن کا انھیں غم ہی کیا ہے
کچھ بھی ان کو جو نہ ہو تاب و توان شب گیر
ہے ہماری ہی تو کم فہمی جو یہ کہتے ہیں
کہ فلاں سے نہیں ہوتی ہے تلاش و تدبیر
اپنے بس ہی میں کسی کے ہو جو شادی و غمی
کوئی انساں بھی نہ اپنے کو بنائے دلگیر
کور ہو جائے وہ، اتنا بھی نہ سوجھے ہے جسے
کہ ہر اک چیز میں ہے معرفت رب قدیر
آدمی جب متمدن ہے تو محتاج بھی ہے
بادشاہ بھی ہے جہاں میں، تو ہے محتاج وزیر
کونسا نغمہ شادی ہوا دنیا میں بگوش
بن کے رہ جائے نہ، جو آہ و فغاں کی تصویر
یہ علامات قیامت جو نہیں، پھر کیا ہیں
کہ پسر پر نہیں، کچھ پند پدر کی تاثیر
کام ناصح سے بھی ہوتے ہیں کچھ ایسے سرزد
منفعل جن سے کہ ہوں سارق و عاصی کبیر
قبر مردہ پہ وہ تکبیر کہے اور چل دے
بے نیاز اس سے کہ اس پر بھی تو ہوگی تکبیر
وہ نہ دم بھر کو کبھی تکلیف سہے بہر خدا
عمر بھر ہو غم دنیا میں پریشان و اسیر
مال کیا؟ سر سے بھی جائے وہ گذر بہر عیال
پارہ ناں سے نہ دلجوائے مسکین و فقیر
خوب سنتا ہے نوا، ہجر کی رحماں لیکن
پھر بھی جی بھر کے نہ جاناں کو جو دیکھے، تقصیر

❁

اک جہان غم نے بھی گر دل کو تیرے آلیا
ہو نہ دل برداشتہ سمجھو کہ آیا اور گیا
غم وہی ہے اصل میں اس وقت جو موجود ہے
غم بھلا دیتا ہے ماضی کے جو یہ وارد ہوا

www.urdugem.com

آدمی کا حال ہے گا ہے چنیں گا ہے چناں
ایک ہی حالت پہ جو ہے وہ ہے ذاتِ کبریا
ہے کتابت ایک ہی جو کہ زبر ہو گاہ زیر
ایک ہی آدم ہے کس کس رنگ میں جلوہ نما
کارہائے دھر کو ممکن نہیں اک جا قرار
اک جھپک میں ہو کے رہتا ہے جہاں میں کیا سے کیا

✿

دنیا سے یوں ہو کوچ نہ ان کو پسند تھا
بستر تھے جن کے عنبر و چندن سے مشک زا
سیلاب ہے اجل تو یہ دنیا ہے مثل پل
دیکھو تو پھر مقابل سیلاب پل ہے کیا
دولھا دولہن کو قبل عروسی ہو بیوگی
کچھ یوں ہی کارہائے اجل کا ہے تھما
مخلوق کے جو قافلے دنیا میں آتے ہیں
یاں، سب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی نہیں رہا
حاصل ہیں اس سفر میں، انھیں کو سہولتیں
توشہ جنھوں نے قبل سفر ہی بنا لیا
وقتِ عمل ہو خواب میں، پھر منفعل بھی ہو

☆☆☆

ایسوں کی جو بھی نوچ دے داڑھی تو ہے روا
مایوس کیجیو اسے ہرگز نہ اے خدا
جس کو جہاں میں تیرے کرم کا ہو آسرا
مایوس ہوں میں رحم سے تیرے، تو کس طرح
جبکہ رحیم نام ہے ناموں میں اک تیرا
انساں کو بھی عزیز، بہ ایں عجز، نام و ننگ
پھر کیوں نہ ہو اسے کہ ہے قادر مرا خدا
ممکن نہیں کہ بندہ کوئی برگزیدہ ہو
جب خط برگزیدگی تجھ سے نہ ہو عطا
شوماں دھر کی ہے یہ اپنی ہی شومیت
ورنہ تیرا تو دستِ کرم ہے کھلا ہوا
ممکن نہیں کہ گوہر مقصود مل سکے
تجھ بن کسی کے سر میں جو سودا ہو غیر کا
اخلاص سے جو راہ پہ تیری قدم رکھے
رحماں سے آ کے مانگے جو اس کا زیاں ہوا

✿

غزل

تجھ مجھ میں کچھ عجیب ہی جھگڑا دکھائی دے
جس کی بھی سُن کے دیکھیے، سچا دکھائی دے

برسوں میں جا کے جو نیا منظر کشید ہو
دو چار پل میں ہی وہ پُرانا دکھائی دے

آنکھوں سے پونچھ لیجیے آنسو، کہ آپ کو
اک اور شخص سامنے روتا دکھائی دے

ہم میں جو فاصلہ بھی نو دس قدم کا ہے
نو دس قدم کے بعد بھی اُتنا دکھائی دے

ہم گلستاں کے قیدی، ہمیں کیا دکھائی دے
آزاد ہوں تو وسعتِ صحرا دکھائی دے

تکیہ، چٹائی، کھیس ہوں زادِ سفر میں، پھر
حجرے میں لیٹ جاؤ کہ دنیا دکھائی دے

(مراسلہ: محمد سہیل الرحمٰن مظفر گڑھ)

حبیب اشرف صبوحی

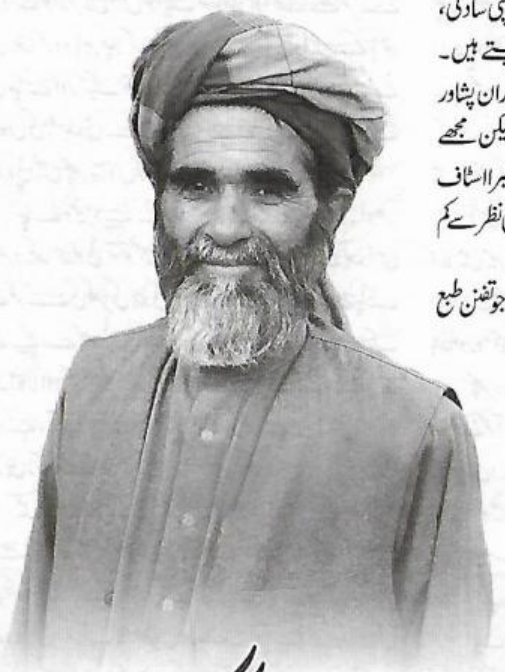

اس سادگی پہ...

بھولے پن کے دلچسپ واقعات جن کا سرا ضعیف الاعتقادی سے جا ملتا ہے

کسی دل جلے شاعر نے کہا تھا، ''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اللہ!'' میں سوچا ہوں کہ واقعی کچھ لوگ اپنی سادگی، بھولپن اور معصومیت سے لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک میں اپنی ملازمت کے دوران پشاور میں رہا۔ دفتر میں بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑا لیکن مجھے شاہ طور کا خیال آ رہا ہے جو میری تعیناتی کے دوران میرا اسٹاف نائب رہا۔ اتنے معصوم اور بھولے بھالے لوگ میری نظر سے کم ہی گزرے ہیں۔

یہاں میں کچھ واقعات درج کرنا چاہتا ہوں جو تفنن طبع کا باعث ہوں گے اور شاہ طور خاں سے وابستہ میری یادوں کا حصہ بھی۔ وہ مجھ پر بڑا اعتماد کرتا تھا۔ گھر کے سارے مسائل مجھے بتاتا۔ گھر خط مجھ سے لکھواتا تھا۔ اور پیسے وغیرہ بھی اُدھار مجھ سے مانگتا تھا۔

ایک دفعہ میں پندرہ روز کی چھٹی پر لاہور آیا۔ چھٹی کے بعد جب دفتر پہنچا تو ساتھیوں نے بتایا کہ آپ کو سب سے زیادہ شاہ طور خاں نے یاد کیا۔ وہ ایک ایک دن گنتا تھا۔ میں نے اُس کو بلا کر پوچھا کہ بھائی خیریت تھی۔ تم مجھے کیوں یاد کر رہے تھے؟

کہنے لگا کہ آپ سے بہت ہی ضروری کام ہے۔ چھٹی کے بعد بتاؤں گا۔

میں سوچ رہا تھا کہ شاید پیسے مانگنے ہوں گے۔ چھٹی کے بعد جب سارا عملہ چلا گیا تو میں نے اُس سے

www.urdugem.com

کہا کہ اپنا کام جلدی بتاؤ مجھے بھی گھر جانا ہے۔

کہنے لگا کہ آپ میرے کمرے میں چلیں۔ دفتر میں ہی سرونٹ کوارٹر میں اُس کو ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ مجھے کمرے میں بٹھا کر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا تو اُس کے ہاتھ میں چائے اور کیک تھا۔ میں نے کہا کہ اس کی تکلیف تم نے کیوں کی؟ جلدی سے کام بتاؤ؟ کہنے لگا کہ آپ یہ چائے وغیرہ پی لیں پھر بتاؤں گا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ اطمینان کرنے کے بعد اُس نے کمرے کی کھڑکی بند کی پھر دروازہ بند کیا اور اپنے پلنگ کے نیچے سے چھوٹی سی صندوقچی کھولی۔ اُس میں سے ایک لفافہ نکالا اور کہا کہ اللہ کے بعد میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ میرے بااعتماد جاننے والے ہیں۔ اس راز کو راز ہی رکھنا ہے۔

میں نے اُس کے ہاتھ سے لفافہ لیا، اُسے کھولا اور پڑھنے لگا۔ وہ کمپنی کی طرف سے ایک اطلاع نامہ تھا جس میں لکھا تھا: آپ کی ملازمت مستقل ہوگئی ہے۔ ملازمت کے دوران اگر آپ کا انتقال ہوجائے تو آپ اپنے خاندان میں سے کس کو نامزد کریں گے تاکہ آپ کے واجبات اُسے دے دیے جائیں۔

وہ کہنے لگا کہ نامزدگی کے خانے میں، مَیں اپنی بیوی کا نام لکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی کا نام پورے دفتر میں صرف آپ ہی کو پتا چلے اور کسی دوسرے کے علم میں نہ آئے۔

میں نے کہا کہ بھائی یہ فارم کئی ہاتھوں میں جائے گا۔ پہلے ایڈمن آفیسر پھر ریجنل دستخط کرے گا اور پھر ہیڈ آفس میں مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا پرنسپل ڈیپارٹمنٹ جائے گا۔ یوں سب کو آپ کی بیوی کا نام پتہ چل ہی جائے گا۔ بہتر ہے کہ آپ اپنے بیٹے کا نام لکھ دیں۔

کہنے لگا کہ بعض وجوہ کی بناء پر میں صرف بیوی کا ہی نام لکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی کہ صرف آپ میری بیوی کا نام چُنیے۔ اس لیے میں نے فارم بھر دیا۔ دوسرے دن شاہ طور رات کو ایڈمن آفیسر کے گھر گیا۔ اُس نے کہا کہ خیریت ہے، تم رات کو کیوں آئے؟ کہنے لگا، سر یہ فارم دستخط کروانے تھے۔ اس نے کہا کہ صبح دفتر میں لے کر آنا میں دستخط کردوں گا۔

اُس نے ایڈمن آفیسر کو جو پٹھان تھا، پشتو میں بتایا کہ خط میں میری بیوی کا نام لکھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی دوسرے آدمی کو میری بیوی کا نام پتا چلے۔ وہ اُس کی سادگی پر ہنسا اور دستخط کردیے۔

پھر وہ ریجنل منیجر کے گھر گیا۔ اُس نے بھی یہی کہا کہ صبح دفتر لے کر آجانا۔ وہ کہنے لگا کہ پہلے آپ کا چپڑاسی مجھے آپ سے ملنے نہیں دے گا۔ پھر آپ کا سیکرٹری نہیں ملوائے گا۔ اُس کو اپنا مدعا پشتو میں مختصر کرکے بتایا اور انتہائی عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ جب ان سب مراحل سے گزر گیا تو اس نے لفافے کو پہلے گوند اور پھر ٹیپ سے بند کرکے اپنے سامنے سپردِ ڈاک کیا۔

ایک روز میں شاہ طور کے کمرے میں کسی کام سے گیا۔ اُس کے کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا۔ کوئی پشتو گانا چل رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں ڈرائیور رہتا تھا۔ وہاں بھی ریڈیو پر وہی پشتو کا گانا نشر ہو رہا تھا۔

میں نے اُس سے کہا کہ جب ساتھ کے کمرے سے وہی آواز آرہی ہے تو تم اپنا ریڈیو بند کردو۔ کہنے لگا "صاحب ہماری بلال خاں ڈرائیور سے لڑائی ہے۔ میں اُس کا ریڈیو کیوں سنوں؟" اس بات پر میں نے سر پیٹ لیا اور کچھ نہ کہا۔

جب شاہ طور خاں ریٹائر ہوگیا تو اپنے واجبات کی وصولی کے لیے لاہور آیا۔ میں نے اُس کا کام کرنے کی خاطر دوڑ دھوپ کی۔ پتا چلا کہ کچھ دفتری پیچیدگیوں کی وجہ سے دو تین دن لگیں گے۔ میں اُس کو اپنے گھر لے آیا اور کہا کہ تم آرام سے رہو۔ جب دو تین دن میں اُس کا کام ہوگیا تو اُسے چھوڑنے اسٹیشن تک گیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور دعائیں دیتا رہا۔ راستے میں وہ مجھ سے کہنے لگا کہ صاحب، ہم آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں مگر آپ بُرا مان جائیں گے۔

میں نے کہا کہ نہیں تم بات کرو۔

کہنے لگا کہ آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا؟

میں نے کہا کہ تقریباً دس سال ہوگئے ہیں۔

وہ کہنے لگا کہ صاحب دس سال میں آپ کے صرف دو بچے ہیں؟

میں نے کہا کہ بھائی ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہوجائے اور یہ کسی قابل ہوجائیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے دس بچے پال لیے۔

کہنے لگا کہ آپ اپنا اور اپنی بیگم کا علاج کیوں نہیں کرواتے؟

میں نے اُسے بتایا کہ اللہ کے فضل سے میں بھی ٹھیک ہوں اور میری بیگم بھی۔

کہنے لگا کہ اب میں ریٹائر ہوا ہوں تو میرے ہاں بارھواں بچہ پیدا ہوچکا۔ ہمارے گاؤں میں اگر کسی کے دو بچے ہوں یا تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے یا دوسری شادی کرلیتا ہے۔

میں نے اُس سے کہا کہ اللہ کے لیے اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ میں سوچتا رہا کہ ان لوگوں کی سوچ کیسی ہے۔ ان کی سوچ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرو چاہے ماں باپ انھیں اچھی خوراک، اچھی تعلیم، اچھی پوشاک، اچھی سیر و تفریح مہیا نہ کرسکیں۔ بس اولاد زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔

ایک دن میں نے اُس سے پوچھا کہ تمہارے نام کا کیا مطلب ہے اور یہ کس وجہ سے رکھا گیا؟

کہنے لگا کہ ہمارے گاؤں میں نام قدرتی مناظر یا بہادری کی علامات دیکھ کر رکھا جاتا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو ہمارے گھر کے سامنے بہت بڑا پہاڑ تھا۔ اُس کی بلندی اور خوبصورتی دیکھتے ہوئے میرا نام شاہ طور رکھا گیا جس کا مطلب ہے کہ بڑا پہاڑ۔

کھٹی میٹھی باتیں

ایک نوعمر نے غالبؔ کو ایک خط لکھا، جس میں انھیں 'دادا' کے لفظ سے مخاطب کیا۔ نوعمر نے اپنی دانست کے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا تھا۔ غالبؔ نے اِس کے جواب میں اُس نوعمر کو لکھا:

میاں! تمہارے دادا میاں امین الدّین خان بہادر ہیں، میں تو تمہارا دل دادہ ہوں۔

☆☆☆

ایک ادیب نے دوسرے سے کہا، "میں نے تھوڑی بہت جرمن زبان سیکھ لی ہے، اب میں گوئٹے کا ترجمہ کروں گا۔"

دوسرے ادیب نے کہا، "بڑا مبارک خیال ہے، لیکن پہلے وہ زبان بھی تھوڑی بہت سیکھ لو جس میں ترجمہ کرنے کا خیال ہے۔"

☆☆☆

ملٹن سے کسی نے پوچھا، "اپنی لڑکیوں کو کتنی زبانوں میں ماہر کرنا چاہیے؟"

ملٹن نے جواب دیا، "عورتوں کی ایک ہی زبان سے بے چارے مردوں کو پناہ نہیں ملتی، اگر وہ چار زبانیں جان جائیں تو خدا کی پناہ!"

☆☆☆

امریکا کا صدر لنکن بڑا حاضر جواب شخص تھا۔ ایک بار کسی ملک کا سفیر اُس کے کمرے میں ناگہاں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ اپنا جوتا صاف کررہا ہے۔ اُس نے حیرت سے پوچھا، "کیا آپ اپنا جوتا صاف کررہے ہیں؟"

لنکن نے جواب دیا، "جی ہاں، لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کرتے ہیں؟"

www.urdugem.com

تجربات زندگی

نئے دور کے مشینی ساتھی

زمانے کے بدلتے رنگ ڈھنگ پر ایک اسّی سالہ قاری کا شوخ تبصرہ

حنیف ادیب

اللہ یہ کیا انقلاب آیا ہے کہ زندگی کا چلن ہی بدل کر رہ گیا۔ حالات وواقعات نے نیا روپ اختیار کرلیا ہے۔ پرانی قدریں دم توڑ کر رہ گئی ہیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لے لی۔ تہذیب وتمدن نے کچھ یوں کروٹ لی ہے کہ سب رنگ ہی بدل کر رہ گیا۔ وہ جو رنگ والے تھے، بے رنگ ہو کر رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ امیر امیر سے امیر تر ہوتا چلا جارہا ہے اور غریب غریب سے غریب تر ہو کر رہ گیا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معرضہ تھا اور معاشی چلن کا ایک روپ، ذرا اُوپر نظر اُٹھائیں تو جا بجا موبائل کا دھاوا ہے۔ جسے دیکھو کان سے موبائل لگائے پھرتا ہے۔ ایک پیر کاہ سے لے کر گل وشبنم کی اگر دوستی ہے تو موبائل سے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ملک میں موبائلوں کی برسات ہوگئی ہو۔

صاحب کام کاج سے فارغ ہو کر گھر آئیں گے تو نہ بات نہ چیت، بس صوفے پہ بیٹھتے ہی کان سے موبائل لگائے جانے کہاں سے ڈھیروں باتیں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ اللہ کے بندے، اتنا بڑا دن تو باہر گزر گیا کام کاج میں، یقیناً سارے دن ذہن کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی وا رکھے ہوں گے۔ باتیں بھی جی بھر کے کی ہوں گی۔ کبھی ضرورت کی بات تو کبھی کسی ملازم بیچارے کو ڈانٹ ڈپٹ۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ بھی گفتگو کا ایک ''خوبصورت انداز'' ہے۔ اس کا دوہرا فائدہ ہے کہ زبان کی خاطر خواہ ورزش ہوگئی اور فضا بھی اس ''خوبصورت انداز'' گفتگو کی موسیقی سے مسحور ہوگئی۔ اصل موسیقی کی بوریت سے بال بال بچ گئے۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی آیا چوکھا۔

اب ذرا کان کی میل صاف کر کے کچھ اور بھی سُن لیں! یہ جو کمپیوٹر میاں ہماری محفل میں آدھمکے ہیں تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے بڑے کام کی چیز ہیں۔ انواع واقسام کے کھانے پکے پکائے اس میں ملتے ہیں۔ جو چاہیں کھالیں اور جو چاہیں چھوڑ دیں۔ آپ کو مکمل اختیار ہے۔ اس ڈبے میں کھیل بھی ہیں، موسیقی کی لہریں بھی اور مطالعے کی بھی گنجائش، جو کتاب چاہیں پڑھ لیں۔ فیس بک فرینڈ شپ کا مقبول عام سلسلہ بھی ہے کہ گھر اور باہر دوستی کے رشتے اس متحدہ دور میں ناپید ہوگئے ہیں۔ بھلا ہو کمپیوٹر کے موجد کا کہ اس نے اس معاشرے اور تہذیبی کمی کو اتنی شدت سے محسوس کیا کہ اُسے کمپیوٹر میں لا کر ڈالا تاکہ ہزاروں کی دُعائیں لے سکے۔

مگر اب ہمارے ماحول میں دوست کم اور موبائل اور کمپیوٹر زیادہ نظر آتے ہیں۔ اب اگر دوستی ہے تو کمپیوٹر سے اور سنگت ہے تو موبائل سے۔ یہ دو اتنی بڑی ''نعمتیں'' مل گئیں لوگوں کو، کہ اب بھلا دوستوں سے گپ شپ کون لگائے؟ مفت میں اپنا سر کون کھپائے؟ جب چاہا موبائل کو ہمہ تن گوش کرلیا یا کمپیوٹر سے دوستی کرلی۔

ذرا آگے بڑھیں تو نئے دور کی اور بھی کئی نعمتیں ہیں۔ زیادہ تفصیل میں کون جائے، آپ کو بھی چھٹی دیتے اور ہم بھی اپنی راہ لیتے ہیں کہ سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے!

کمپیوٹر سائنس

راؤ محمد شاہد اقبال

ڈاکٹر سمارٹ فون

تندرستی کی بیش بہا دولت عطا کرنے والی ایپس کا نہایت مفید تذکرہ

رات کے آخری پہر کسی نے مجھے بُری طرح جھنجوڑ کر اُٹھایا۔ میں گہری نیند میں تھا، میری آنکھیں صحیح طرح کھل نہ پائیں۔ جیسے ہی میری آنکھیں روشنی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں، میرے سامنے میری چھوٹی بہن کا چہرہ آ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور وہ بار بار ایک ہی بات کی گردان کر رہی تھی ''بھیا! جلدی اُٹھو، بابا کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔''

میں نے جلدی سے بستر سے چھلانگ لگائی اور ساتھ والے کمرے میں بابا کے پاس پہنچا جہاں میری والدہ اور بھائی بہن پہلے ہی پریشان حال کھڑے تھے۔ بابا کی پیشانی پر اپنی ہتھیلی رکھی تو وہ آگ کی طرح تپ رہی تھی۔

ہم شہر کے مضافات میں رہتے ہیں۔ اس وقت آس پاس کسی اچھے ڈاکٹر کے ملنے کے بارے میں سوچنا بے وقوفی سے کم نہ تھا۔ رات کے اس پہر شہر تک جانا بھی بابا کی حالت کو دیکھتے ہوئے سود مند نہ تھا۔ بابا کو فوری طور پر ایسی طبی امداد کی ضرورت تھی جس سے اُن کی طبیعت کم از کم اتنی تو بحال ہو سکے کہ صبح انہیں پھر شہر کے کسی اچھے اسپتال تک لے جایا جاسکے۔

میں ابھی اسی شش وپنج میں مبتلا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں خیال کا ایک کوندا سا لپکا، میں نے فوراً اپنی چھوٹی بہن کو کہا ''ذرا، میرے کمرے سے میرا اسمارٹ فون تو لانا۔'' وہ بھاگی بھاگی گئی اور مجھے موبائل فون لا کر دے دیا۔ میں نے فوراً موبائل فون سے بابا کا بلڈ پریشر اور بخار چیک کیا پھر گھر میں موجود ادویہ میں سے ایک دوائی بابا کو دی جس سے کچھ دیر بعد اُن کی طبیعت میں قدرے بہتری آ گئی۔ اتنی دیر میں صبح کا اُجالا بھی ہو گیا، میں اپنے بابا کو لیے اسپتال پہنچا۔

ڈاکٹر کو رات کی ساری روداد تفصیل سے سنائی اور وہ دوا بھی دکھائی جو والد کو دی تھی۔ ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''کیا واقعی تم نے اپنے والد کو اتنی درست ابتدائی طبی امداد اپنے اسمارٹ فون سے چیک کرنے کے بعد دی تھی؟''

یقین دلانے کی خاطر ڈاکٹر کو اپنے موبائل میں موجود تمام میڈیکل ایپس دکھائیں جنہیں دیکھ کر اس نے مجھے خوب سراہا۔ یہ سچا واقعہ سرفراز کا ہے جس نے اپنے اسمارٹ فون کو بطور ایک ''میڈیکل ٹولز'' کے استعمال کرتے ہوئے بتایا کہ اگر کوئی چاہے تو اس جدید آلے کا مثبت استعمال بھی کر سکتا ہے۔ اس وقت دنیائے انٹرنیٹ پر بے شمار ایسی میڈیکل ایپس موجود ہیں جنہیں آپ انسٹال کر کے اپنے

www.urdugem.com

اسمارٹ فون کو گھریلو طبیب میں بدل سکتے ہیں۔ ہم آپ کے ذوقِ مطالعہ اور تجربہ کے لیے چند ایسی مشہور زمانہ موبائل ایپس کا تذکرہ کر رہے ہیں جنہیں دنیا بھر میں لاکھوں افراد شبانہ روز استعمال کر کے اپنی زندگی میں طبی آسانیاں پیدا کر رہے ہیں۔

آپ بھی چاہیں تو ان میں سے کسی ایک ایپ یا تمام کو اپنے زیرِ استعمال لا کر مستفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ہر ایپ کا استعمال صرف اُس پر دی گئی لوگوں کی آراء اور ہدایات مکمل طور پر سمجھنے کے بعد ہی کریں۔ یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی ایپ مکمل طور پر کسی کلینک میں موجود طبی سہولیات یا وہاں موجود تجربہ کار ڈاکٹروں کی طبی مہارت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی لیکن ایپس ابتدائی طبی معلومات و امداد حاصل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔

آپ کا اپنا ویب ڈاکٹر

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2EgjWZ7

ویب ایم ڈی (WebMD) نامی یہ موبائل ایپ اسمارٹ فون کو مکمل طور پر ایک ڈاکٹر میں بدل سکتی ہے۔ اس جدید ترین ایپ میں آپ اپنی بیماریوں کی مختلف علامات کا اندراج کر کے اپنی بیماری کی درست تشخیص کر سکتے ہیں۔ مرض کی تشخیص کے بعد یہ ایپ بیماری کے علاج میں معاون بہترین ادویہ بھی تجویز کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایپ کی مدد سے آپ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں ابتدائی طبی امداد کی مکمل تفصیلات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایپ دواؤں اور علاج کا مختصر لیکن جامع انسائیکلوپیڈیا بھی ہے جسے آپ روزانہ اپنے زیرِ مطالعہ رکھیں تو انتہائی اہم ترین طبی معلومات سے اپنے آپ کو اَپ ٹو ڈیٹ رکھ سکتے ہیں۔ اس مفید ترین ایپ کو اب تک دنیا بھر میں ایک کروڑ سے زائد افراد ڈاؤن لوڈ کر چکے ہیں جس سے آپ اس کی مقبولیت و افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اپنے خوابوں کو دیکھیں، موبائل کی آنکھ سے

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2DKcjZR

آپ کو رات کیسی نیند آئی؟ کیا آپ ساری رات بھرپور نیند لیتے رہے؟ یا صرف کروٹیں بدلتے رہے۔ رات کا وہ کون سا حصہ ہے جب آپ گہری نیند میں تھے؟ اور کس حصہ میں آپ بظاہر سو کر بھی جاگتے رہے؟ کب آپ نے اچھے خواب دیکھے اور کس وقت آپ بُرے خواب دیکھتے رہے؟ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو آپ کو رات بھر کی نیند کے بعد، صبح سویرے یہ ساری باتیں بالکل ٹھیک ٹھیک بتا سکے؟ یقیناً آپ کا جواب انکار میں ہی ہوگا۔

لیکن سلیپ سائیکل (Sleep Cycle) نامی ایک ایسا سافٹ وئیر ہے جو اگر آپ اپنے اسمارٹ فون پر انسٹال کرنے کے بعد رات کو سونے سے پہلے اپنے بستر کے قریب رکھ لیں تو یہ اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے بستر اور آپ کی رات بھر کی حرکات و سکنات ریکارڈ کرنے کے بعد آپ کی مکمل رپورٹ صبح آپ کے سامنے من و عن پیش کر دے گا۔ آپ کو ہر صبح اس بات سے بھی خبردار کرے گا کہ رات کو آپ نے جو نیند لی تھی یہ آپ کی صحت کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ اس موبائل ایپ سے آپ اپنی نیند کو بہتر کرنے کے بارے میں انتہائی مؤثر نسخے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

پیدل چلیں، اپنے اور فلاحی اداروں کے لیے

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2Fpf43i

سب جانتے ہیں کہ پیدل چلنا صحت کے لیے فائدے مند ہے، لیکن شاید آپ یہ نہ جانتے ہوں کہ آپ کے پیدل چلنے سے کئی فلاحی ادارے مالی امداد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ جی ہاں! یہ بالکل سچ ہے۔ اگر چیریٹی مائیلز (Charity Miles) نامی اس سافٹ وئیر کو آپ اپنے موبائل فون میں انسٹال کر لیں تو یہ سافٹ وئیر آپ کی صبح، شام یا رات میں کی گئی ہر واک کو مانیٹر کرے گا پھر آپ کی طرف سے ہر ایک

میل کی واک پر آپ کے منتخب کردہ فلاحی ادارے کو ۲۵ سینٹ سے لے کر ایک ڈالر تک بطور امداد دے گا۔ یعنی اب آپ پیدل چلیں، بھاگیں دوڑیں یا سائیکل چلائیں اور اپنی صحت مند زندگی کے ساتھ نیک کام میں حصہ دار بن کر خوب ثواب بھی کمائیں۔ گزشتہ سال سے اب تک اس ایپ کے ذریعے پانچ کروڑ ڈالرز مختلف فلاحی اداروں کو امداد کی مد میں دیے جا چکے۔

لے سانس بھی آہستہ۔۔۔!

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2EivbAr

سانس کے آنے جانے سے ہی ہماری زندگی کی ڈور بندھی ہوئی ہے۔ صاف ستھری فضا میں کیا طریقہ اختیار کر کے آپ اپنی سانس لینے کی صلاحیت میں اضافہ کر سکتے ہیں، یہ موبائل ایپ بخوبی سکھاتی ہے۔ جن افراد کو دمے یا سانس کی مختلف تکالیف ہیں، اُن کے لیے بھی ان موذی عوارض سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ اس ایپ پر موجود ہے۔ صرف ۱۵ منٹ اس ایپ کا روزانہ استعمال بہت کچھ آپ کی زندگی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ ایپ استعمال کے لیے بالکل مفت دستیاب ہے۔ حیران کن طور پر ایپ استعمال کرنے کے دوران کسی قسم کے اشتہارات بھی آپ کو تنگ نہیں کرتے۔

کچھ نظرِ کرم اپنی آنکھوں پر بھی کریں

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2DJexZE

اگر آپ کا سارا دن دفتر میں کمپیوٹر اسکرین کے سامنے گزرتا ہے جس کی وجہ سے آپ آنکھوں کی تھکن سمیت مختلف نوعیت کی تکالیف و شکایات کا شکار رہتے ہیں اور آئے روز ماہر امراضِ چشم کی طرف سے تجویز کردہ دواؤں اور بھاری فیسوں سے بھی پریشان ہیں تو ہمارے مشورے پر ایک بار اس موبائل ایپ کو اپنے اسمارٹ فون میں ڈاؤن لوڈ کر لیں۔ روزانہ صرف ۵ منٹ اس پر تجویز کردہ مختلف آسان ورزشیں کرنے سے آنکھوں کی بیشتر پیچیدگیوں و عوارض سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی جان چھڑا لیں گے اور وہ بھی کسی کلینک میں جائے بغیر، بالکل مفت میں۔

کبھی تو کانوں کی بھی کچھ سنیں

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2Fs1Z9h

فضائی آلودگی کے ساتھ ساتھ شور شرابا بھی ایک ایسی آلودگی ہے جس کی وجہ سے ہمارے کانوں کی قوتِ سماعت تیزی سے روبہ زوال ہو رہی ہے۔ قوتِ سماعت کے جملہ عوارض و مسائل سے بروقت خبردار اور تشخیص کے لیے اس سے بہتر موبائل فون ایپ دنیائے انٹرنیٹ پر موجود نہیں۔ اس ایپ کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اسے بین الاقوامی ادارہ برائے صحت نے مکمل طور پر جانچنے کے بعد اپنی تصدیق کے ساتھ اس کے عام استعمال کی اجازت دی ہے۔ ہمارے نزدیک تو صرف یہی ایک بات یہ ایپ استعمال کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس ایپ کے ذریعے آپ اپنی قوتِ سماعت کی نہ صرف درست جانچ بلکہ مختلف تجویز کردہ مشقوں کے ذریعے اپنی قوتِ سماعت میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔

ایتھلیٹ کا موبائل ٹرینر

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2DLv5Ee

اگر آپ ایتھلیٹ ہیں یا اچھا ایتھلیٹ بننا چاہتے ہیں تو یقیناً اسٹاروا (Starva) نامی یہ موبائل فون آپ کے لیے تحفے سے کم نہیں۔ اس ایپ کے ذریعے کوئی بھی ایتھلیٹ اپنی تمام تر سرگرمیوں کا نہ صرف ریکارڈ مرتب بلکہ اپنی کارکردگی کی جدید سائنسی بنیادوں پر جانچ پڑتال بھی بآسانی ملاحظہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایپ دنیا بھر کے ایتھلیٹ کا سوشل نیٹ ورک بھی ہے۔ اس سے اپنے آپ کو منسلک کر کے کوئی بھی دنیا بھر کی ایتھلیٹ کمیونٹی کا فعال حصہ بن جائے گا۔ یہ ایپ دنیا کے بہترین ایتھلیٹ سینٹرز کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے جہاں ہونے والی تمام سرگرمیوں کی تفصیلات آپ بھی براہ راست یا ریکارڈ شدہ ویڈیوز کی صورت میں دیکھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایپ بلاشبہ ایتھلیٹ کی جنت قرار دی جا سکتی ہے۔

www.urdugem.com

موسیقی سنیں اپنی اچھی فٹنس کے لیے!

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2DFZjVf

آپ نے اکثر و بیشتر سنا اور پڑھا بھی ہوگا کہ موسیقی روح کی غذا ہے لیکن فٹ ریڈیو (Fit Radio) نامی اس موبائل ایپ کا دعویٰ ہے کہ موسیقی آپ کو فٹ رکھنے کی بنیادی وجہ بھی ہے۔ یہ موبائل ایپ ریڈیو ایپ ہے جسے آپ اپنے اسمارٹ فون میں ڈاؤن لوڈ کر کے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ اس میں موسیقی کی ایسی دُھنیں نغمے، اور آوازیں ہیں جن سے آپ دورانِ ورزش یا جم میں ورک آؤٹ کرتے ہوئے لطف اندوز ہوں تو اس سے آپ کی فٹنس پر انتہائی اچھے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ موبائل ایپ بنانے والے اپنے دعویٰ میں کس قدر سچے ہیں یہ تو آپ اسے استعمال کر کے ہی جان سکتے ہیں لیکن لوگوں کی رائے بتاتی ہے کہ ایپ میں بہت سی ایسی اضافی سہولیات و معلومات دستیاب ہیں جو فٹنس کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ بس آزمائش شرط ہے۔

موبائل چلائیں، خوشیاں پائیں

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2rQ8n8F

کیا آپ جانتے ہیں کہ سائنسی طور پر غم کیا ہوتا ہے اور خوشی کیا ہوتی ہے؟ سائنسی اعتبار سے آپ غمزدہ ہیں یا خوش؟ ان تمام سوالات اور کیفیات کے جوابات آپ بخوبی اس انتہائی خوبصورت و دلکش موبائل ایپ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہیپی فائی (Happify) نامی یہ موبائل ایپ آپ کو اپنے ہر موڈ کے مثبت و منفی پہلوؤں کے بارے میں نہ صرف خبردار کرتی بلکہ سائنسی حوالے سے اس کی درست وجہ بھی آشکار کر سکتی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ اگر اس ایپ کے مطابق آپ غمگین ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں، یہ اپنے استعمال کنندہ کو غم کی وادی سے نکالنے کی بھرپور استطاعت بھی رکھتی ہے۔ یقین نہ آئے تو ایک بار ضرور ایپ استعمال کریں اور اس میں موجود بیش بہا ٹاسکس پر عمل پیرا ہو کر اپنا دامن خوشیوں سے بھر لیں۔

بھاگم بھاگ موبائل ایپ

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2EjxnaF

میپ مائی رن ۲۰۱۷ (Map My Run) دنیا کی سب سے بہترین "رننگ ایپ" کا اعزاز حاصل کر چکی۔ اس ایپ کے ذریعے آپ اپنے اسمارٹ فون کے جی پی ایس ٹریکر کی مدد سے اپنے دوڑنے کا مکمل دورانیہ، نقشہ، فاصلہ اور ضائع کردہ حراروں یعنی کیلوریز کی تفصیلات صرف ایک سنگل کلک سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اسپورٹس ایتھلیٹ کے لیے یہ ایپ بیش بہا تحفہ ہے۔ اگر آپ بھی اسکول، کالج، یونیورسٹی کی سطح پر بطور ایتھلیٹ یا ریسر کے مختلف مقابلوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں تو یہ ایپ یقیناً آپ کی کارکردگی میں اضافے کا باعث بنے گی۔

موبائل اَن کر کے، وزن آف کریں

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2DHD3uc

کیا آپ اپنے بڑھتے وزن سے پریشان ہیں؟ ہزاروں روپوں کی ادویہ کھانے اور لاکھ جتن کرنے کے باوجود اپنا وزن کم کرنے میں کامیاب نہیں تو پھر لوزِ اِٹ (Loseit) نامی یہ موبائل ایپ آپ کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اس موبائل ایپ کی مدد سے آپ مفت میں اپنا وزن بآسانی کم کر سکتے ہیں۔ یہ ہم نہیں بلکہ وہ لاکھوں لوگ کہتے ہیں جنہوں نے اس ایپ کے ذریعے اپنا وزن انتہائی کامیابی کے ساتھ کم کیا۔ اس ایپ میں مکمل غذائی پلان، ورزش پلان، کیلوریز پلان، ورک آؤٹ پلان، نیوٹریشن پلان، کیلوریز ٹریکنگ، واٹر ٹریکنگ اور اسمارٹ گول ٹریکنگ جیسی جدید خدمات دستیاب ہیں جن کی مدد سے وزن کم کرنے کی طرف پہلا قدم تو یقیناً اُٹھایا جا سکتا ہے۔

سب کچھ کھائیں مگر ذرا دیکھ بھال کے

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2EjVTZu

ٹھہریئے! آپ کے ہاتھ میں یہ جو چائے کا کپ ہے، کیا آپ جانتے ہیں کہ اس میں کتنے حرارے (Calories) ہیں اور یہ حرارے کہیں آپ کی جسمانی ضرورت سے زیادہ تو نہیں۔ فوڈو کیٹ (Foodu Cate) نامی یہ موبائل اگر آپ کے اسمارٹ

فون میں موجود ہے تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ ایپ آپ کو ہر غذا کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتی ہے کہ اس میں کتنے حرارے ہیں اور اس کی کتنی مقدار کھانے سے آپ کی جسمانی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اور کتنی مقدار میں کھانے سے آپ کو صحت کے مسائل لاحق ہوں گے۔ ڈائیٹ پلان کے بارے میں انتہائی حساس افراد کے اسمارٹ فون میں اس ایپ کا ہونا ناگزیر ہے۔

یوگا خود بھی سیکھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2niB3Cf

نام سے ہی ظاہر ہے پاکٹ یوگا (Pocket Yoga) نامی یہ ایپ یوگا میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس موبائل ایپ کے ذریعے آپ اپنی سہولت کے مطابق یوگا کی براہ راست کلاسیں بھی لے سکتے ہیں۔ چاہیں تو کلاسوں کی اس ایپ پر پہلے سے موجود ویڈیوز کے ذریعے بھی یوگا کو اپنے گھر کے کسی پرسکون کمرے میں بغیر کسی استاد یا ساتھی کی مدد سے بخوبی سیکھ لیں۔ اس ایپ کے ذریعے آپ اپنی یوگا کی مشقوں کو ریکارڈ بھی کر لیجیے جسے آپ اپنے کمپیوٹر یا ٹی وی اسکرین سے منسلک کر کے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یوگا کے شائقین کے لیے یہ انتہائی کارآمد موبائل ایپ ہے۔

وزن گھٹائیں، انعام پائیں

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2nkNL2T

جی ہاں! اس ڈائیٹ بیٹ (Diet Bet) نامی اسمارٹ فون ایپ میں دیے گئے مختلف گیمز میں شرکت کریں اور کامیابی سے وزن کم کرنے کے ساتھ ساتھ انعامی رقم کے حقدار بھی قرار پائیں۔ اس ایپ پر بے شمار آن لائن گیمز موجود ہیں جن میں دیے گئے ٹاسک آپ آن لائن کمیونٹی کے ساتھ مقررہ وقت میں سب سے پہلے پورے کر کے انعامی رقم کے حقدار بن سکتے ہیں۔

وزن کم کرنے کے حوالے سے ترغیب دینے والی یہ اپنی نوعیت کی انتہائی منفرد ایپ کافی عرصے سے اسمارٹ فون کی دنیا میں اپنی کامیابی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہاں آپ اُن افراد کی دلچسپ سچی کہانیاں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس ایپ کی مختلف آن لائن گیمز میں شرکت کر کے اپنے بڑھتے وزن کو کامیابی سے ساتھ کم کیا۔ ایپ بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ اب تک ان کی بنائی گئی اس ایپ کی مدد سے ۹۰ مختلف ممالک کے ۴ لاکھ سے زیادہ افراد مجموعی طور پر اپنا ۵ ملین پاؤنڈ وزن کم کر کے ۱۲ ملین ڈالر کی خطیر انعامی رقم کے حقدار قرار پا چکے۔

ذہنی مسائل کا حل ایک کلک کی دوری پر

ڈاؤن لوڈ لنک: http://bit.ly/2DK5n38

جدید دور کا یہ المیہ ہے کہ جیسے جیسے انسان ترقی و آسائش کی معراج پر پہنچ رہا ہے، اُس کا چین و سکون غارت ہوتا جا رہا ہے۔ زمانے کی رفتار اور دوسروں سے مقابلے کی دوڑ نے اُسے ان گنت ذہنی مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ اس وجہ سے روزمرہ زندگی خطرے کی زد پر آ گئی ہے۔ نت نئے خیالات کے سیلاب نے حضرت انسان کو مختلف ذہنی و نفسیاتی عوارض میں مبتلا کر دیا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ بہت سے افراد کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ مختلف ذہنی و نفسیاتی امراض کا شکار ہو چکے۔ یہ اسمارٹ فون ایپ نہ صرف آپ کو اپنے ذہنی و نفسیاتی صورت حال سے درست طور پر باخبر کرتی بلکہ ان عوارض سے نجات حاصل کرنے کی خاطر آپ کے لیے مددگار بھی ثابت ہوتی ہے۔ کام (Calm) نامی اس ایپ کو ۲۰۱۷ء کی سب سے بہترین طبی ایپ کے اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ اگر اس ایپ سے درست معنوں میں استفادہ کرنے کے متمنی ہیں تو ایک بار اسے اپنے اسمارٹ فون میں ضرور ڈاؤن لوڈ کریں۔ اُمید ہے کہ یہ آپ کی ذہنی صلاحیتوں کو جِلا بخشنے میں مؤثر و معاون ثابت ہوگی۔

www.urdugem.com

فرزانہ نگہت

آخری کامیابی

ایک فرض شناس پولیس افسر کی داستان، مجرموں تک پہنچنے کے لیے اس دلیر مرد نے کئی پُرکشش مالی ترغیبات ٹھکرا دیں

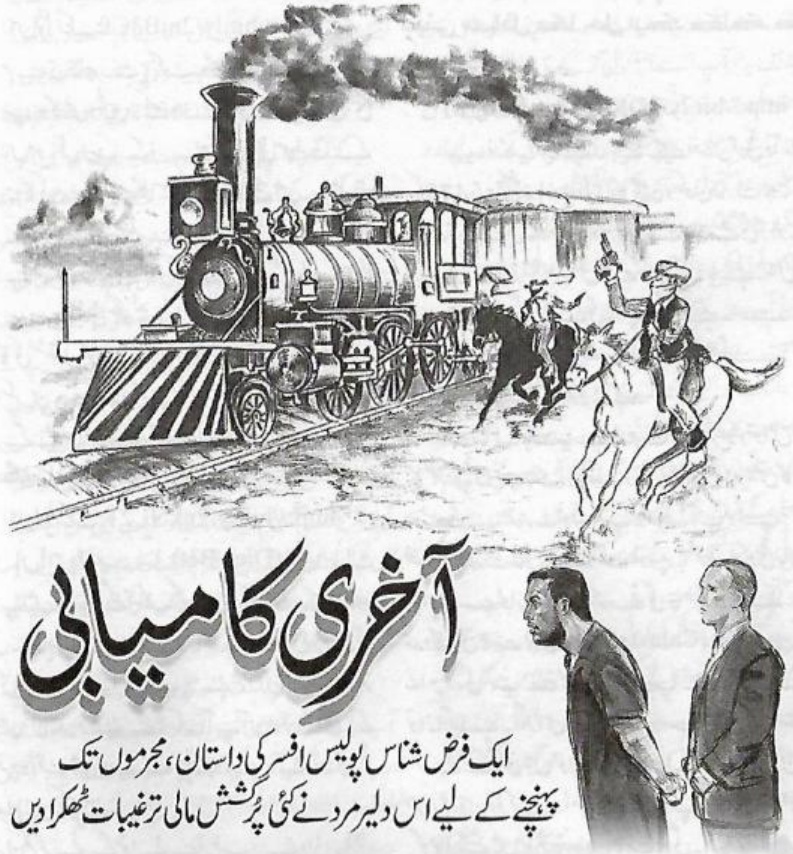

نومبر کی وہ صبح حسب معمول سمندری بگلوں کی چہکاروں اور گلیوں میں جھڑے پتے ہوا سے اُڑنے کی سرسراہٹوں کے ساتھ طلوع ہوئی، لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ کے تھامس بٹلر المعروف 'بھورے بھوت' کے لیے وہ غیر معمولی صبح تھی۔ اس نے ٹرکوائے، برطانیہ کی ایک ویران سمندری تفریح گاہ میں واقع چھوٹے سے گھر کی طرف قدم بڑھائے اور یوں ایک غیر معمولی واقعہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

گھر میں داخل ہو کر بٹلر سیڑھیاں چڑھ ایک خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک دراز قامت بھورے سے بالوں والا شخص جس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی، چلتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

''صبح بخیر رینالڈز۔'' بٹلر سے کہا۔ ''میں..... یارڈ کا بٹلر ہوں اور تمہارے لیے کچھ اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔''

''مجھے معلوم ہے کہ تم کون ہو۔'' رینالڈز نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری آمد کا منتظر تھا۔''

یوں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی سب سے بڑی آدم کھوج مہم اپنے انجام کو پہنچی۔

بروس رینالڈز پندرہ آدمیوں کے اس گروہ کا آخری آزاد فرد تھا جس نے ۷۰ لاکھ ڈالر اڑانے کی تاریخی واردات کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ڈکیتی کی یہ واردات ۸ اگست ۱۹۶۳ کو گلاسکو سے لندن جانے والی ریل میں کی گئی تھی۔ دھن کے پکے اور انتھک محنت کرنے والے بٹلر کو واردات کا آخری سرغنہ کھوجنے میں پانچ سال اور تین ماہ کا طویل عرصہ لگا تھا۔

ڈکیتی کا آغاز جمعرات کے دن تین بج کر تین منٹ پر تیرہ ڈبوں پر مشتمل میل ٹرین کے گلاسکو سے روانہ ہونے کے آٹھ گھنٹے بعد کیا گیا۔ انجن کے پیچھے تیسرے ڈبے میں ایک پونڈ اور پانچ پونڈ کے نوٹوں کی گڈیوں والی ایک سو اٹھائیس بوریاں بھری تھیں۔ انھیں ہفتہ وار چھٹی کے بعد لندن کے بینکوں کی شمالی شاخوں سے جمع کیا گیا تھا۔ اب لندن اکاؤنٹنگ کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔

ڈاکوؤں کے اس گروہ نے ریل کو ویران و سنسان پڑے بکنگھم شائر کے پل پر ریگولر سگنل ایک دستانے سے ڈھانپ کر اور اس کی جگہ نقلی سرخ روشنی لٹکا کر روک لیا تھا۔ تمام ڈکیت نقاب پوش اور کمانڈو ایکشن کے ماہر تھے۔ انھوں نے فوراً ہی ریل کے پانچوں مسلح گارڈوں پر قابو پایا اور رقومات کی بوریاں ٹرکوں پہ لاد کر آناً فاناً جائے واردات سے غائب ہو گئے۔

واردات کی چھان بین کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ نے چیف ڈٹیکٹو سپرنٹینڈنٹ تھامس جوزف بٹلر کو بلاوا بھیجا۔ وہ چوری اور بدمعاشوں کی نفسیات اور ان کے طریق عمل کو سمجھنے والا انتہائی ماہر سمجھا جاتا تھا۔ پولیس کی چونتیس سالہ ملازمت میں اس نے بتیس توصیفی اسناد اور ملکہ سے ایک تمغہ حاصل کیا تھا۔ اس کی عزت و شہرت کا یہ عالم تھا کہ بدمعاش تک اسے احتراماً ''مسٹر بٹلر'' کہہ کر پکارتے تھے۔

وہ واقعی اس لائق تھا کہ اسے ایسی عزت و شہرت نصیب ہوتی۔ وہ لندن کے ایک پسماندہ علاقے ''شیپر ڈز بش'' میں پیدا ہوا۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے اپنی بیوہ ماں کی کفالت کے لیے اسکول کو خیرباد کہہ دیا اور کافی عرصہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے بعد بائیس سال کی عمر میں محکمۂ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ چار سال بعد اسے حساسوں کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

اس کے اگلے پندرہ سال برطانوی زیرزمین دنیا میں افراد کے نام، چہرے اور عادات یاد کرنے میں گزرے۔ سفید ہوتے بالوں، فراخ پیشانی اور مضبوط جبڑوں والا ٹھوس بٹلر اپنی بے خوفی، غیر معمولی پھرتی اور ذہانت کی بدولت جلد شہرت پا گیا۔ ہر چیز کی گہرائی میں اتر جانے اور کھوج کرید کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کی بدولت اسے ''بھورا بھوت'' کہا جانے لگا۔

بادیٔ النظر میں یہ معاملہ آسان سا دکھائی دیتا تھا۔ مجرموں کا ٹولہ محفوظ ترین پناہ گاہ لیدر ڈیل فارم جا چکا تھا جو جائے واردات سے بیس میل کی دوری پر تھی۔ وہاں انھوں نے لوٹ کا مال مساویانہ طور پر آپس میں تقسیم کیا اور اس واردات کی گرد بیٹھ جانے کا انتظار کرنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جانا تھا۔

ریڈیو کے ذریعے انھیں جو خبریں ملیں اس کے مطابق پولیس وقوعہ کے اردگرد تیس ۳۰ میل تک کے علاقے کو بڑی سرگرمی سے چھان رہی تھی۔ اس خبر نے ان میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی۔ کئی لٹیرے بڑی افراتفری کے عالم میں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر اتوار کے دن

www.urdugem.com

ایک پرائیویٹ جہاز راں کمپنی کے پائلٹ نے ان کے ٹرکوں اور کاروں کو لیدر ڈیل فارم کے احاطے میں کھڑے دیکھا۔ اس نے ازراہ تجسس اس جگہ کے کئی چکر لگائے جس پر باقی ماندہ لٹیرے یہ سمجھ کر کہ وہ پولیس کا کھوجی جہاز تھا، بڑی گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں فارم ہاؤس سے رفوچکر ہو گئے۔ وحشت اور بدحواسی کے عالم میں انھیں وہاں اپنی انگلیوں کے نشانات مٹانے بھی یاد نہ رہے۔

اس دوران ایک گلہ بان نے، جو اس فارم کے قریب ہی رہتا تھا، وہاں دکھائی دینے والی سرگرمیوں پر مشکوک ہو کر پولیس کو اس کی اطلاع کر دی۔ پولیس کو وہاں خالی بوریاں اور زیر زمین دنیا کے پندرہ نامی گرامی بد معاشوں کی انگلیوں کے نشانات ملے۔ یوں صورت حال نے ڈکیتی کی اس واردات کو جو بڑی مہارت اور منصوبہ بندی سے کی گئی تھی، گڑبڑ کا شکار بنا دیا۔ ادھر ٹیکس تشخیص کرنے والی ایک فرم کی طرف سے لوٹ کے مال کی بازیابی پر سات لاکھ ڈالر کے انعام کا اعلان کر دیا گیا جس کے ساتھ ہی بٹلر کو چاروں طرف سے طرح بطرح اطلاعات پہنچنے لگیں۔ ایک لٹیرے کو کسی ہوٹل کے ملازم نے ریستر میں دیکھا تھا۔ دوسرے کو ایک پولیس والے نے بورن ماؤتھ میں وغیرہ وغیرہ۔ اکتوبر تک ڈکیتی میں ملوث پندرہ میں سے گیارہ آدمی گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد بٹلر نے ایک اور آدمی چارلس ولسن کو گرفتار کیا لیکن وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ اب اس کے علاوہ جیمز وہائٹ، بسٹر ایڈورڈ اور بروس رینالڈز باقی رہ گئے۔

ان چار آدمیوں میں بٹلر کا سرفہرست مطلوب رینالڈز تھا۔ اُسے گروہ کا سب سے خطرناک آدمی گنا جاتا تھا۔ وہ ایک معزز سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ اس کے ریکارڈ پر گیارہ جرائم درج تھے۔ اس نے آخری جرم کا ارتکاب ۱۹۵۸ء میں ایک بک میکر پر متشددانہ حملہ کرتے ہوئے کیا تھا۔

"وہ" "تنہا بھیڑیا" قسم کا آدمی تھا۔ وہ جرائم کو پیشہ خیال کرتا تھا۔ ظاہری طور پر اس نے نوادرات فروش کی حیثیت سے اپنی ساکھ بنا رکھی تھی۔ اس کے نچلے درجے کے سیاست دانوں سے بھی مراسم تھے۔ ان کی مدد سے وہ چوری کی رقومات سوئس بینکوں میں اسمگل کیا کرتا تھا۔ بٹلر کے لیے رینالڈز کو گرفتار کرنا ایسا چیلنج تھا جسے وہ ہر صورت جیتنا چاہتا تھا۔

بٹلر کو معلوم تھا کہ ہر بڑی واردات کے بعد رینالڈز بالعموم ملک سے باہر چلا جاتا تھا۔ کیا اس مرتبہ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا؟ ہاں واقعی...... جیسا کہ رینالڈز کی بیوی فرانسس نے بعد میں کہانی سنائی۔ وہ اور اس کا خاوند مغربی لندن کے ہوائی اڈے کے قریب ایک چھوٹے سے گھر میں چھ ماہ تک دبکے رہے۔ رینالڈز گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے اس واردات کی تفتیشی پیش رفت سے آگاہ رہتا تھا۔

جب دبکے بیٹھے رہنے سے رینالڈز کے اعصاب کمزور پڑنے لگے اور صبر و حوصلہ جواب دینے لگا تو اس نے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک پرائیویٹ طیارہ اسے بلجیئم لے گیا۔ وہاں اس نے جعلی شناختی کارڈ حاصل کیے اور پھر میکسیکو چلا گیا۔ دو ماہ بعد فرانسس بھی بیٹے کے ساتھ اس سے جا ملی۔

لیکن میکسیکو ان کے لیے تاریک پنجرہ ثابت ہوا۔ رینالڈز باقی ماندہ رقم سے کوئی چلتا ہوا کاروبار خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن حکام کے کان کھڑے ہونے کے خوف سے اسے بڑی رقم کہیں لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ میکسیکن شہریت کے لیے درخواست نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس کے کاغذات کا جعلی ہونا ثابت ہو جاتا۔ وہ کوئی واردات بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ میکسیکن قومیت نہ رکھتا تھا۔ انگریزی اخبارات کے ذریعے وہ واردات کی چھان بین سے برابر

آگاہ رہتا۔ بٹلر کا خوف اس کے اعصاب پر اتنی بری طرح سوار تھا کہ اس نے میکسیکو سٹی کے نائٹ کلبوں میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔

رینالڈز کو اس وقت حوصلہ ملا جب ایڈورڈ اور ولسن اس سے آن ملے۔ وہ براستہ برسلز میکسیکو پہنچے تھے۔ لیکن ایڈورڈ کا دل وہاں نہ لگا، وہ برطانیہ کو اپنا گھر قرار دیتا تھا۔ ایک دن اس نے رینالڈز سے کہا "میں یہاں سے بھر پایا۔ اب میں واپس جا رہا ہوں۔"

لندن واپس پہنچ کر ایڈورڈ نے بٹلر کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی گرفتاری دینا چاہتا ہے۔ بٹلر ایک دوسرے جاسوس کے ساتھ لندن کے گنجان آباد علاقے میں واقع اس فلیٹ پر جا پہنچا جہاں وہ رہائش پزیر تھا۔ ایڈورڈ نے بڑے پرسکون انداز میں ان کا استقبال کیا انھیں چائے پلائی اور پھر ان کے ساتھ ہو لیا۔ اب دو مہرے باقی رہ گئے۔ چھ ماہ قبل پولیس جیمز وہائٹ کو ایک چھوٹی سی ساحلی تفریح گاہ سے ملّاح کے بھیس میں گرفتار کر چکی تھی۔

جولائی ۱۹۶۷ تک رینالڈز اور ولسن کو تلاش کرتے کرتے چار سال گزر گئے۔ بٹلر اب پچپن سال کا ہو کر ریٹائرڈ ہونے کے قریب تھا۔ اسے ایک ایسی ملازمت کی پیشکش بھی آ چکی تھی جس کی تنخواہ سرکاری پینشن ملا کر سرکاری ملازمت کی چھ ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ سے دوگنی زیادہ تھی۔ لیکن بٹلر اپنا چیلنج پورا کیے بغیر ہرگز ملازمت نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ اپنے افسروں کے پاس پہنچا اور ان سے قوی لہجے میں کہا۔ "میں اپنی ملازمت میں ایک سال کی توسیع چاہتا ہوں۔"

افسروں نے بیک زبان کہا "ہمیں منظور ہے!"

اس وقت تک بٹلر کو زیر زمین دنیا سے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ جیم چارلی ولسن ملک چھوڑ گیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نامی گرامی ڈکیت لٹنے کے خدشے کے پیش نظر شاذ ہی اپنا لوٹ کا مال اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ لوٹ میں ولسن کے حصے کا غالب حصہ شاید برطانیہ ہی میں کہیں محفوظ تھا۔ اس میں سے رقومات کی مسلسل ترسیل کے لیے ولسن کو زیر زمین دنیا سے ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس پر وہ ہر طرح سے اعتماد کر سکتا ہو۔

بٹلر نے ولسن کے چند سابق رفقاء کو منتخب کیا اور ان کے ذریعے اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی شروع کی۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مشتبہ ہرکارہ براستہ برسلز لاطینی امریکا جا چکا تھا۔ مطلب یہ کہ ولسن نے اپنی رہائش گاہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے ہرکارے کو نئی شناخت اور نیا پاسپورٹ حاصل کرنے برسلز بھیجا تھا۔

بٹلر کو یقین تھا، ان برطانوی بدمعاشوں کو جلد یا بدیر انگریزی ماحول کی یاد ستا سکتی تھی۔ گویا وہ کینیڈا کی طرف فرار ہو سکتے تھے۔ جلد ایک معمولی واقعے نے بٹلر کے اس خیال کی تصدیق کر دی۔

لندن کا ایک چھوٹے درجے کا بدمعاش معمولی جرم میں دھر لیا گیا۔ اس سے بٹلر کو ولسن کے ایک قریبی ساتھی کے بارے میں معلوم ہوا جو کینیڈا کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ بٹلر نے اس آدمی کو پھانسنے کا منصوبہ بنایا۔ جس دن اس نے مونٹریال کی پرواز کا ٹکٹ خریدا، بٹلر نے فوراً رائل کینیڈین مونٹریال پولیس کو اس پر نظر رکھنے کا تار بھیج دیا۔ یوں وہ شخص مونٹریال پہنچتے ہی پولیس کی نظروں میں آ گیا۔ اپنی نگرانی سے بے خبر وہ ہرکارہ شہر سے چالیس میل دور ریگارڈ نامی ایک چھوٹے سے قصبے پہنچا جہاں اس نے رینالڈز ایلوے نامی ایک شخص سے ملاقات کی جو ولسن کے حلیے پر پورا اُترتا تھا۔

بٹلر فوراً کینیڈا روانہ ہو گیا۔ چار دن بعد ایک صبح آٹھ بجے وہ شخص جو اپنے آپ کو ایلوے کہلواتا تھا، اپنے گھر سے باہر نکلا۔ بٹلر نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ "صبح

www.urdugem.com

بخیر ولسن تم مجھے جانتے ہی ہو۔ مجھے افسوس ہے، میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں۔"

اب رینالڈز باقی رہ گیا تھا۔ ریگاڈ میں واقع ولسن کے گھر کی تلاشی سے ایک تصویر بٹلر کے ہاتھ لگی۔ اس میں رینالڈز اور اس کی بیوی فرانس جنوبی فرانس میں سیٹ میکسم کے ساحل پر بیٹھے تھے۔ کیا رینالڈز پھر وہاں چلا گیا تھا؟ وقت ضائع کیے بغیر بٹلر فوراً ریویرا پرواز کر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے رینالڈز کو فرانس میں تلاش کر لیا تو اسے گرفتار کرنے کے لیے فرانسیسی پولیس کی مدد درکار ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ انخلاء کا عمل مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ رینالڈز برطانیہ چلا آئے۔ وہاں اسے گرفتار کرنا آسان تھا۔ چنانچہ بٹلر نے اس زبردست ڈکیت کے ساتھ اعصابی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ریت کے ٹیلوں پر کھڑے ہو کر بٹلر نے دوربین آنکھوں سے لگاتے ہوئے ساحلوں کو چھاننا شروع کیا۔ ان کے کیفوں میں جا کر لوگوں کو رینالڈز کی تصویر دکھائی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں ان سے پوچھا کہ آیا انھوں نے اس شخص کو کہیں دیکھا؟ اس بھاگ دوڑ کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ انگوروں کی بیلوں میں گھرے اس مکان میں چھپے اعصاب گزیدہ رینالڈز کو معلوم ہو گیا کہ بٹلر بالآخر اس تک پہنچ چکا۔ ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ شدید جھگڑے کے بعد گھر سے نکلا اور اندھا دھند کار چلاتے ہوئے اسے ایک درخت سے ٹکرا دیا۔

میاں بیوی کی ہمت جواب دے رہی تھی اور ان کا اثاثہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ ان کی آخری اُمید اب آسٹریلیا کی طرف ہجرت کرنا تھی۔ فرانسس بچے کے ساتھ برطانیہ چلی گئی تاکہ نئے کاغذات بنوا سکے۔ رینالڈز بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا اور ٹرکوائے میں ایک ساحلی کاٹیج میں جا کر چھپ گیا۔

بٹلر کو زیرِ زمین دنیا کے جاسوسوں کے ذریعے اطلاع مل گئی کہ رینالڈز برطانیہ پہنچ چکا۔ اس کا کوئی اتا پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ خاموش بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بالآخر ۱۹۸۸ء کے ماہ اگست میں اسے نہایت اہم خبر ملی۔ بٹلر کے ڈیسک پر پڑے ٹیلی فونوں میں سے ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ایک آواز نے کہا۔ "اپنی نظریں کنگز روڈ پر مرکوز کر دو۔ وہاں تمہیں ایک لمبا آدمی دکھائی دے گا۔" ساتھ ہی فون خاموش ہو گیا۔ بٹلر سمجھ گیا کہ وہ لمبا آدمی کون ہو سکتا تھا۔ رینالڈز چھ فٹ چھ انچ لمبا تھا۔

بٹلر اور اس کے معاونین ڈھائی ماہ تک کنگز روڈ کے گرد علاقے کھوجتے رہے۔ انھوں نے رئیل اسٹیٹ ایجنٹوں، بینکوں، مے خانوں، اسپتالوں، ریستورانوں کی چیکنگ کی۔ لگ بھگ چار ہزار موٹروں کے لائسنسوں کی چھان بین بھی کی گئی۔ بالآخر انھوں نے ایک ایسی کار تلاش کر لی جو ٹرکوائے کی ایک مسز اینجلا ہیلٹر کے نام رجسٹر تھی۔ ہیلٹر کبھی رینالڈز کی عرفیت ہوا کرتا تھا۔

"یہ رینالڈز ہی ہے" بٹلر جوش سے بولا۔ "ہونا بھی یہی چاہیے۔"

اگلی صبح تین بجے بٹلر ٹرکوائے جانے والی سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ وہاں اس کا سامنا اس جسیم بھورے بالوں والے آدمی سے ہونا تھا جس نے اس سے کہنا تھا۔ "میں جانتا ہوں تم کون ہو۔ میں تمہاری آمد کا منتظر ہی تھا۔"

رینالڈز کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور جلد اُسے پچیس ۲۵ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

اب بٹلر کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ "اگر میں رینالڈز کو نہ پکڑتا" اس نے پریس والوں سے کہا۔ "تو اسے کوئی اور پکڑ لیتا۔ کسی بھی وقت کہیں بھی۔" اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے منظر عام سے غائب ہو گیا، بھورے بھوت کی طرح! ●●●

سبطین بٹ

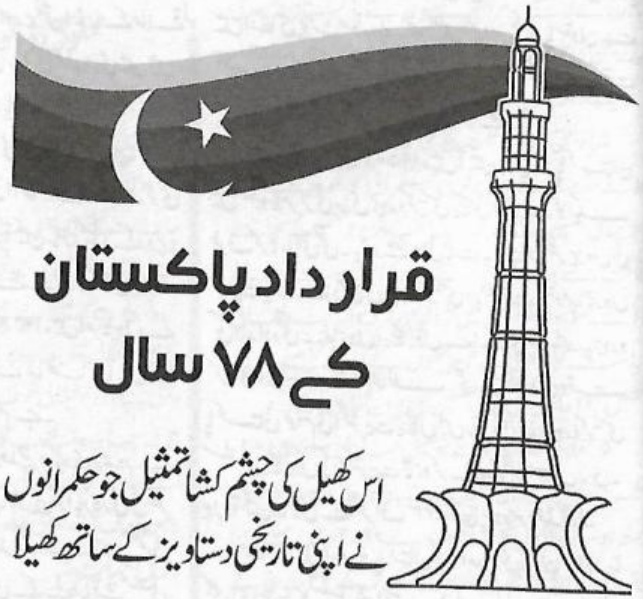

قرار داد پاکستان کے ۷۸ سال

اس کھیل کی چشم کشا تمثیل جو حکمرانوں نے اپنی تاریخی دستاویز کے ساتھ کھیلا

ماہ مارچ کی ۲۳ تاریخ وطن عزیز کی تاریخ میں ایک یادگار لمحے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہمیں اس دن کی یاد دلاتی ہے جب آج سے اٹھتر برس قبل پنجاب کے دل لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے آزاد وطن پانے کی خاطر فیصلہ کن تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اجلاس کی پشت پناہی وزیرِ اعظم پنجاب سر سکندر حیات کر رہے تھے جبکہ قرار داد پیش کرنے والے بنگال کے وزیرِ اعظم مولوی اے فضل الحق تھے۔

اس قرار داد میں وہی سیاسی بصیرت مدنظر تھی جس کا اظہار ۱۹۳۰ء میں شاعرِ مشرق، علامہ اقبالؒ نے تاریخی الٰہ آبادی خطبے میں کیا تھا۔ مسلم لیگ نے اس قرار داد کے ذریعے انگریز و ہندو، دونوں سے مطالبہ کیا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو اکائیوں کی شکل میں خود مختاری دے دی جائے۔

یوں اس نے اپنا سارا بار مسلم اکثریتی صوبوں کے حق میں ڈال دیا تھا۔

مسلم لیگ نے تو اس دستاویز کو "قرار داد لاہور" کہا تھا مگر کانگریس کے حمایت یافتہ میڈیا نے اسے "قرار داد پاکستان" کا عنوان دے کر اس کے خلاف بھرپور اخباری مہم چلائی۔ یوں اس قرار داد کو "قرار داد پاکستان" کے نام ہی سے خوب شہرت ملی۔ اس منفی مہم سے مسلم لیگ کو بے انتہا فائدہ ہوا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ خصوصاً مسلم اکثریتی صوبوں یعنی سندھ، بنگال اور پنجاب میں سب سے بڑی پارٹی بن گئی تو سرحد (خیبر پی کے) میں بھی بڑی تعداد میں پٹھان اور ہزارہ اس کے ساتھ آ گئے۔ اس طرح مسلم لیگ نے وہاں کی ۳۰ نشستوں میں سے ۱۷ نشستیں جیت لیں۔

اس لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے "آزادی ہند قانون" ۱۹۴۷ء کی منظوری دے ڈالی۔ اس قانون کے حق میں ۳ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگرس کے راہنما تقریریں کر چکے تھے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ۳ جون کے منصوبے کو تحفظات کے ساتھ قبول کیا گیا تھا۔ آزادی ہند قانون کے

www.urdugem.com

تحت واضح اعلان کیا گیا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں دو نئی وطنی ریاستیں وجود میں لائی جا رہی ہیں اور برٹش انڈیا کے علاقے جو ۱۹۳۵ء کے قانون کے مطابق ریاستی عملداری میں ہیں، انھیں یا پاکستان میں شامل ہونا ہے یا ہندوستان میں۔

ان دونوں نئی ریاستوں کی مرکزی اسمبلیوں کو اپنا اپنا آئین بنانا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو نئی ریاست کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر آئین ساز اسمبلی کے روبرو پیش کر دیا تھا۔ تاہم وہ بخوبی طور پر جانتے تھے کہ آئین بنانا تو آئین ساز اسمبلی کا کام ہے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں امریکیوں کے نام ایک ریڈیو پیغام میں قائداعظم نے کہا تھا کہ آئین بنانا میرا کام نہیں بلکہ آئین ساز اسمبلی کا کام ہے۔

قائداعظمؒ تو پاکستان بننے کے بعد تیرہ ماہ ہی زندہ رہے اور ان تیرہ میں سے پہلے چھ مہینے تو مہاجرین کو آبادکاری کی نظر ہوئے اور آخری چھ ماہ سخت بیماری میں گزرے۔ قائداعظمؒ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی آئین سازی کے لیے لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے عنوان سے نئی ترجیحات طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ریاست پاکستان ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کو بنیادی دستاویز قرار دیتی مگر اس کی بجائے بنیادی اصول آئین بنانے والی کمیٹی نے مضبوط مرکز کے گرد حکمرانی کا پہیہ ایسے گھمایا کہ اس نے مختلف قسم کے تنازعات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔

مضبوط مرکز کا فلسفہ ۲۳ مارچ کی قرارداد کے خلاف پہلا حملہ تھا کہ جس کے لیے قرارداد مقاصد کو بھی استعمال کیا گیا۔ مضبوط مرکز کے نام پر قومی تعمیر نو کا جو بیڑا اٹھایا گیا وہ قرارداد لاہور سے روگردانی تھی۔ سینئر مسلم لیگی راہنما اور قرارداد لاہور کے گواہ جناب حسین امام کے بقول ''اس دور میں ہمارے سامنے آئین کے دو نمونے ہی تھے۔ ایک روسی آئین جو لینن نے بنایا تھا اور دوسرا امریکی آئین جس سے رضا کارانہ طریقے سے فیڈریشن کو بنایا گیا تھا۔ برٹش انڈیا میں انتظامی یونٹ صوبے تھے جنھیں ہم امریکی ریاستوں سے تشبیہہ دے رہے تھے، لہٰذا قرارداد لاہور کی تشکیل کے وقت ہم امریکی آئینی تصورات ہی سے متاثر تھے۔''

ہندوستان نے تو ۱۹۵۰ء میں آئین بنا لیا مگر پاکستان میں مضبوط مرکز کی حامی بیوروکریسی بنگالی اکثریت کو ایک طرف کرنا چاہتی تھی۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ انگریزوں کی تربیت یافتہ نئے وطن کی بیوروکریسی درحقیقت نہ تو مہاجروں کی دلدادہ تھی نہ پنجابیوں، بنگالیوں سے اسے بیر تھا بلکہ یہ بیوروکریسی درحقیقت ''عوام مخالف'' تھی۔ چونکہ اس وقت پاکستانی عوام کی اکثریت بنگال میں رہتی تھی لہٰذا بیوروکریسی مسلسل بنگالیوں کی اکثریت قابو کرنے کی فکر میں رہی۔

یوں آئین سازی سے انحراف ۲۳ مارچ پر دوسرا حملہ تھا۔

۱۹۵۲ء میں اُردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دینا بھی اسی سوچ کا تسلسل تھا جس نے اُردو پاکستانی مادری زبانوں میں تنازع کھڑا کر دیا۔ ۲۳ مارچ کی قرارداد پر اگلا حملہ ون یونٹ کی تشکیل تھی جسے ۱۹۵۶ء کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین خطبہ الٰہ آباد، ۱۱ اگست کو قائداعظم کی تقریر اور ۲۳ مارچ کی قرارداد سے انحراف تھا۔ حیران نہ ہوں اس دستاویز میں سینٹ نام کا کوئی ادارہ نہ تھا۔

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء ۲۳ مارچ کی قرارداد پر ایک اور بھیانک حملہ تھا۔ جس پارلیمانی و جمہوری بندوبست کو بانیان پاکستان مقدم سمجھتے تھے اسی کو ختم کر دیا گیا۔ ایوبی مارشل لاء گیا تو یحییٰ خان کا مارشل لاء آن دھمکا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مرکزیت پسندی کی پالیسی کا انجام سامنے آیا مگر حکمرانوں نے اس سے سبق سیکھنے کے بجائے سارا الزام یحییٰ خان کی شراب نوشی، بنگالیوں کی غداری اور بھٹو صاحب کی مکاری پر دھر دیا۔

بلاشبہ ۱۹۷۳ء کا آئین وہ پہلی دستاویز تھی جس میں ۲۳

مارچ کی قرارداد کا لشکارا جھلکتا تھا۔ یہ امید بندھ گئی کہ ۲۳ مارچ کے لاشے پر مرہم رکھتے ہوئے پاکستان جمہوری فیڈریشن کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے گا مگر ۳ جولائی ۱۹۷۷ء کو ایک دفعہ پھر ۲۳ مارچ پر خوفناک حملہ کر دیا گیا۔

ضیاء الحق نے ۲۳ مارچ کو دفنانے کا پورا انتظام کرتے ہوئے مذہب کے نام پر فوجی حکمرانی کو تقویت دی۔ پارلیمانی جمہوریت کو رگید دیا۔ منتخب وزیراعظم کے بجائے طاقت سے برسراقتدار آئے صدر کو اختیارات دے ڈالے۔ صوبوں کو آپس میں لڑوایا اور فرقہ وارانہ و لسانی سیاست کو ہوا دی۔ غرض انھوں نے ایسے فیصلے کیے جنھیں ۲۳ مارچ کی تجہیز و تکفین کا نام دینا غلط نہ ہوگا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے جو کھیل جاری ہوا وہ ۲۰۰۸ء تک چند کمزور جمہوری وقفوں کے باوجود جاری و ساری رہا۔ بھلا ہو سیاستدانوں کا کہ انھوں نے ۲۰۱۰ء میں پہلے این ایف سی ایوارڈ اور پھر اٹھارہویں ترمیم کر کے ۲۳ مارچ کے لاشے میں دوبارہ روح پھونکنے کی جرات رندانہ کی اور صدارتی اختیارات پارلیمان کو واپس ہوئے۔

۲۰۱۳ء میں وطن میں پہلی دفعہ ووٹوں کے ذریعے ایک حکومت گئی۔ ووٹوں ہی سے نئی سرکاریں مرکز اور صوبوں میں بنیں۔ جمہوری تسلسل اور وفاقی اکائیوں کا احترام ہی تو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کی اصل بنیاد تھی۔ یقیناً یہ عمل دیکھ کر بانیان پاکستان کی روحوں اور ۲۳ مارچ کے مصنفین کو کچھ سکون ملا ہوگا۔ مگر یاد رکھیں، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے قاتل آج بھی دندناتے پھرتے ہیں مگر ان کا اصل ہدف پارلیمان کی بالادستی کو نہ ماننا اور فیڈریشن کی اکائیوں میں لڑائیاں کروا تے ہوئے مرکزیت پسندی کو مضبوط کرنا ہی ہے۔

۲۳ مارچ کو محض چھٹی منانا کافی نہیں۔ ہمیں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی بصیرت کو دوبارہ اجاگر کرنا ہے کہ جس میں مرکز، صوبوں اور اضلاع میں پارلیمانی جمہوریت کے تسلسل اور فیڈریشن کی اکائیوں میں تصفیے ہی کو اولیت حاصل ہو۔ اگر آپ ۲۳ مارچ کے قاتل پہچان لیں تو وطن عزیز کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

مخلوق کی توجہ طلب نہ کر

ایک عبادت گزار کو ایک بادشاہ نے اپنے ہاں طلب کیا۔ اس عابد نے یہ سوچا کہ کوئی دوا کھالوں تاکہ میں ذرا کمزور ہو جاؤں پھر شاید بادشاہ کی عقیدت مجھ سے اور بڑھ جائے۔ کہتے ہیں اس نے ایک دوائی کھائی۔ اس دوائی نے زہر کا سا اثر دکھایا۔ جس سے وہ جاں بحق ہو گیا۔

سچ ہے کہ میں نے جسے پستے کا مغز خیال کیا وہ تو پیاز کا چھلکا نکلا۔ پس وہ عابد و پارسا جن کی توجہ مخلوق کی طرف رہتی ہے، وہ تو قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ جب بندہ اپنے رب کا ہو جائے اور اسے پکارے تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف راغب نہ ہو۔ صرف اللہ تعالیٰ کا ہو جائے۔

درسِ حیات:

۱۔ دکھاوے کی پارسائی سے دنیا میں خواری اور آخرت میں رسوائی ہوگی۔

۲۔ مخلوق کی طرف منہ کرنے والے عابد و پارسا خالی قسم کی عبادت ہی سمیٹتے ہیں۔

۳۔ ہر کام ہوش مندی سے کریں ورنہ نقصان اور خطرۂ جان ہو کر رہ جاتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ہی مشکل کُشا ہے۔ اسی پر بھروسہ کریں تو اللہ مددگار ہوگا۔

www.urdugem.com

صداقت حسین ساجد

بھولا ہوا سبق

بیٹے نے اپنے باپ کو فراموش کردہ فرض یاد دلا دیا
ایک ایمان افروز قصہ

پہلے وقاص کی آمدنی بس اتنی تھی کہ اس کا گزارا ہو رہا تھا۔ اب وہ پریشان رہا کرتا تھا کہ اتنی کوشش کے باوجود وہ کوئی بچت کیوں نہیں کر پا رہا۔ اکثر وہ اس حوالے سے سوچتا کہ آخر کیا وجہ ہے، لیکن اسے کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔

وقاص کے دو بیٹے تھے... کامران اور فہد۔ وقاص کی بیوی نورین تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی اور گھریلو اخراجات محدود کرنے کی کوشش میں محو رہتی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی تھی۔ اسی لیے تو ان کے گھر کا نظام جیسے تیسے چل رہا تھا۔ نورین نے کہیں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس میں دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ تو بس اپنا گھر سنبھالنے کو ترجیح دیتی تھی۔ نورین ذرا سخت مزاج کی خاتون تھی، اس لیے اکثر وقاص پر اپنی مرضی مسلط کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتی۔

وقاص کے ساتھ اس کے والد بھی رہا کرتے تھے۔ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی اور اپنے زیادہ تر کاموں کے لیے انھیں دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ تب وقاص اپنے باپ کا خیال رکھتا تھا۔ کامران اور فہد بھی اپنے دادا ابو کے کام بھاگ بھاگ کر کرتے تھے۔ وہ اپنے دادا ابو سے بہت پیار کرتے تھے۔

نورین اپنے سسر سے بہت تنگ تھی۔ وہ اسے اپنے اُوپر بوجھ سمجھتی تھی، لیکن وقاص اسے سمجھاتا رہتا کہ والدین تو اولاد کے لیے بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ ان کی خدمت کرنی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ خوش ہو اور اپنی رحمتیں نازل کرے، لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی۔ اسے یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ کامران اور فہد اپنے دادا کے پاس کیوں گھسے رہتے ہیں۔ وہ اکثر انھیں منع کرتی رہتی، لیکن بچے تو من کے سچے ہوتے ہیں۔ وہ وہیں زیادہ جاتے ہیں، جہاں سے انھیں پیار ملتا ہے۔

وقاص تنگی کے باوجود محنت کرتا رہا، کیوں کہ اسے اس عمل پر یقین تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حالات میں بہتری آتی گئی۔ جس گھر میں وہ رہتے تھے، وہ اس کے والد کا اور کافی بڑا تھا۔ وقاص نے اپنے والد سے مشورہ کیا اور وہ گھر بیچ دیا۔ وہ گھر خریدار کو بہت پسند آیا اور اس نے کسی بحث مباحثے کے بغیر انھیں ان کی مطلوبہ رقم فراہم کر دی۔ وقاص کو اس کی توقع سے زیادہ رقم مل گئی۔ اس نے اس رقم سے ایک اچھے سے علاقے میں جگہ خرید کر جدید گھر بنوایا۔

نیا گھر انھوں نے ایک نئی آباد ہونے والی کالونی میں لیا تھا۔ اس کالونی میں ہر سہولت موجود تھی۔ انھوں نے اپنے نئے گھر کو بڑے زبردست طریقے سے سجایا۔ گھر میں قالین

بھی بچھ گیا اور نیا فرنیچر بھی آ گیا تھا۔ پردے لگ گئے۔ نورین کی نظر میں اگر اس گھر میں کچھ پرانا تھا، تو وہ وقاص کے والد تھے۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح ان سے جان چھوٹ جائے۔

ایک دن نورین نے وقاص سے کہا۔ ”میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں! بولو۔“

یہ سن کر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی:

”میری بات کا بُرا نہ منانا..... اگر آپ ابو جی کو اُوپر والے کمرے میں لے جائیں، تو ہم انھیں کھانا وہیں پہنچا دیا کریں گے...“

یہ سن کر وقاص چونک پڑا۔ بولا ”یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو؟؟“

”دیکھیں جی! وہ اب بوڑھے ہو چکے اور انھیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں..... ہر وقت کھانستے اور بلغم تھوکتے رہتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے بچے بیمار نہ ہو جائیں۔“

”نورین! اس عمر میں ایسے مسائل تو ہو ہی جاتے ہیں۔ رہی بات بچوں کی تو وہ اُن کے ساتھ وقت گزارتے ہیں، یہ اچھی بات ہے۔ ابو جی ان کی اچھی تربیت کر رہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہمارے ہاں اکثر مہمان آتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے مجھے بہت شرمندگی اُٹھانا پڑتی ہے۔ وہ ابو جی کو کھانستے اور بلغم تھوکتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ ایک اور بات بھی ہے...“

نورین نے بات ادھوری چھوڑی، تو وقاص چونک کر بولا ”وہ کیا...؟“

”آپ دیکھیں کہ میں اس گھر کی بھلائی کے لیے کچھ بھی کروں، ابو جی کو اعتراض ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچی ہے۔ ایسا نہ کرو، ویسا نہ کرو۔ ان کی اس روک ٹوک سے مجھے اکثر شرمندگی اُٹھانا پڑتی ہے۔“

یہ سن کر وقاص اسے پُرخیال انداز میں دیکھنے لگا۔ اصل میں وقاص ایک ادارے میں ملازمت کرتا تھا۔ آج کا دور مقابلے کا دور ہے، اس لیے وہ اضافی وقت لگا رہا تھا تاکہ مالکان خوش ہو کر اسے ترقی دے دیں۔ ویسے بھی وہ اس بات کا حق دار تھا، لیکن جانے کیوں ابھی تک اسے ترقی نہیں ملی تھی۔ اس کے پاس اب وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے اپنے باپ کے پاس جا کر بیٹھ جائے۔ کئی کئی دن گزر جاتے اور وہ اپنے والد کو نظر نہ آتا۔

اسے خاموش دیکھ کر نورین نے پوچھا۔ ”پھر کیا سوچا آپ نے؟“

بیوی کی بات سن کر وہ کہنے لگا۔ ”جیسا چاہو، کر لو۔“

یہ سن کر اس کی بیوی خوش ہو گئی۔ اس کی تو جیسے دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔

اس نے اسی دن اپنے سسر کو اس کے بستر سمیت اُوپر والے کمرے میں پہنچا دیا۔ پھر کچھ دنوں بعد اس نے ان کے برتن بھی الگ کر دیے تاکہ دوسرے برتن آلودہ نہ ہوں۔

ابھی بھی اس کا دل نہیں بھرا تھا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ وہ اُوپر چڑھنے اور نیچے اترنے سے تھک گئی اور بے زار ہو کر اپنے شوہر سے کہنے لگی:

”میں اور میرے بچے ابو جی کے لیے کھانا لے جانے اور واپس آنے میں تھک گئے ہیں...“

”اچھا! پھر کیا کیا جائے؟“ وقاص کو بھی اپنی بیوی اور بچوں کا احساس ہو رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ انھیں نیچے لے آئیں اور اسٹور والا کمرہ دے دیں۔“

یہ سن کر وقاص بولا۔ ”ٹھیک ہے..... جیسے تمھاری مرضی۔“

اجازت ملنے کی دیر تھی کہ اس نے سسر کو نیچے اتارا اور اسٹور میں پہنچا دیا۔ ان کے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں

www.urdugem.com

پاس رکھ دیں۔ ساتھ ہی کھانے پینے کے برتن بھی رکھ دیے۔

یوں ہی کئی دن گزر گئے۔

ایک دن وہ سب دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے۔ اس دن اتوار تھا، اس لیے وقاص بھی گھر پر موجود تھا۔ اچانک فہد بولا۔

''پاپا! جب دادا فوت ہوجائیں گے، تو میں ان کے برتن سنبھال کر رکھوں گا۔''

یہ سن کر وقاص حیرت سے بولا۔ ''بیٹا! تم ان کا کیا کرو گے؟''

''جب آپ دادا جان کی طرح بوڑھے ہوجائیں گے، تو میں آپ کے لیے اس میں کھانا رکھا کروں گا۔''

یہ سن کر وقاص نے جو لقمہ منہ میں ڈالا تھا، وہ اس کے حلق میں اٹک گیا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسی وقت اسے اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آ گیا کہ اپنے والدین کے ساتھ احسان کرو۔

اسے ایک حدیثِ مبارکہ بھی یاد آ گئی، جو اس نے کہیں پڑھی تھی۔ ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'باپ کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کی خوشی اور باپ کی ناراضی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے۔' (ترمذی شریف...... ۱۸۲۱)''

وقاص کو فوراً یہ احساس ہوا کہ جب وہ بچہ تھا اور اپنا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں تھا، تو والدین نے اس سے منہ نہیں موڑا تھا۔ آج جب اس کے والد پر بڑھاپے کی وجہ سے وہی وقت آیا اور اسے وقاص کی اشد ضرورت تھی، تو اس نے اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر اپنے والد کو اپنے آپ سے دور، اسٹور میں منتقل کر دیا۔ اس کے والدین نے تو اپنا فرض خوش دلی سے پورا کر دیا اور جب وقت آیا کہ وقاص اپنا فرض ادا کرے، تو وہ والدین کے حقوق بھول بیٹھا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بیوی سے بولا:

''سنو! اب سے میں کھانا اور چائے ان کے ساتھ ہی کھایا پیا کروں گا۔''

اس کی بیوی ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

وقاص اٹھ ہی رہا تھا کہ اسے ایک اور خیال آیا۔ وہ پھر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ ہم سب مل کر ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔''

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ بیوی کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ابو کی بات سنتے ہی کامران بھاگ کر گیا اور اپنے دادا ابو کو بلا لایا۔ پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کافی عرصے کے بعد وقاص اپنے ابو کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے انھیں اپنی خواب گاہ کے ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ ان کے برتن پھینک دیے۔

آئندہ جب وہ سب کھانا کھانے بیٹھتے، وقاص ایک لقمہ اپنے ابو کے منہ میں رکھتا، تو دوسرا لقمہ اپنے منہ میں ڈالتا۔ پھر وہ جب تک زندہ رہے، وقاص ان کی دل و جان سے خدمت کرتا رہا اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔

اس داستان کا مثبت پہلو یہ ہے جس ادارے میں وہ ملازمت کرتا تھا، وہاں بہت عرصے سے وقاص کی ترقی رکی ہوئی تھی۔ اب جو اس نے والد کی خدمت کی، تو بیٹے کی قسمت بھی جاگ اٹھی اور وہ جلد ہی اس ادارے کے اعلیٰ عہدے پر جا پہنچا۔ اسے ہر طرح سے خوش حالی حاصل ہو گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ پہلے اس سے اس کا باپ ناراض تھا، اسی وجہ سے وہ انتہائی محنت کرنے کے باوجود ناکام رہا۔ باپ راضی ہوا تو اللہ نے بھی خوش ہو کر اسے کامیاب انسان بنا دیا۔

وہ اپنے چھوٹے بیٹے کا شکر گزار تھا کہ اس نے اسے اس کا بھولا ہوا فرض یاد دلا دیا تھا۔ ورنہ! وہ جو آج اپنے باپ کے ساتھ کر رہا تھا، ویسا ہی کل اس کے ساتھ ہوسکتا تھا۔

بقیہ حصہ ''عدلیہ کی حمایت میں عوام سڑکوں پر''

رپورٹ ملے، تو ادارے کی پولیس اچانک، خفیہ طریقے سے کرپٹ آدمی کے گھر یا دفتر میں چھاپہ مارتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وہ وہاں کرپشن سے متعلق دستاویزی ثبوت، کمپیوٹر اور موبائل فون قبضے میں کر لے۔ اس طرح ثبوت پا کر کرپٹ آدمی کے خلاف مضبوط کیس تیار ہوجاتا ہے۔

رومانیہ کے کرپٹ سیاست داں اور سرکاری افسر اینٹی کرپشن ادارے کی اچانک چھاپے مارنے کی طاقت سے بہت خائف ہیں۔ وجہ یہ کہ انھی چھاپوں کے ذریعے حاصل ہونے والے ثبوتوں کی مدد سے ادارہ ایک (سابق) وزیراعظم، دو (سابق) نائب وزرائے اعظم، گیارہ وزرا اور پچاس سے زیادہ ارکان پارلیمنٹ پر مقدمے بنا چکا۔ اور عدلیہ ان میں سے تیس ملزموں کو مجرم قرار دے کر جیل بھی بھجوا چکی۔ رومانیہ کی اشرافیہ میں اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ اور عدلیہ کی زبردست فعالیت ہی سے کھلبلی مچی ہوئی ہے۔

☆ دوسری اہم مجوزہ قانونی تبدیلی یہ ہے کہ اب کرپشن کے ہر مقدمے میں کمپیوٹر، موبائل فون، سی سی ٹی وی فوٹیج اور وائرلیس کو بطور ثبوت تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

یہ بھی عدلیہ اور اینٹی کرپشن ادارے کی طاقت پر ایک بھرپور وار ہے۔ ظاہر ہے، اگر ایک کرپٹ سرکاری افسر سیاست داں کے خلاف ڈیجیٹل ثبوت ہی نہ مانے جائیں، تو اس پر چلتا مقدمہ خودبخود کمزور پڑ جائے گا۔

☆ تیسری مجوزہ قانونی تبدیلی یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری افسر یا سیاست داں دو لاکھ یورو سے کم رقم کی کرپشن میں ملوث ہے، تو اُسے کوئی کرمنل جرم نہیں مانا جائے گا۔

☆ چوتھی اہم قانونی تبدیلی یہ کہ اگر رشوت لیتا پکڑا جانے والا سرکاری افسر یا سیاست داں یہ کہتا ہے کہ اُس نے فلاں شخص کے کہنے پر کرپشن کی ہے، تو اس شخص کو ملزم نہیں سمجھا جائے گا۔

اس قانونی تبدیلی سے عیاں ہے کہ کرپٹ سیاست داں اپنے فرنٹ مینوں یا دست راستوں کو قانون کے حوالے کر

اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ کی خاتون سربراہ، لارا کوویسی

کے خود بچنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت تمام مجوزہ قانونی تبدیلیوں کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ کرپٹ سیاست داں اور سرکاری افسر کسی نہ کسی طرح قانون کی گرفت میں آنے سے بچ سکیں۔

عوام کا احتجاج

رومانیہ کے میڈیا میں جب چرچا ہوا کہ حکومت عدلیہ اور اینٹی کرپشن ادارے کی قوت کم کرنے کے سلسلے میں قانون سازی کر رہی ہے، تو عوام میں بے چینی پھیل گئی۔ انھیں محسوس ہوا کہ کرپٹ سیاست داں دوبارہ ملکی وسائل پر قابض ہونا چاہتے ہیں تاکہ اپنی لوٹ مار جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ عوام نے عدلیہ کی حمایت میں گھروں سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

www.urdugem.com

دسمبر ۲۰۱۷ء کے وسط سے رومانیہ کے شہروں میں احتجاجی جلسے جلوس منعقد ہونے لگے۔ ہزار ہا شہریوں نے مطالبہ کیا کہ سیاست داں جن قوانین سے عدلیہ و اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ کی طاقت پر قدغن لگانا چاہتے ہیں، وہ ختم کردیے جائیں۔ مظاہرین نے قرار دیا کہ کرپٹ سیاست داں ایک ''مافیا'' کا روپ دھار چکے، وہ سب مل جل کر ملک و قوم کو لوٹ رہے ہیں۔

عوامی مظاہروں سے عدلیہ کو تقویت ملی۔ جلد ہی رومانیہ کے دارالحکومت، بخارسٹ میں بھی ججوں اور مجسٹریٹوں نے مجوزہ قوانین کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ یہ قوانین فی الفور روک دیے جائیں۔

عوام اور عدلیہ کے سخت اور زبردست ردعمل نے پارلیمنٹ میں بیٹھے اور باہر موجود سیاست داں کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ تاہم انھوں نے ہار نہیں مانی اور مجوزہ قوانین کو سینٹ میں پیش کردیا۔ چونکہ وہاں حکمران اتحاد کی اکثریت ہے لہٰذا سینٹ میں بیٹھے کرپٹ سیاست دانوں نے خوشی خوشی مسوّدہ قوانین منظور کرلیا۔

لیکن نیکی اور بدی کے مابین جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ حزب اختلاف نے سپریم کورٹ میں مسودہ قوانین کو چیلنج کردیا۔ سپریم کورٹ کے ججوں نے پہلی ہی پیشی میں ان قوانین کو متنازع قرار دے ڈالا۔ یہ مقدمہ اب عدالت عالیہ میں زیرعمل ہے۔ جبکہ رومانیہ میں الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا میں مجوزہ قوانین کے مخالفین اور حامیوں کے مابین زبردست جنگ چھڑی ہوئی ہے۔

اس دوران یہ ڈرامائی تبدیلی آئی کہ رومانیہ کے صدر، کلاؤس یوہانیس نے بھی قوانین کی مخالفت کردی۔ رومانیہ کا صدر وزیراعظم جیسی طاقتیں تو نہیں رکھتا مگر اُسے مملکت میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا اور عموماً عوام کی خواہشات و جوابات کی ترجمانی کرتا ہے۔

حالات سے واضح ہے کہ یورپ میں واقع ہونے کے باوجود رومانیہ میں مٹھی بھر طبقہ اشرافیہ نے ملکی وسائل پر قبضہ کررکھا ہے۔ اس یورپی ملک کی صورت حال پاکستان اور دیگر ترقی پذیر ممالک سے ملتی جلتی ہے جہاں جمہوریت کے بھیس میں طبقہ امرا حکومت کررہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رومانیہ میں کرپٹ سیاست دانوں اور عدلیہ کے مابین لڑائی میں جیت کس کی ہوگی۔

اگر رومانیہ کے کرپٹ سیاست داں اپنے عزائم میں کامیاب ہوگئے، تو مملکت میں دوبارہ کرپشن کی گنگا بہنے لگے گی۔ مگر عدلیہ اور اینٹی کرپشن ڈائریکٹوریٹ کو فتح نصیب ہوئی، تو قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف کے باعث رومانیہ ترقی و خوشحالی کی نئی شاہراہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

رومانیہ اور پاکستان کے حالات کچھ ملتے جلتے ہیں۔ پاکستان میں بھی عدلیہ نے ایک وزیراعظم کو کرپٹ قرار دے کر گھر بھجوادیا۔ چونکہ وہ حکمران جماعت کے سربراہ ہیں لہٰذا ارکان پارلیمنٹ کی مدد سے ایسی قانون سازی کرانے لگے جو ان کے مفادات کو تحفظ دے سکے۔ اس جگہ پہنچ کر رومانیہ پاکستان میں یکسانیت ختم ہوجاتی ہے۔ وجہ یہ کہ پاکستان میں عوام اپنی عدلیہ کی حمایت میں باہر نہیں نکلے بلکہ یہاں الٹا حساب ہوگیا۔ وہ یہ کہ سابق وزیراعظم جلسے جلوس نکال کر دہائی دینے لگے کہ انھیں اقتدار سے کیوں محروم کیا گیا! یہی نہیں انھوں نے عوام کے ووٹوں کو عدلیہ پہ مقدم قرار دے دیا کہ اصل فیصلہ وہی کریں گے لیکن پاکستان کا کرپٹ جمہوری نظام الیکشن کے ذریعے کیا عدل و انصاف پر مبنی فیصلہ دے سکتا ہے؟ ◆◆◆

سلیم احمد

گیدڑ کالونی سے لالوکھیت تک

شہر قائد کے عجیب و غریب نام والے علاقوں کی پُرلطف داستان

دنیا کے تمام شہروں کی طرح شہر قائد، کراچی میں بھی بعض جگہوں اور محلوں کے نام انوکھے، دلچسپ اور مضحکہ خیز ہیں۔ ان علاقوں کے ناموں کی تاریخ قارئین اُردو ڈائجسٹ کے لیے پیش خدمت ہے۔

تین ہٹی:

مقامی سندھی زبان میں ہٹی ''دکان'' کو کہتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت موجودہ جہانگیر روڈ اور لسبیلہ روڈ کے سنگم پر لیاری ندی کے درمیان بے آباد کنارے پر گھوڑوں کے گھاس پھوس اور مویشیوں کے چارے کی تین دکانیں ایک ساتھ واقع تھیں۔ اس وقت وہاں درجنوں دکانیں، مارکیٹیں اور بے شمار رہائشی گھر موجود ہیں۔ اس کے باوجود اب تک اس جگہ کا نام تین ہٹی چلا آرہا ہے۔

مہاجر کیمپ:

۱۴/اگست کو پاکستان آزاد ہونے کے بعد جو مہاجرین ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے انھوں نے یہاں عارضی کیمپ لگائے تھے۔ یہاں اب پکے مکانات بن چکے اور اس وقت آنے والے تقریباً تمام مہاجرین اب مختلف علاقوں میں رہائش پزیر ہیں لیکن اس جگہ کا نام اب تک مہاجر کیمپ ہی ہے۔

گیدڑ کالونی:

لانڈھی میں واقع گیدڑ کالونی کا نام تبدیل کر کے اب مظفر آباد کالونی رکھ دیا ہے۔ گیدڑ کالونی نام رکھنے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یہاں کے باشندے کہتے ہیں کہ شہری آبادی سے دور واقع اس علاقے پر پھیلی جنگلی جھاڑیوں میں گیدڑ رہتے تھے جو رات کو خوراک کی تلاش میں آبادی میں آکر مکانوں کے گرد گھوما کرتے۔ ان کی آوازوں سے چور لٹیرے خوفزدہ ہو جاتے اور مارے ڈر کے اس آبادی کا رخ نہیں کرتے تھے۔ یوں یہاں کے باشندے ایک عرصہ تک چوری چکاری سے محفوظ رہے۔ اب اس علاقے میں گیدڑ تو نہیں آتے مگر یہاں کے مکینوں نے ان کی یاد میں اس کالونی کا نام گیدڑ کالونی ہی مشہور کررکھا ہے۔

گٹر باغیچہ:

اس علاقے میں نہ تو گٹر کثرت سے ہیں اور نہ ہی باغیچہ

www.urdugem.com

کسی گٹر میں بنایا گیا ہے۔ بلکہ کراچی کی اس وقت کی بلدیہ نے گٹر کے گندے پانی کو لیاری ندی میں گرنے سے پہلے ٹریٹمنٹ کے بعد قابل استعمال بنایا اور پرانے گولیمار میں واقع میوہ شاہ قبرستان سے متصل تقریباً ایک ہزار ایکڑ سے زائد بے آباد رقبے کو سیراب کرتے ہوئے تجرباتی طور پر وہاں کاشتکاری اور شجرکاری کی، جو بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ علاقہ سرسبز و شاداب ہوا تو اس علاقے کے مکینوں نے اُسے گٹر باغیچہ کا نام دے دیا جو آج تک اسی نام سے معروف ہے۔

ناگن چورنگی:

اس جگہ پر نہ تو کبھی کوئی لمبی چوڑی زہریلی ناگن نکلی تھی اور نہ ہی اس کے قریب سپیروں کی کوئی بستی آباد ہے۔ بس کسی زمانے میں نارتھ کراچی سے ملانے والی کچی سڑک اور چوراہے کو اس کی لہراتی بل کھاتی شکل کی وجہ سے وہاں کے لوگوں نے ''ناگن چورنگی'' کا نام دے دیا تھا۔ اب جدید کشادہ سڑک اور خوبصورت فلائی اوور زکی تعمیر کے باوجود اس جگہ کو ناگن چورنگی ہی کہا جاتا ہے۔

سولجر بازار:

دوسری جنگ عظیم میں جمع کیے گئے انگریز فوجیوں کے لیے ملکہ برطانیہ کے حکم و خرچے پر اس وقت کی بلدیہ نے ایک مارکیٹ تعمیر کی تھی۔ وہاں صرف فوجی جوان ہی اپنی روز مرہ کی خریداری کر سکتے تھے جس کی وجہ سے اس مارکیٹ کا نام سولجر بازار مشہور ہو گیا۔ اب گورے فوجی تو وہاں موجود نہیں، لیکن سولجر بازار موجود ہے۔

لالو کھیت:

لیاری ندی کے پانی سے لالو نامی زمیندار وہاں پر کھیتی باڑی کیا کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس علاقے میں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو آباد کیا گیا۔ اس علاقے کو لیاقت آباد کا سرکاری نام ملا۔ اب کھیتی باڑی کا نام و نشان تک ختم ہو چکا۔ پھل، سبزیوں کے پودوں اور درختوں کی جگہ یہاں کنکریٹ کا جنگل بن گیا ہے۔ ہر دور میں آنے والی حکومت اور سرکاری اداروں کی کوشش کے باوجود اس علاقے کا نام مکمل طور پر لیاقت آباد مشہور نہ ہو سکا۔

بیوہ کالونی:

منظور کالونی اور اعظم بستی کے عقب میں واقع ایک بڑی آبادی میں آج سے تقریباً پچپن سال پہلے ایک صاحب حیثیت خدا ترس شیخ نے غریب اور بے سہارا بیوہ خواتین کو سینکڑوں کوارٹر تعمیر کروا کر دیے تھے۔ اطراف کی آبادیوں میں ترقی کے بعد بیوہ کالونی کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ دولت، اثر و رسوخ، غنڈہ گردی کے ذریعے بیوہ عورتوں اور بچوں کو بے دخل کر کے ان کے کوارٹروں پر قبضہ مافیا قابض ہو گیا نتیجے میں بیوہ کالونی پر اب سہاگنوں کا قبضہ ہے۔ تاہم سرکاری طور پر اس علاقے یا آبادی کا نام بیوہ کالونی ہی ہے۔

شیش محل:

قاسم آباد کے علاقے میں ہر طرف شیشے کا بہترین اور لاجواب کام کرنے والے کاریگروں کی دکانیں تھیں۔ ان کا نفیس اور خوبصورت کام کراچی بھر میں سراہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ترقی حاصل کر کے وہ دیگر علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ اب بھی اس علاقے میں شیشے کا کام کرنے والوں کی چند پرانی دکانیں موجود ہیں۔ جب یہاں شیشے کا کام عروج پر تھا تو اسی مناسبت سے لوگوں نے اس علاقے کا نام شیش محل رکھ دیا جو آج تک اسی نام سے شناخت کیا جاتا ہے۔

خاموش کالونی:

فردوس کالونی کے عقب میں لیاری ندی اور گجر نالہ کے کنارے واقع قبرستان کی وجہ سے اس علاقے کا نام خاموش کالونی مشہور ہوا۔ قبضہ مافیا اور زمینوں پر ناجائز قبضہ کرنے والے گروپ نے قبریں مسمار کر کے کارخانے اور گیراج قائم کر لیے جبکہ فٹ پاتھ اور سروس روڈ پر رات بھر بسوں، ٹرکوں، رکشا، ٹیکسیوں کی مرمت اور ڈینٹنگ پینٹنگ کی جاتی

ہے۔ آج اس علاقے کے باشندے سکون اور خاموشی کے ایک منٹ کو بھی ترس گئے ہیں۔ دن رات مرمت کا شور و غل، گاڑیوں کی اعصاب شکن آوازوں کے باوجود علاقے کا نام ''خاموش کالونی'' ہی ہے۔

کالا پل:

جناح ہسپتال کے عقب میں واقع اوور ہیڈ ریلوے پل کو زنگ سے بچانے کے لیے محکمہ ریلوے نے اس پر کالا رنگ کر دیا تھا۔ اسی حوالے سے یہ علاقہ کالا پل کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حکومت سندھ نے خوشحال پاکستان پروگرام کے تحت لوہے کا پرانا، خستہ حال کالا پل ہٹا کر اب اس جگہ کنکریٹ کا جدید گورا پل بنا دیا ہے مگر کالا پل کا نام تبدیل نہ ہو سکا۔

مچھر کالونی:

پی اے ایف بیس مسرور (سابقہ ماڑی پور) جاتے ہوئے ماڑی پور روڈ پر آگرہ تاج، گل بائی، بلدیہ کے علاقے سے گزریں تو محسوس ہو گا کہ علاقہ بہت ہی گندہ اور متعفن ہے۔ دوسرے وہاں جا بجا گندے پانی کے نالے، تالاب اور جوہڑ واقع ہیں جو مچھروں کی نرسری کا کام کرتے ہیں۔ یہاں مچھروں کے ڈھیر ہر وقت گشت کرتے نظر آتے ہیں۔ کراچی میں رہائشی جگہ کی قلت اور بندرگاہ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ بندرگاہ پر مزدوری کرنے والے لوگوں کے لیے کشش رکھتا تھا۔

جہاں تک ممکن ہو سکا، لوگوں نے وہاں قدرتی تالاب اور جوہڑ ختم کر کے رہائش اختیار کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن اس کے باوجود مچھروں نے اپنا علاقہ چھوڑنے سے معذرت کر لی۔ اسی لیے مکینوں نے اس بستی کا نام مچھر کالونی رکھ دیا جو آج تک معروف ہے۔

بندر روڈ:

اس نام سے آپ یہ مت سمجھیے گا کہ یہاں بندروں نے شاید ڈیرہ جمایا ہوا تھا بلکہ اس علاقے کا نام بندر روڈ اس لیے پڑا کہ فارسی میں بندر لفظ کا مطلب ''بندرگاہ'' کے ہیں۔ چونکہ وہاں بندرگاہ موجود ہے، اس لیے مکینوں نے اس کو ''بندر روڈ'' کا نام دے دیا۔

میٹھا در:

قیام پاکستان کے بعد جب مسلمان پاکستان کی طرف ہجرت کر کے آئے تو مختلف علاقوں میں رہائش اختیار کرنے لگے۔ تب میٹھا در کے علاقے میں پانی کی قلت ہو گئی۔ پانی کے حصول کے لیے کھدائی کی گئی جہاں سے میٹھا پانی حاصل ہوا وہاں کے مکینوں نے اس علاقے کا نام میٹھا در رکھ دیا۔

کھارا در:

میٹھا در کے قریب ہی دوسرے علاقے کا نام کھارا در ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی آمد اس علاقے میں بھی ہوئی۔ پانی کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کنواں کھودا گیا جہاں سے کھارا پانی نکل آیا۔ اس وجہ سے اس علاقے کا نام کھارا در رکھا گیا۔

لائٹ ہاؤس:

سمندر کے کناروں پر بحری جہازوں کو راستہ دکھانے والا لائٹ ہاؤس کہلاتا ہے لیکن کراچی کے علاقے لائٹ ہاؤس کا یہ نام پڑنے کی وجہ قیام پاکستان کے وقت وہاں کا ایک مشہور سنیما گھر تھا جس کا نام لائٹ ہاؤس تھا۔ لوگ اس کی وجہ سے علاقے کو بھی لائٹ ہاؤس کہنے لگے۔ بعد ازاں سنیما گھر ختم کر کے کمرشل پلازہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ مارکیٹ لنڈے کے مال کی فروخت کے باعث جانی پہچانی جاتی ہے۔ سنیما گھر کے خاتمے کے باوجود آج تک اس علاقے کو اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔

کراچی میں اور بھی بہت سے ایسے علاقے اور آبادیاں ہیں جو دلچسپ اور عجیب ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وقت اور حکومت نے ان علاقوں کی حالت تو بدل دی مگر ان کے ناموں کو تبدیل نہ کروا سکے۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

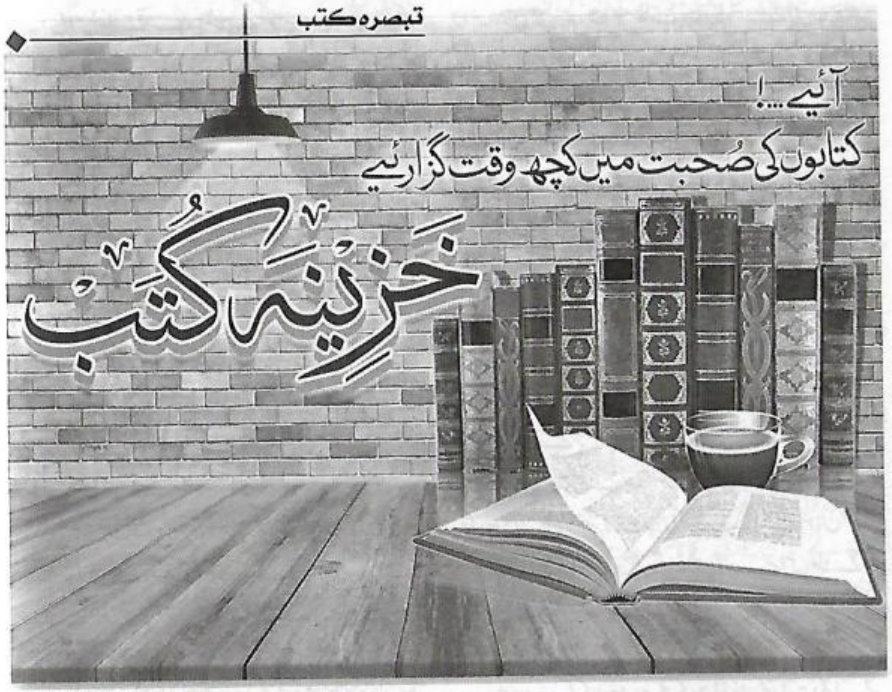

نام کتاب: معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو۔ مصنف، پروفیسر محمد ظہیر قندیل۔ ملنے کا پتا: بخاری لیبارٹریز، ۲۳۔ کیپٹن اسفندیار روڈ، اٹک۔ فون نمبر ۰۳۲۳۷۰۱۰۱۰۱: قیمت ۴۰۰ روپے۔

یہ ۱۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کی بات ہے، تحریک طالبان پاکستان کے دہشت گردوں نے پشاور میں بڈھ بیر کے مقام پر واقع پاک فضائیہ کی بیس پر حملہ کر دیا۔ اس وقت بیس پر پاک فضائیہ کے سینکڑوں ملازمین موجود تھے۔

اس موقع پر فوج کے کیپٹن اسفندیار احمد بخاری نے بڑی دلیری کا ثبوت دیا اور تن تنہا دہشت گردوں سے جا بھڑے۔ انھوں نے دہشت گرد جہنم رسید کر دیے مگر خود بھی جام شہادت نوش کیا۔ آپ کو بعد از مرگ پاکستان کے دوسرے بڑے عسکری، تمغۂ جرأت سے نوازا گیا۔ اگر کیپٹن شہید جرأت نہ دکھاتے تو شہادتیں کہیں زیادہ ہو سکتی تھیں۔

زیر تبصرہ کتاب کیپٹن اسفندیار شہید کی جگ بیتی ہے جو پروفیسر محمد ظہیر نے بڑی تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے۔ یہ نادر کتاب آشکارا کرتی ہے کہ کیپٹن شہید بچپن ہی میں بڑے ذہین اور جوہر قابل تھے۔ چناں چہ انھوں نے تعلیمی میدان میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور ہر جماعت میں اول آئے۔ چھوٹے ہی تھے کہ دفاع وطن ان کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ مرتب نے بچپن سے لے کر جوانی تک کیپٹن شہید کی حیات کے مختلف واقعات رقم کیے ہیں جو بڑے سبق آموز ہیں۔

یہ کتاب قاری میں جذبۂ حب الوطنی ابھارتی اور عیاں کرتی ہے کہ ہر پاکستانی کو اپنے وطن کی ترقی و خوشحالی کے لیے تن من دھن سے سعی کرنا چاہیے۔ یہ کتاب سفید کاغذ پر خوبصورتی سے طبع ہوئی ہے۔ آپ بیتی اور جگ بیتی پڑھنے والے قارئین اسے ایک منفرد کتاب پائیں گے۔ اسے اپنی لائبریری کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: طاؤس فقط رنگ، مصنفہ: نیلم احمد بشیر، ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ملنے کا پتا ۲۲: شاہراہ پاکستان لوئر مال۔ قیمت ۷۹۵: روپے۔ فون نمبر: ۰۴۲۳۷۲۲۰۱۰۰، ۰۴۲۳۷۲۲۸۱۴۳

نیلم احمد بشیر افسانوں کی دنیا میں ایسا چمکتا ہوا ستارہ ہیں جس کی آب و تاب تمام ادبی حلقوں کو منور کیے ہوئے ہے۔ زیر تبصرہ ان کی نئی کتاب ''طاؤس فقط رنگ'' اپنی تمام تر خوبیوں اور کہانی کے تانوں بانوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ کتاب ان والدین کے لیے تحفۂ خاص ثابت ہوگی جو امریکا کے مغرب زدہ ماحول میں اپنی اولاد کی پرورش تو کرنا چاہتے ہیں مگر پھر چاہ کر بھی انھیں کچھ کہہ نہیں پاتے، روک نہیں پاتے۔ جن کی یہ خواہش تو ہوتی ہے کہ ان کے بچے منہ ٹیڑھا کر کے فر فر انگریزی بولیں اور پاکستان میں بسنے والے اپنے خاندان پر رعب جھاڑیں، مگر جب وہی اولاد مغربی کلچر و ثقافت میں ڈوب جاتی اور وہاں کی رنگینیوں میں گم ہونے لگتی ہے تب یہی والدین چاہتے ہیں کہ کوئی ''پاکستانی'' مہذب بچہ یا بچی ان کی اولاد کا گھر بسانے آجائے۔ نیلم احمد بشیر کے اس ناول میں آپ کو جا بجا ان ایشیائی والدین کا کردار نظر آئے گا جو بیک وقت فخر و غم کے ملے جلے احساسات تلے زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں۔ برسوں پہلے دیارِ غیر میں جا بسنے والے پاکستانی جب جوان ہوتی اولاد کو امریکا کے گُن گاتے اور پاکستان سے نفرت کرتے دیکھتے ہیں تب انھیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے مگر تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ کہانی آپ سب قارئین کو اپنے اردگرد کی ہی کہانیوں میں سے ایک لگے گی۔ نیویارک میں ۹/۱۱ کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کے پس منظر میں لپٹا خوبصورت شاہکار طاؤس فقط رنگ بے حد مناسب قیمت اور اچھی طباعت کے ساتھ مارکیٹ میں بآسانی دستیاب ہے۔ اسے اپنی لائبریری کا حصہ بنا کر آپ یقیناً خوشی محسوس کریں گے۔

نام کتاب: شرف ہم کلامی۔ مصنف: محمود الحسن : ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز۔ ۲۵، لوئر مال، لاہور۔ فون نمبر ۷۲۲۸۱۴۳۔ قیمت ۲۰۰ روپے۔

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ادیب انتظار حسین (۱۹۲۳ء... ۲۰۱۶ء) نے طویل عمر پائی۔ اس دوران لکھنے لکھانے اور ادبا سے میل جول ہی میں ان کی زندگی گزری۔ نوجوان لکھاری، محمود الحسن اخیر برسوں میں انتظار صاحب کے ہم دم رہے اور ان کی سرگرمیوں کو نہایت قریب سے دیکھا۔ زیر تبصرہ کتاب ان سبق آموز واقعات اور نظریات کا منفرد مجموعہ ہے جن سے مرحوم ادیب کی ذات نتھی ہے۔

یہ واقعات ایک ایسی تہذیب و ثقافت کی یادگار ہیں جو

www.urdugem.com

اب تقریباً دم توڑ چکی۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ مرتب نے مسلمانانِ ہند کی اس مٹتی تہذیبی، علمی، ادبی اور ثقافتی روایات کو زیرِ تبصرہ کتاب میں محفوظ کر دیا۔ ایک واقعہ بطور مشتے نمونہ از خروارے پیشِ خدمت ہے:

''میرے والد مذہب کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک بار ''جلالی وظیفہ'' پڑھا تو اس میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ فوراً اُٹھے اور سبھی گھر والوں کو حکم دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ ہم اپنے رشتے داروں کے مکان میں چلے گئے۔ ہم نے کئی دن وہاں گزارے۔ والد کا دماغ الٹ گیا تھا پھر وہ رفتہ رفتہ صحت یاب ہوئے۔'' کتاب کی پیشکش معیاری ہے۔

نام کتاب: اُردو املا کے اصول۔ مصنف، پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ۔ ناشر: قریشی برادرز پبلشرز۔ اُردو بازار لاہور۔ قیمت ۲۰۰ : روپے۔

ہماری قومی زبان، اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔

پاکستان اور بھارت میں کروڑوں لوگ یہ پیاری و میٹھی زبان بولتے ہیں۔ مگر خصوصاً نوجوان نسل کی زندگیوں میں انگریزی زبان کے دخول سے لڑکے لڑکیاں اُردو بولنے اور پڑھنے میں فاش غلطیاں کرنے لگے ہیں۔ عوام و خواص کو اُردو کی درست املا سے آگاہ کروانے کے لیے مصنف نے یہ کتاب قلمبند کی ہے۔

پروفیسر صاحب نے اپنی اس مفید کتاب میں رموز و اوقاف، حروف ابجد کے استعمال، اُردو قاعدہ، حرکات، لفظوں کو ملا کر لکھنے، گنتی کی املا، الف تا یے حروف تہجی کے ۵۳ حروف کے املا وغیرہ کے متعلق عمدہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

یہ تصنیف خصوصاً طلبہ و طالبات کے لیے بہت کارآمد ہے جنھیں اُردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔

کتاب کی طباعت عمدہ کاغذ پر ہوئی ہے۔ جس گھر میں بچے بچیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، وہاں یہ مفید کتاب ضرور ہونی چاہیے۔ پاکستانی نئی نسل کو اُردو سے واقفیت و شناسائی ہونا وقت کی ضرورت ہے۔

نام کتاب: خواب سونے نہیں دیتے۔ شاعرہ: شاہدہ لطیف۔ ناشر: ماورا بکس، ۶۰، دی مال۔ لاہور۔ قیمت ۵۰۰ : روپے

علامہ اقبال کے شیدائی اور اقوالِ زریں پسند کرنے والے اِسے منفرد کتاب پائیں گے۔

اسلام آباد میں مقیم شاہدہ لطیف معروف شاعرہ و ادیبہ ہیں۔ اب تک آپ کی شاعری اور نعتوں کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے، زیرِ تبصرہ کتاب نواں مجموعہ ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو سے زائد غزلیں شامل ہیں۔

تازہ مجموعہ کلام کی بابت خالد شریف لکھتے ہیں کہ شاعرہ نے روایتی دائروں سے نکل کر وسیع ترکینوس میں غزلیں کہی ہیں۔ ان میں سیاست، معاشرت، معیشت، تصوف غرض ہر نوع کے موضوع شامل ہیں۔ غزلوں میں عصرِ حاضر کے مسائل اور الجھنوں کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔

یہ کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر خوبصورت انداز میں طبع ہوئی ہے۔ اس کا سرورق ممتاز مصور، اسلم کمال نے بنایا ہے۔ جدید غزل پسند کرنے والے اس مجموعہ کلام کو من پسند پائیں گے۔ غزلوں میں بسا احساس و تفکر بھی قارئین کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔

بقیہ حصہ: جنگ ستمبر کی یادیں

اُردو ڈائجسٹ کے متین و فہمیدہ پوتے، ایقان حسن قریشی نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے حصّہ لیا جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جناب الطاف حسن قریشی نے نہایت لطافت و فصاحت سے ان معرکوں کا احوال سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ تحریریں نہ صرف قیمتی معلومات سے بھرپور ہیں بلکہ مٹی سے الفت کے پاک جذبے بھی قاری کو روح پرور لمحوں سے آشنا کرواتے ہیں۔ کتاب کے کچھ اقتباسات بطور مشتے نمونہ از خروارے پیشِ خدمت ہیں:

بشیر احمد صاحب سے اقتصادیات، سیاسیات اور مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی۔ یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ صنعت کار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب فکر و نظر ہیں اور صرف پیٹ سے نہیں، دل و دماغ سے بھی سوچتے ہیں۔ دورانِ گفتگو کہنے لگے:

''یہ سرسبز و شاداب چمن ہمارا اپنا ہے۔ ایک مستعد کسان اور ایک فرض شناس مالی کی طرح ہمیں اس کے ہر خوشے اور ہر پھول کی رکھوالی کرنی ہے۔ میں نے اہلِ جرمنی کو اپنی قوم کے لیے کام کرتے دیکھا ہے۔ شب و روز مشین کی طرح، ایک دو مہینے نہیں، سال ہا سال خارجی دباؤ کے بغیر۔ میں جس سے بھی ملا، اُسے ایک ہی دُھن میں مگن پایا کہ میں اپنے ملک کی دولت، شہرت اور عظمت میں کس طرح اضافہ کر سکتا ہوں۔ میں نے برسوں اُن میں سے کسی کو بے کار نہیں دیکھا۔ قریشی صاحب! ہماری قوم تو جرمن قوم سے بھی زیادہ عظیم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ایک لمحہ ضائع نہیں کرے گی۔'' (صفحہ ۸۶)

☆☆☆

جب ہمارے طیارے امرتسر کی طرف لپکے تھے، تب طیارہ شکن توپیں بہت دیر تک آگ اُگلتی رہی تھی۔ یہ توپیں بھی ہمارے قریب ہی نصب تھیں۔ ایک گولی بھی تو نشانے پر نہ لگی۔ ہمیں فکر ہوئی کہ ان اناڑی فوجیوں کی زد میں کہیں ہم نہ آ جائیں۔ گولے ہمارے بالکل نزدیک گر رہے تھے۔ اگرچہ دھما دھم کی کرخت آوازوں سے دماغ ماؤف ہو گیا تھا، لیکن بھارتی فوجیوں کی 'حسن کارکردگی' دیکھ کر مجھے حالی کی ایک نظم یاد آ گئی جو چھٹی جماعت میں پڑھی تھی۔ اُس نظم میں دکھایا گیا تھا کہ کوئی امیرزادہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ ایک دن صحرا میں تیر اندازی کے لیے نکلا۔ اُسے تیر کمان سے کچھ واقفیت نہیں تھی۔ وہ تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا اور ایک بھی تیر نشانے پر نہیں لگتا تھا۔ اس کے باوجود مصاحب تعریف میں رطب اللسان تھے۔ ایک ظریف بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور خاک کے اُس تودے پر جا بیٹھا جو امیرزادے کا ہدف تھا۔ اس پر خوشامدیوں اور امیرزادے نے بہت شور مچایا کہ کیوں مرنے لگا ہے؟ کیا تجھے اپنی زندگی عزیز نہیں؟ اس پر ظریف کا جواب مجھے آج بھی یاد ہے۔

زد سے ان بے پناہ تیروں کی
کہیں جاندار کو امان نہیں
مجھ کو ہر پھر کے شش جہت میں حضور
امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

مجھے بھارتی سینا اور امیرزادے میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ ان کے گولوں سے بچنے کی صحیح جگہ تو پاکستانی طیاروں میں تھی جہاں پہنچنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ (صفحہ ۱۸۳)

یہ شاندار کتاب جمہوری پبلی کیشنز، ۲۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور، فون نمبر ۴۴۶۳۱۲۱-۰۳۳۳ نے بڑے دیدہ زیب انداز میں شائع کی ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ ہے اور چھپائی بھی اعلیٰ! گوناگوں خوبیوں کے باعث قیمت ایک ہزار روپے مناسب ہے۔ تاریخ پاکستان اور جنگ ستمبر سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اسے مرغوب و دل پسند کتاب پائیں گے۔

www.urdugem.com

پاکستان کا بنیادی مسئلہ

پاکستان اس وقت گوناگوں مسائل کا شکار ہے۔ سب سے پریشان کن حال بدعنوانی کا ہے۔ پھر بیروزگاری اور تعلیم وصحت کا ناقص انتظام ہے۔ بدکرداری و بداخلاقی کا دور دورہ ہے۔ آمدورفت کے ذرائع محدود اور تکلیف دہ ہیں۔ لوگ یہاں کام کرنے کے عادی نہیں اور بیرونِ ملک جا کر سخت جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا میں حلال و حرام کی تمیز ختم ہو چکی۔ ملاوٹ اور بددیانتی کے بغیر کوئی کاروبار کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دیانتدار آدمی طرح طرح کی مشکلات کا شکار رہتا اور معاشرے میں احمق گردانا جاتا ہے۔ حکومت کے نمائندے جعلی پبلسٹی سے خوب نام کماتے ہیں۔ مختلف این جی اوز خوب مال بناتی ہیں۔ قدرتی آفات کو بھی ہم نے کاروبار چمکانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔

ان تمام آفات و آلام کا اگر غور و فکر سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان کی بنیادی وجہ ہمارے سیاستدان ہیں جو اقتدار اور دولت کی خاطر شرافت و نجابت کی تمام حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ انھوں نے اربوں روپے کے قرضے معاف کروائے۔ ان کی بیرونِ ملک دولت و جائیدادوں کا کوئی شمار ہی نہیں۔ اگر ان سے مال و دولت واپس لے کر ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کی جائے تو ہمارے تمام مسائل قلیل عرصے میں حل ہو سکتے ہیں۔ جس شاطر اور چرب زبان شخص کو اِدھر اُدھر سے چند ٹکے حاصل ہو جائیں وہ اپنی این جی او یا سیاسی جماعت بناتا اور عوام کے جذبات سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنا اور باہمی دشنام طرازی ان کا منشور ہے۔ لیکن ان کے اقتدار کو خطرہ ہو تو باہمی شیر و شکر ہو

جاتے ہیں۔ اگر کبھی ملک میں انتظامیہ کی حکومت قائم ہو جائے تو یہ اس کے ساتھ بھی مل کر دوسرے درجے کا اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور اپنا کرپشن کا کاروبار جاری رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد سول اور ملٹری انتظامیہ کو بدنام کر کے جمہوریت اور عوامی حقوق کے نعرے لگا کر پھر سیاست کے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے یہی کاروبار کر رہے۔ اگر ایک کوٹھکانے لگایا جائے تو اس کی کوکھ سے بیسیوں جنم لیتے ہیں اور لوٹ مار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس وقت پاکستان میں ایک ہزار سے کچھ زیادہ حاضر سروس سیاستدان ہیں اور تقریباً دس ہزار کے قریب ”ویٹنگ لسٹ“ میں ہیں۔ ان کے جیالوں کی تعداد پچاس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان سب کا بنیادی منشور لوٹ مار، قتل و غارت، فتنہ و فساد اور ان پڑھ و جذباتی عوام کو بھڑکانا ہے۔ فوج اور رینجرز نے جب ان کے خفیہ ٹھکانوں پر چھاپے مارے اور ان کے راہزنوں پہ ہاتھ ڈالا تو ان کے لیڈر آپے سے باہر ہو گئے اور مختلف اداروں کو بدنام کرنا شروع کر دیا لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ فوج کا آہنی پنجہ بے خوف و خطر ان کے خاتمے پر تلا ہوا ہے تو یہ چھپتے پھرتے اور وضاحتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عیاشی کے دن گنے جا چکے۔ اب بڑے بڑے مگرمچھوں پہ ہاتھ ڈالا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ ایک سال کے اندر ان سے گلوخلاصی کی کوئی بہتر صورت سامنے آجائے گی۔

(اسکواڈرن لیڈر (ر) سید ریاض الحسن، لاہور)

قوم کا بطل جلیل

آپ نے شمارہ فروری کے سرورق پر ائیر مارشل اصغر خان کی تصویر کا انتخاب کر کے اور ان کے بارے میں دو مضامین شامل کر کے اس بطل جلیل کی فوجی خدمات کو صحیح طور پر اُجاگر کیا۔ چاہے پاکستان ائیر فورس کی قیادت ہو یا پی آئی اے کی، ائیر مارشل اصغر خان کی گراں قدر خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ مرحوم ایک عظیم محب الوطن راہنما تھے۔ جب وہ سیاست کے میدان میں اُترے، تو بہتی گنگا کے دھارے میں بہنے کے بجائے انھوں نے اصول پرستی اور دیانت کا علم بلند کیا۔ آج کے پُرآشوب دور میں جب ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے اور وطنِ عزیز پھر ایک بحران سے دوچار ہے ائیر مارشل اصغر خان جیسے محب وطن اور عظیم راہنما کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

(انجینئر انور حسین مجاہد، جوہر ٹاؤن لاہور)

☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ کے سرورق پر نظر پڑی تو ائیر مارشل اصغر خان کی خوبصورت تصویر دیکھ کر مجھے وہ وقت یاد آنے لگا جب ہم ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت سے نبرد آزما ہوئے۔ ہماری جانباز، محب وطن عسکری قیادت کو اللہ کی نصرت کے ساتھ کامیابی ملی۔ دنیا بھر میں ہمارے ملک کا نام بلند ہوا۔ ان دنوں بڑے بھائی صاحب حفیظ الرحمن احسن مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر تھے اور میں ان کے پبلشنگ ادارے ”ایوانِ ادب“ میں ان کی جگہ فرائض منصبی انجام دے رہا تھا۔ جنگ کے فوراً بعد ملک کے نامور شعراء کا ملّی نغموں اور ترانوں پر مشتمل ایک یادگار مجموعہ ”کلبانگ جہاد“ شائع ہوا جسے بہت پزیرائی ملی۔ میں نے اس کتاب کی کچھ کاپیاں جناب ائیر مارشل اصغر خان کو بھجوا دیں۔ جواب میں ایک مکتوب ملا جو ان کی اس وطنِ عزیز سے شدید محبت کا آشکارا کرتا تھا۔

انھوں نے پہلے تو ”کلبانگ جہاد“ بھجوانے پر شکریہ ادا کیا پھر انھوں نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا، ”لہو گرم رکھنے کو ایسی کتابیں لکھی جانی چاہئیں“۔ مزید انھوں نے رزمیہ نظموں کے انتخاب پر تعریف کی۔ اب جب کبھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو طمانیت نصیب ہوتی ہے۔

(وقار الرحمن، اقبال ٹاؤن لاہور)

www.urdugem.com

''زندہ قومیں اپنے ہیرو اور محسنوں کو ہمیشہ خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں''

جدید صحافت کے بانی

جناب ضیا شاہد چیف ایگزیکٹو خبریں گروپ کی 50 سالہ قومی خدمات کے اعتراف میں

ہر ضلع ہیڈ کوارٹر میں ''ضیا شاہد لائبریری اور ریسرچ سینٹر'' کے قیام کا فیصلہ

صحافت کے میدان میں 50 سال مکمل ہونے پر جناب ضیا شاہد کی علمی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کے ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں، ''ضیا شاہد لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر'' کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس ضمن میں ایسے علم دوست، کتاب سے محبت کرنے والے مخیّر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے جو ''لائبریری اور ریسرچ سینٹر'' کیلئے کمرہ، عمارت، یا قطعہ اراضی ''صدقہ جاریہ'' کے طور پر گفٹ یا لیز کریں، نیز ہر ضلع کے ادیب، شاعر، مصنف اور ناشر حضرات سے لائبریریز کیلئے کتابوں کے تحفہ'' کی بھی درخواست ہے،

رابطہ قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل یثرب کالونی والٹن روڈ بینک سٹاپ لاہور کینٹ

0333-4393422/0300-0515101

0321-4788517/0300-8422518

qalalmfoundation3@gmail.com

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

ملاقاتیں کیا کیا — الطاف حسن قریشی کی معرکہ آرا کتابیں — **جنگِ ستمبر 1965ء کی یادیں**

نایاب قومی اور عالمی شخصیات کے انٹرویوز — قیمت 1490 روپے — دفاعِ وطن کے 17 دنوں کی داستان — نادر تاریخ، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں — قیمت 1000 روپے

مجھے کیوں نکالا؟ نواز شریف کے فوج سے اختلافات — مصنف اسد اللہ خان

انکشافات سے لبریز کتاب۔ سول ملٹری کے تعلقات کے چشم کُشا حقائق — قیمت 640 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	860	سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ	ضمیر احمد ہاشمی	400
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380	تاریخِ عالم	ڈاکٹر فیدور کروکن	750
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ و تہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480	اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آراء امام	650
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	380	امریکہ کی عوامی تاریخ	ہاورڈ زن	600
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180	مسلمان اُندلس میں	شیلے لین پول	380
سکندرِ اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	540	ناموس (ناول)	ایلف شفق	650
سلیمان عالیشان۔ تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520	رسولِ کائنات (سیرتِ نبوی)	عبدالکریم شمر	400
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590	سرخ میرا نام (ناول)	اورحان پاموک	780
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580	اُجڑے دیار (ناول)	انطونیو تورلیس	500
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990	سرزمین (ناول)	انطونیو تورلیس	300
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800	چلتا مسافر (ناول)	الطاف فاطمہ	800
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	300	خواب گر (ناول)	الطاف فاطمہ	800
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	شیشے کا آدمی (مختصر روسی افسانے)	ڈاکٹر نجم الحسن	550

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح — Rs.600

کہانی جلال الدین رومی کی — **چالیس چراغ عشق کے** (ترجمہ) — ایلف شفق — Rs.880 *(The Forty Rules Of Love)*

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2 ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

www.urdugem.com

PUNJAB HIGHWAY DEPARTMENT

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rates are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors/firms enlisted/renewed with C&W Department for the current financial year in the field of Highway Works.

Tender documents can be obtained from any of the below mentioned offices immediately after publication of advertisement notice, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/upto date renewal letter, PEC License, GR, Computerized National Identity Card of contractor/managing partner/director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR/Bank Draft/Cashier's Cheque in favour of Executive Engineer, Highway Division Sahiwal of any scheduled bank:-

1. Chief Engineer, (Central Zone), Punjab Highway Department, Lahore.
2. Commissioner, Sahiwal Division, Sahiwal.
3. Superintending Engineer, Highway Circle, Sahiwal.
4. Deputy Commissioner Sahiwal.
5. Executive Engineer, Highway Division, Sahiwal.
6. Assistant Commissioner, Sahiwal.

Tender rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be singed as per general directions given in the tender document. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Tenders will be received in the offices of Chief Engineer (Central Zone), Punjab Highway Department, Lahore and Commissioner Sahiwal Division, Sahiwal and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders and tenders not accompanied with earnest money @ 2% of the estimate cost in shape of CDR/ Bank Draft/Cashier's Cheque of any scheduled bank in favour of Executive Engineer, Highway Division, Sahiwal and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained. All the PPRA Rules 2014 will be followed for tendering process.

Note: owner/representative of the firm will produce the original documents of the firm along with attested copies at the time of issuance of tender documents, otherwise, tender document will not be issued.

Sr. No	Name of Work	Estimated Cost/ Earnest Money	TS No & Date	Tender Fee	Last date of submission of application & purchase of tenders	Last date & time for receipt/ opening of tenders
1-	2-	3-	4-	5-	6-	7-
1-	Winding/Improvement of road from Pull 47/5-L to 61/5-L 7.70 Km (Remaining Portion) Group-II From Km No.3.60 to 7.70= 4.10 Km	47.706 (M) 0.955 (M)	CE (Central) vide No. 632/Plg, dated 19.02.2018	10,000/-	12.03.2018 During office hours.	14.03.2018 at 01:00 P.M/01:30 P.M In Commissioner Officer Sahiwal
2-	Winding / Improvement of road Adda Mai Wali Masjid to Adda Booti Pall Length=4.30 Km In District Sahiwal Group-II From Km No.2.38 to 4.30 Km= 1.92 Km	27.300 (M) 0.546 (M)	CE (Central) vide No. 640/Plg, dated 19.02.2018	10,000/-	-do-	-do-
3-	Winding / Improvement of road from Ali Ghar Chowk to Adda Wali, Basti Baba Fareed Muhammad pur road, Length=5.72Km In District Sahiwal Group-I From Km No.0.00 To2.62=2.62	48.127 (M) 0.963 (M)	CE (Central) vide No. 648/Plg, dated 19.02.2018	10,000/-	-do-	-do-
4-	Winding / Improvement & Construction of Metalled Road Kotla Adeeb Shaheed to. UC 116/7CR, length = 6.50 Km In District Sahiwal(PP-225) (Group-I) From Km No.0.00 to 3.25 Km	33.200 (M) 0.0664 (M)	CE (Central) vide No. 656/Plg, dated 19.02.2018	10,000/-	-do-	-do-
5-	Winding / Improvement & Construction of Metalled Road, from Chichawatni-Okanwala Road to Kassowal-Okanawala Road, length = 11.40 Km In District Sahiwal(PP-225) (Group-I) From Km No.0.00 to 4.10 Km	32.217 (M) 0.645 (M)	CE (Central) vide No. 664/Plg, dated 19.02.2018	10,000/-	12.03.2018 During office hours	14.03.2018 At 01:00 P.M/01:30 P.M in Commissioner Office Sahiwal
6-	Rehabilitation/Winding/ Improvement/Repairing/ overlay etc roads in District Sahiwal. (PP-222)(ADP No.6690) (Group-I) (i) Mouza Chokhandi Road length 0.61Km (ii) Rehabilitation of road Mouza Basheera road to	22.685 (M) 0.455 (M)	CE (Central) vide No. 731/Plg, dated 20.02.2018	10,000/-	-do-	-do-

www.urdugem.com

	(i) Mouza Chokhandi Road length 0.61Km (ii) Rehabilitation of road Mouza Basheera road to 63/GD length 2.60km (iii) Kaure shah road to 54/GD Bhoor, Saidan Shah, length 0.44Km (iv) Chak No.56/GD road length 0.90Km (v) Mouza Akhbar Shah road length 0.50Km (vi) Bye Pass Sahiwal to 134/9-L & madras Length 0.85Km (vii) Mouza Nama Samoor road length 0.35Km (viii) Gallary road length 0.18Km					
7-	Rehabilitation/Winding/ Improvement/Repairing/ overlay etc roads in District Sahiwal (PP-222)(ADP No.6690) (Group-II) (i) Chak No.88/6-R Naiki to 88/A-6-R Rajpootan Wali road length 1.00 Km (ii) Chak No.86/9-L road length 0.42 Km (iii) Chak No.90/9-L road length 0.60Km (iv) Chak No.98/9-L road length 0.97Km (v) Chak No.108/9-L road length 0.19Km (vi) Chak No.109/9-L road length 0.65Km (vii) Chak No.112./9-L road length 1.02Km (viii) Chak No.135/9-L road length 0.58Km (xi) Chak No.136/9-L road length 0.33Km	21.105 (M) 0.425 (M)	CE (Central) vide No. 731/Plg, dated 20.02.2018	10,000/-	-do-	-do-

IPL-2463

Executive Engineer
Highway Division
Sahiwal

Superintending Engineer
Highway Division
Sahiwal

مفتی محمد کریم اختر اورکزئی

ملاوٹ کی بیماری

یہ بدخصلت بیرونِ ملک بھی ہماری "قومی" پہچان بن چکی ہے

آج من حیث القوم ہم بے شمار برائیوں اور ان گنت دینی واخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے۔ بے حسی کی انتہا کہ ہمیں ان میں نہ تو کوئی بُرائی نظر آتی ہے نا ہی احساس گراوٹ۔ ان میں جھوٹ، دھوکہ دہی، الزام تراشی، سفارش ورشوت ستانی، اقربا پروری، ذخیرہ اندوزی، گداگری، چوری، ڈکیتی، جیب کترائی، اغواء برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، کرپشن، سٹہ بازی، ناپ تول میں کمی، وعدہ خلافی وغیرہ ہماری روزمرہ زندگیوں میں اس طرح رچ بس چکے کہ ان کے بغیر اب "گزارا" کرنا ممکن ہی نہیں لگتا۔

منجملہ برائیوں میں سے ایک انتہائی انسانیت سوز عمل اور مہلک بیماری "ملاوٹ" بھی ہے۔ ملاوٹ کی یہ گندی خصلت اب وطن عزیز کے ہر شعبے سے منسلک افراد کو جنگل میں آگ کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتی جارہی ہے۔ تاجر، موچی، قصائی، درزی، کبابی، دودھ فروش، سبزی فروش، قیمہ فروش، مسالا فروش غرض ہر کوئی اس وبا میں کسی پشیمانی یا احساس کے بغیر مبتلا ہے۔

دُکھ اس بات کا ہے کہ اب کوئی اسے گناہ سمجھتا ہی نہیں۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ کن کن اشیا میں کس ذہانت سے کیا کیا ملاوٹیں کی جاتی ہیں کہ عام انسان کبھی اصلی اور ملاوٹ شدہ چیز میں فرق ہی نہیں کر پاتا۔ دودھ فروش بہت دھڑلے سے دودھ میں پانی ملاتا ہے۔ مسالا فروش اس میں سرخ اینٹ اور دیگر گندی چیزوں کی ملاوٹ کرتا ہے۔ قیمہ فروش قیمہ کے نام پر چربی اور پیاز کا ملغوبہ بیچ رہا ہے۔ چائے فروش چائے کی پتی میں رنگ اور خون کی ملاوٹ کرتا ہے۔ سبزی فروش باسی سبزی پر پانی چھڑک چھڑک کر تازہ سبزی کے نام سے بیچتا ہے۔ بازار میں ملائی (کریم) کے نام پہ دودھ میں باسی ڈبل روٹی کا چورہ ملا کر بیچا جاتا ہے۔ جبکہ گائے کے گوشت کے نام پر گدھے کا گوشت فروخت کرنا اکثر قصائیوں کا معمول ہے۔

آج وطن عزیز میں یہ حال ہے کہ بازار سے ملاوٹ سے پاک چیزوں کا لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ افسوس کہ ملاوٹ کی یہ گندی خصلت وعادت اب عالمی سطح پر بھی ہماری پہچان بنتی جارہی ہے۔ اس حوالے سے مجھے میرے ایک تبلیغی دوست نے ایک یاس انگیز واقعہ سنایا جسے سن کر میں کف افسوس ہی ملتا رہ گیا۔ اس نے بتایا: "ایک مرتبہ ہماری سات ماہ کی تشکیل کسی باہر ملک میں ہوئی (دوست نے جس ملک نام لیا تھا مجھے وہ یاد نہیں اور نہ ہی وہ دوست اب اس دنیا میں رہے)۔ جب ہم وہاں پہنچے تو حسب عادت امیر کی اجازت سے قریبی مارکیٹ سے کچھ سودا سلف لانے نکلے۔ ابھی ہم مارکیٹ پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے ایک بڑی دکان کا مالک نکل کر تیزی سے ہماری طرف لپکا اور قریب پہنچ کر کہنے لگا: کیا

www.urdugem.com

آپ پاکستان سے ہیں؟(Are You From Pakistan)ہم نے جھٹ سے جواب دیا:(Yes We Are Pakistanis!)۔ جی۔۔ہم پاکستانی ہیں۔

ہم خوش ہوئے کہ شاید گوروں میں آج بھی ایسے انسان موجود ہیں جو ہمارے ملک سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ اپنی بھری دوکان چھوڑ کر ہمارے پاس چل کر آئے اور ہم سے بات کی۔ ہماری یہ خوش فہمی تب دور ہوئی جب اس دکاندار نے ہمارے ترجمان ساتھی کو گریبان سے پکڑا اور اپنی دکان کی طرف تیزی سے گھسیٹنے لگا۔ اس اچانک افتاد سے ہم سب کا حواس باختہ ہونا فطری امر تھا۔ سو مرتے کیا نہ کرتے اپنے دوست کے پیچھے پیچھے ہم بھی دکان پہنچے۔ وہاں جو کچھ ہماری ان گناہگار آنکھوں نے دیکھا۔ اس کی وجہ سے ہمارے سر شرم سے جھک گئے۔ اس دکاندار نے اب بھی ہمارے ترجمان ساتھی کا کالر پکڑ رکھا تھا۔ ہماری نظریں سامنے گھی کے ایک اوندھے منہ پڑے کنستر پر جمی تھیں جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا MADE IN PAKISTAN ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ گھی کے اس کنستر میں گھی سے زیادہ گھاس پھونس تھا جو نکل کر دکان کے فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ وہ آدمی روتے ہوئے بولا: ''دیکھو دیکھو! یہ تم پاکستانیوں کے کرتوت۔ جس وجہ سے میرا لاکھوں کا نقصان ہوا۔'' پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور کہا، ''تم یہاں اس لیے آتے ہو نا؟ کہ ہمیں اپنے دین کی اچھی باتیں بتا کر ہمیں اسلام کی طرف راغب کر سکو۔ ہمیں مسلمان بنا سکو۔ ہے نا؟ لیکن کیا تم نے خود کبھی سوچا کہ تم کیسے مسلمان ہو؟ تم لوگ خود اپنی مذہبی کتاب پر ذرہ برابر ایمان نہیں رکھتے۔ کیا تمہاری مذہبی کتاب میں دھوکہ، فریب اور ملاوٹ سے بچنے کا حکم موجود نہیں؟

کیا تمہارے پیغمبر (ﷺ) نے تمھیں اس سے باز رہنے کا حکم نہیں دیا؟ اگر تمہارے دین میں اس سے متعلق احکام موجود ہیں اور تمہارے پیغمبر نے بھی ان سب سے باز رہنے کی تلقین کی ہے اور اس کے باوجود تمہارے تاجر ایسی گھناؤنی حرکت کرتے ہیں تو پہلے تم انہیں کیوں نہیں سمجھاتے؟ ہمیں مسلمان بنانے کے لیے یہاں جو منہ اٹھا کر چلے آتے ہو...... جاؤ پہلے خود کو ٹھیک کرلو پھر ہمارے پاس چلے آنا۔

ایک غیر مسلم کے منہ سے حقیقت سن کر ہم شرم سے پانی پانی ہوتے جا رہے تھے۔ ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ہم دل ہی دل میں اُن بدبخت لوگوں کو کوس رہے تھے اور ان کے راہِ راست پر آنے کی دعا مانگ رہے تھے جن کی وجہ سے ہمیں آج یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ ایسی حرکت سے انھوں نے نہ صرف اپنی ذات کے لیے گناہ کمایا بلکہ اس قبیح و شنیع فعل کا ارتکاب کر کے اسلام اور پاکستان کو بدنام کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ میرے دوست کا سنایا ہوا مذکورہ بالا واقعہ فسانہ نہیں حقیقت ہے۔

آج کل تو آئے روز ایسے کئی حقیقت افروز مگر دل دوز واقعات اخبارات و جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں، مگر پھر بھی نہ تو ہم باز آتے نہ کسی کے کان پر جوں رینگتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ کچھ نیک دل افسران حسب استطاعت اس گھناؤنی حرکت کے مرتکب افراد کے خلاف ایکشن لیتے ہیں لیکن کچھ دن سلاخوں کے پیچھے رہ کر سفارش اور رشوتوں کے بل بوتے پر وہ دوبارہ رہا ہوتے اور ایک بار پھر اسی مکروہ دھندے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

افسوس! کہ وطن عزیز کے اسلامی ملک ہونے کے باوجود یہاں شہر شہر، قریہ قریہ، بستی بستی، ملاوٹ کا بازار گرم ہے۔ ایسا نہیں کہ ہمیں اپنی تعلیمات کا پتا نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ کوئی سمجھانے بتانے والا نہیں۔ سب کچھ ہے، بس ضمیر ہی نہیں ہے۔ ہم سب جانتے، سمجھتے ہیں لیکن پیسے و دولت کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے ملاوٹ اس قدر بدترین جرم ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے باوجود رحمۃ للعالمین ہونے کے، اس کے مرتکب

کو اپنا امتی ماننے سے انکار کیا ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لیے اسے زیادہ وعید کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں: ''نبی پاک ﷺ غلہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے، آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس (غلہ) کے اندر داخل کیا تو انگلیوں میں تری (نمی) لگی۔ آپ ﷺ نے اس غلے والے سے فرمایا ''یہ کیا؟'' اس نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! بارش کا پانی اس پر پڑ گیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''جب یہ بات تھی تو اس کو اُوپر کیوں نہ کر دیا۔ تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیں،'' پھر فرمایا ''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔''

مذکورہ بالا روایت میں چند الفاظ ایسے آئے ہیں جو آج کل زبان زد عام ہونے کے علاوہ ملک کی اکثر ملک شاپس کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھے ہوتے ہیں، مگر اس کے عین نیچے پھر بھی دودھ میں ملاوٹ کا عمل بڑے ہی احسن طریقے سے جاری رہتا ہے۔ وہ الفاظ یہی ہیں: ''من غش فلیس منا'' ''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم سے نہیں''۔ ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے محدث سہارنپور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''بذل المجہود'' میں لکھتے ہیں ''فلیس منا'' کا مطلب وہ ہماری سیرت اور طریقے پر چلنے والا نہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کی مراد اس سے یہ ہے کہ جو کوئی بھی اپنے بھائی سے دھوکا کرے یا اس کی خیر خواہی کو نظر انداز کر دے تو گویا اس نے میری تابعداری اور میرے طریقے پر چلنا چھوڑ دیا۔ کتنی بری بات ہے کہ آج ہم اپنے آپ کو عاشق رسول ﷺ کہتے نہیں تھکتے لیکن جس رسول ﷺ سے ہم عشق کے دعویدار ہیں ان کی طرف سے اتنی سخت الفاظ میں وعید سنانے کے باوجود ہم ملاوٹ جیسی گھٹیا اور گھناؤنی حرکات سے باز نہیں آتے۔

امیر المومنین حضرت سیدنا عمر فاروقؓ اپنے دورِ حکومت میں بازاروں میں باقاعدہ گشت کیا کرتے تھے اور جہاں بھی ایسی ویسی حرکت کے بارے میں معلوم ہوتا اس کا سدباب کرتے۔ ایک مرتبہ ایک دودھ فروش کے متعلق معلوم ہوا کہ اس نے دودھ میں پانی ملایا ہے تو اس کا سارا دودھ زمین پر بہا دیا۔

ان روایات کی روشنی میں حکومتِ وقت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ملاوٹ کے خاتمے کے لیے سخت سے سخت قوانین بنائیں اور ملاوٹ مافیا جو اشیا خورونوش سے لے کر دوائیوں تک میں آمیزش کر کے لوگوں کی جانوں سے کھیل رہا ہے، کو نہ صرف عبرتناک سزائیں دیں بلکہ ان کا کاروبار بند کر کے ان کا سامانِ تجارت ضبط کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لائسنس بھی منسوخ کر دیے جائیں تاکہ آئندہ کے لیے کسی کو بھی ایسی گھناؤنی حرکت کی جرأت نہ ہو۔

موجودہ حالات میں بے اختیار میری زبان پر جناب نیاز سواتی کے ''ملاوٹ نامہ'' کے نام سے لکھے ہوئے اشعار جاری ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

خوردنی اجناس میں پتھر ملا دیتے ہیں لوگ
جانے یہ کس جرم کی ہم کو سزا دیتے ہیں لوگ
یوں صفائی ہاتھ کی ہم کو دکھا دیتے ہیں لوگ
آج کل پیتل کو بھی سونا بنا دیتے ہیں لوگ
آپ کرتے ہیں گلہ چائے میں چھلکوں کا حضور
اب تو آٹے میں ہمیں بھوسا کھلا دیتے ہیں لوگ
سرخ مرچوں میں ملا دیتے ہیں اینٹیں پیس کر
اور آلو ڈال کر گھی میں ملا دیتے ہیں لوگ
مالٹے بھی آج کل خالص نہیں ملتے ہمیں
ریڈ کلر کے ان میں بھی ٹیکے لگا دیتے ہیں لوگ
مانگتے ہیں سوپ جب نوخیز چوزوں کا نیاز
مردہ کوؤں کی ہمیں یخنی پلا دیتے ہیں لوگ

موصوف نے درج بالا اشعار میں طنزیہ انداز میں ملاوٹ کے مروجہ تمام طریقوں سے پردہ اٹھایا ہے، جس سے معاشرے کی موجودہ صورت حال کی صحیح عکاسی ہوتی نظر آتی ہے۔ ●●●

www.urdugem.com

زرقا فاطمہ

مردم گزیدہ

ایک ایسے گھرانے کی کہانی...... جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی، جس کے کرداروں میں آپ گم ہو جائیں گے، اور بلال... ہاں وہی تو ساحر تھا

وہ ماضی کو یاد کرنے والی عورت نہیں تھی۔ نہ کبھی یادوں کے ہاتھوں اس نے قدم قدم پہ ٹھوکر کھائی تھی۔

آتی گرمیوں کی اس دوپہر جب بارش اچانک برس گئی۔ قدیم حویلیوں کے پچھواڑے بنے تالابوں کو چھوآنے سے ہواہیں نمی اور ٹھنڈک بسنے لگی تو وہ ہوا کے پیچھے بالکنی میں چلی آئی۔ گلی کے کونے پر نیم کے سفید اور جامنی پھول سڑک کے دوسری طرف امتیاز بھائی کے سیاہ گیٹ کے سامنے آخری سیڑھی کے پاس ڈھیریوں کی صورت پڑے تھے۔

اِس گھر میں وہ کئی سال رہی تھی۔ کمال، پنکی اور بلال اِسی گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ گھر وہی تھا، انسان بھی وہی تھے مگر پھر بھی کتنا کچھ بدل گیا تھا۔

وہ اندر آ گئی۔ چھوٹا سا یہ کمرہ بیٹھک کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ شازیہ نے خود کو صوفے پہ گرا دیا۔ صوفے پہ تو محض

اُس کا وجود تھا، وہ خود کہیں اور ہی گم تھی۔ سامنے بلال کے کمرے میں میز پہ کتابوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ گھنٹوں سر جھکائے اُن میں گم رہتا۔

کون کہہ سکتا تھا کہ ناروا حالات میں پلنے والا بھولا سا یہ بچہ، اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگے گا۔ کل شام وہ کتابیں لیے بیٹھا تھا۔ شازیہ الماری میں کپڑے رکھ کر اس کے پاس رُک گئی۔

''کیا پڑھتے رہتے ہو؟''

''کتابیں۔ امتحان ہونے والے ہیں''۔

''اچھے نمبر آ گئے تو نوکری لگ جائے گی نا بلو؟''

''شاید لگ جائے''۔

''پھر کیا کرو گے؟'' وہ پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی''۔

''کیا کروں گا؟ پتا نہیں۔'' ''دِل چاہتا ہے یہاں سے چلا جاؤں''۔ ''مگر پھر سوچتا ہوں۔ جاؤں گا کہاں؟ جگہ بدل جائے گی، میں تو وہی رہوں گا''۔

''تجھے کیا ہے؟ جو بدلنا ہے۔'' کتاب کے صفحے پلٹتی وہ چڑ گئی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' کاغذ پر لکیریں کھینچتا وہ خاموش ہو گیا۔

صفحے پلٹتی وہ کتاب پہ بنی تصویریں دیکھتی رہی۔ پھر ایک صفحے پہ اُس کی نظریں رُک گئیں۔

یہ بُت کس کا ہے بلو؟ بلال نے آگے جھک کر کتاب پہ دیکھا۔

''یہ... یہ سدارتھ ہے۔'' بیٹا کپل وستو کے راجا شدون کا۔ اِس کے باپ کے محل میں ہزار داسیاں تھیں جو سدھارتھ کے آگے پیچھے گھومتی تھیں تاکہ اُس کا دِل لگا رہے۔ اُس کی آنکھیں جو کچھ ڈھونڈتی رہتیں تھیں کہیں اور نہ دیکھیں۔ مگر... پھر بھی ایک آواز جو کہیں اندر سے آتی تھی اُسے بے چین رکھتی اور اُس کی نیند ٹوٹ جاتی۔ محل، داسیاں، عیش و آرام، شودھرا۔ کچھ بھی اِس آواز کو روک نہ پاتا۔ پھر ایک رات رانی کو سوتا چھوڑ کر وہ محل سے چلا گیا۔''

''کہاں چلا گیا؟'' وہ ہراساں سی ہو گئی۔

''ایک بڑی حقیقت کی تلاش میں۔ جیسے نانا اذان کی آواز سُن کر سارے کام چھوڑ مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں۔ یہ بھی ایک راستہ ہے امی، اور دُنیا اِس راستے میں نہیں آتی۔''

''بلو''، ڈرتے ڈرتے شازیہ نے اُس کے بال چھوئے۔

''تو بڑا افسر بن جائے گا تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ کہیں اور...... پر ایسی باتیں نہ کیا کر۔'' بالوں کو چھوتے ہاتھ کی اُنگلیاں سمٹ گئیں۔

''یہ کیوں اُداس رہتا ہے؟ شاید اِسے یہ دُکھ ہے کہ وہ ''میرا'' بیٹا ہے!'' اس نے سوچا۔

ابا کے گھر میں کیسا سکون تھا۔ وہ تینوں بہنیں بڑی تھیں، دو چھوٹے بھائی تھے۔ چھوٹے سے صحن میں لگی دھریک کے نیچے ابا کی سائیکل کھڑی رہتی۔ ابا کو اس نے کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ مُسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے۔ ہاں جب وہ تینوں بہنیں بڑی ہو گئیں تو ان کا چہرہ ضرور کچھ متردد ہوا اور انھوں نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی۔ حالانکہ اِس سے پہلے اُنھوں نے کبھی یہ کام نہ کیا تھا۔ امی کبھی چار پیسے بڑھنے کے خیال سے تقاضا کرتیں تو وہ کہتے، عابدہ مسجد جانا ہوتا ہے۔ سکول سے آ کر گھر میں بھی سکول بنا لوں!

تینوں بیٹیوں کی شادی انھوں نے آگے پیچھے کر دی۔ بڑی آپا تایا اور چھوٹی، خالہ کے گھر بیاہ کر چلی گئیں۔ جہیز اور بری کے مسئلوں میں پڑے بغیر دونوں اپنے جیسے گھروں میں آباد ہو گئیں۔

شازیہ کا رشتہ کسی جاننے والے کی وساطت سے طے

www.urdugem.com

ہوا۔ اُن کی مالی حیثیت ماسٹر صاحب سے زیادہ تھی مگر چونکہ لڑکے کی دوسری شادی تھی اور وہ لوگ جہیز نہیں چاہتے تھے اِس لیے انھوں نے ہاں کردی۔ عابدہ نے البتہ فکرمندی کا اظہار کیا۔ شریف خاندان ہے۔ دور پار کی رشتہ داری ہے۔ ماسٹر صاحب کی شرافت نے لڑکے کا چال چلن دریافت کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ شادی کے بعد وہ جس گھر میں آئی وہاں ساس، جیٹھ، جیٹھانی اور شوہر کے دو چھوٹے بچے بستے تھے۔

شازیہ بھرے پُرے گھر سے آئی تھی۔ سب کے ساتھ اُس کا دِل لگ گیا۔ ابا کے گھر میں دروازے پر بھی کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی مگر اب نواز اکثر اُسے گھمانے لے جاتا۔ اِس بات پر وہ ضرور کڑھتی کہ نواز کے پاس سائیکل کیوں ہے۔ کم از کم موٹر سائیکل تو ہو۔ اچھے گھرانے کا فرد ہے۔ ملازمت کرتا ہے۔ پھر سائیکل کیوں؟ اُس کی کمائی کہاں صرف ہوتی ہے۔ اِس کا پتا اُسے بہت بعد میں جا کر چلا۔

بچے اُس سے مانوس ہو گئے۔ وہ بھی انھیں دل سے پیار کرتی۔ گُڈو تو اکثر اوقات اُس کے پاس ہی سو جاتا۔ سارا دن بھابھی کے ساتھ گھر کے کام نمٹاتی اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی کو یہ خیال ہی نہ آتا کہ یہ اُس کے جیٹھ کا گھر ہے اور نواز تنخواہ لا کر اُسے کیوں نہیں دیتا؟ ہاں شادی کے کوئی ایک سال بعد جب وہ اکثر دیر سے گھر آتا تو یہ ضرور اُسے بُرا لگتا مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔

ڈیڑھ سال بعد وہ بھی ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ چھوٹے بچے کے ساتھ رات کو نیند پوری نہ ہوتی۔ دِن بھی بلال کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے گزر جاتا۔ گھر کے کاموں کے لیے زیادہ وقت نہ نکال پاتی۔ بڑے دونوں بچوں کو بھی اب زیادہ تر جیٹھانی ہی سنبھالتی۔ شازیہ پر اب اُسے اکثر اعتراض رہتے۔ ایک دن جب بے جی دھوپ میں بیٹھی کنگھی کر رہی تھیں بھابھی بلال کو گود میں لے کر آ گئی۔

"نواز کے بچے کی وجہ سے باورچی خانے کا کام اور خرچا بڑھ گیا ہے بے جی۔ صاحب اولاد ہو گیا ہے۔ بہتر ہے اب اپنے خرچے خود اٹھائے۔"

بے جی بڑھاپے کی عمر میں خود بہو کی محتاج تھیں سو چپ چاپ اُس کی بات مان لی۔ کمرے کے ساتھ برآمدے میں تھوڑی سی جگہ فالتو تھی۔ گھر میں پڑا ایک چولہا رکھ کر شازیہ کو باورچی خانہ بنا دیا۔ کچھ چیزیں امی نے دے دیں، کچھ پیسے بے جی نے دیے۔ وہ اپنا کھانا الگ پکانے لگی۔

پہلے نواز جو بھی پکڑا دیتا، چپ کر کے رکھ لیتی۔ اب بچے اور کچن کے خرچے کے لیے پیسے چاہیے ہوتے۔ ضروریات کم تھیں۔ جوتے کپڑے ابھی تک شادی کے ہی استعمال ہو رہے تھے۔ ہفتے دس دن بعد جو بھی دے دیتا وہ جیسے تیسے گزارہ کر لیتی۔ دوسری بیٹی کی پیدائش کے بعد خرچے بڑھ گئے۔ دودھ والے کا بل ہو یا ڈاکٹر کی فیس، نواز کو پیسے دینے ناگوار گزرتے۔ گھر کے خرچے کے لیے مختصر سی رقم دے کر وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ بھابھی اور بہن کی اُترن پہن کر وہ گزارہ کرتی۔ بھائیوں کی شادی کے بعد ابا کے خرچے بھی بڑھ گئے۔ وہ بھی کتنی مدد کر سکتے تھے۔ عید شب برات پہ جو پیسے ملتے اُس سے اپنے اور بچوں کے لیے کچھ خرید لیتی۔ امتیاز بھائی لعن طعن کرتے تو نواز گھر کا کچھ سودا سلف لا دیتا۔ کبھی کبھار وہ کچھ پیسے دے دیتے۔

☆☆☆

کھانا پکانے باورچی خانے میں آئی تو دیکھا نمک ختم تھا۔ بھابھی سے نمک لینے آئی۔ ابھی برآمدے کے دروازے کے پاس ہی تھی کہ امتیاز بھائی کو بے جی کے پاس بیٹھے دیکھ کر جھجک کر پیچھے مڑی پھر اپنا نام سُن کے رُک گئی۔

"بیوی بچے اُس کی ذمہ داری ہیں۔ اپنے خرچے خود

اُٹھائے۔ میں کب تک اِن کی ضروریات پوری کروں گا۔ میرے اپنے بھی بچے ہیں بے جی"۔ امتیاز بول رہا تھا۔

"شادی تو ہم نے اسی لیے کی تھی امتیاز کہ گھر میں بیوی آ جائے گی تو آوارہ پھرنے سے باز آ جائے گا۔ چھوڑ دے گا بُری عادتیں۔ کالج کے راستوں، سنیما گھروں کے چکر چھٹ جائیں گے"۔ "مگر..." بے جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

شازیہ سے اور کھڑا نہ رہا گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر لوہے کی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں بچے، اپنا وجود اور دُنیا میں تین مہینے بعد آنے والا بچہ فالتو لگنے لگا۔ کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہوئے بھی اُنھوں نے غریب گھرانے میں رشتہ کیوں کیا، یہ اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ سر بازار جیسے اچانک کسی نے سر سے چادر کھینچ لی۔ ککلی ڈالتے ساتھی کا ہاتھ ایک دم ہاتھ سے چھوٹ کر اُسے ڈگمگا گیا۔ دیر سے آنے کی یہ وجوہ ہوں گی، یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

یہ دُکھ شاید اُسے بیمار کر ڈالتا اگر امی اُسے زچگی کے لیے لینے نہ آ جاتیں۔ ابا بے جی کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر اٹھ کر اُس کے پاس آئے۔ اُس کے اُترے ہوئے چہرے پہ نظر پڑی تو یہی سوچا، بات نہ ہی کریں لیکن پھر دِل بڑا کر کے اُنھوں نے شازیہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے:

"اپنا بری کا زیور جانے سے پہلے بے جی کو دے جانا"۔

"شازیہ کو کلائی میں پڑی چار چوڑیاں بہت عزیز تھیں"۔

"کیوں ابا؟" اس نے پوچھا۔

"کہاں سنبھالتے پھریں گے ہم"۔ وہ نظریں چُرا گئے۔

اُس کے گھر آنے سے سب خوش ہو گئے تھے۔ امی نے اُس کی پسند کا کھانا پکایا۔ اتنی اپنائیت میں وہ اپنے کئی دُکھ بھول گئی۔ رات سونے سے پہلے ابا اُس کے پاس آ بیٹھے اور کہنے لگے:

"بیٹا اپنا گھر بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ نواز کب تک امتیاز کے گھر بیوی بچوں کے لے کر پڑا رہے گا۔ آج تمہاری ساس سے بات کی تھی۔ کچھ کریں گی گھر کے لیے۔ اللہ نے چاہا تو جلدی تیرا گھر بن جائے گا۔ زیور تو کبھی بھی بن سکتے ہیں نا۔

جب سے اُس کے اپنے بچے ہوئے تھے اور وہ بھابھی کے ساتھ گھر کے کام نہ کر پاتی تھی تب سے بھابھی کا رویہ اُس سے اچھا نہ رہا تھا۔ گھر ایک تھا۔ چلتے پھرتے کبھی اُس کے پاس جاتی تو وہ بیٹھنے کو بھی نہ کہتی۔ شازیہ کی حیثیت اُس جیسی نہ تھی مگر دِل اور عزت تو ویسی ہی تھی۔ دُکھی اور شرمندہ ہو کر واپس آ جاتی۔ اپنے گھر کا سُن کر اُسے زیور کا غم بھول گیا۔

گھر بننے میں ڈیڑھ سال لگا۔ بے جی نے کچھ پیسے اپنے پاس سے ڈالے کچھ دوسرے بچوں سے تین چار سال تک زمین کا حصّہ ٹھیکہ چھوڑنے کی بات کی۔ مل ملا کے امتیاز کے گھر کے سامنے نواز کے گھر کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا۔

"اُس میں تو اتنے گُن نہیں، تُم اُس کے بچوں کی سرپرستی کرتے رہنا۔ وہ اپنے ہی بچے ہیں امتیاز، اُن کا خیال رکھنا۔ خبر لیتے رہنا جب تک پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پہ کھڑے نہ ہو جائیں۔" بے جی کے دِل کو یقین تو نہ تھا مگر وہ پھر بھی امتیاز سے گزارش کرتی رہتیں۔

رہنے کے قابل گھر بنا تو سب سے زیادہ شُکر کا کلمہ بھابھی نے پڑھا۔ شازیہ تین بچوں کو لے کر کچے صحن والے گھر میں منتقل ہو گئی۔ اتنے سال ساتھ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھلایا تھا۔ دُکھی ہوتی تھی، غُصہ بھی آتا مگر نفرت نہ ہوتی تھی۔ وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔

گھر کے کام نمٹا کر گود کے بچے کو لے کر بھابھی کی طرف چلی جاتی۔ وہ غیروں سے بھی بدتر سلوک کرتی تو آہستہ آہستہ آنا جانا کم ہوتا گیا۔ بچے تایا کے بچوں کے

www.urdugem.com

ساتھ پلے تھے۔ پہلے پہل شوق سے تایا کے گھر گئے۔ پزیرائی نہ ملی تو بے چارے اُداس ہو گئے۔ پہلے اپنے گھر میں کھیلتے رہتے پھر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ ایک دن دادی جا کر ساتھ والی گلی کے سکول میں بڑے دونوں بچوں کے نام لکھوا آئی۔

جب تک امتیاز بھائی کے گھر میں رہتا تھا نواز کو تھوڑی بہت جھجک اور شرم تھی۔ امتیاز آتے جاتے سمجھاتا بھی، ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا۔ جب پوچھنے والا کوئی نہ رہا تو وہ اور بھی آزاد ہو گیا۔ شازیہ گھر کے خرچے سے مزید تنگ رہنے لگی۔ کچھ اب پہلے سا تعلق بھی نہ رہا تھا۔ جن باتوں کو پہلے جھٹلاتا تھا انھیں اب ڈھٹائی سے تسلیم کر لیتا۔

''نہ کوئی لباس سنہ انداز، بچوں کا ڈھیر ارد گرد لگائے دھوبن بنی بیٹھی رہتی ہو۔ کبھی دوسری عورتیں دیکھی ہیں؟ چہکتی مہکتی۔ کیسے نازانداز سے چلتی ہیں''۔

نواز کے الفاظ اُس کی کنپٹیاں سلگا جاتے۔ لگتا جیسے مُنہ پر کوئی تھپڑ مار رہا ہو۔ اپنے پانچ بچے بھی بُرے لگنے لگتے۔

خرچے پانی پہ لڑائی جھگڑا ہوتا۔ دیر سے گھر آنے پہ تُو تکار بھی ہو جاتی مگر جب تک اُس نے یوں کھلی بے حیائی کی باتیں شروع نہیں کی تھیں، اُس کے گھر آنے پہ وہ سچ سنور بھی جاتی تھی۔ لڑائی جھگڑا بھی کرتی۔ کھانا کپڑے بھی دیتی۔ اب ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی۔ اندر سے جیسے کسی نے پاؤں باندھ دیے۔

آوارہ گردی نواز کر کے آتا، شرمندہ وہ رہتی۔ گھر کے کام کاج کر کے آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ دراز کھول کر لپ اسٹک نکالتی پھر واپس رکھ دیتی۔ تازہ ہوا کا روزن نواز کی باتوں اور حرکتوں نے بند کر دیا تھا۔ اندر کا حبس بڑھنے لگا۔ بچے بے چارے مار پیٹ کے عادی ہو گئے۔ سکول سے آ کے جیسا تیسا ہوم ورک کرتے پھر گلی میں کھیلنے نکل جاتے۔ اُن کے لیے خوشی کا وقت وہ ہوتا جب کبھی باپ شام کو جلد آ جاتا۔ خرچنے کے لیے تب کچھ پیسے مل جاتے اور وہ باپ کے ساتھ دُکان پر چلے جاتے۔

اب وہ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نہیں پانچ بچوں کی ماں تھی۔ نواز کے گھر والوں نے جو شادی نواز کو سدھارنے کے لیے کی تھی۔ اُس کا سارا بوجھ شازیہ پر آ گیا تھا۔ بچوں کو سکول بھجوا کر صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر وہ دیر تک سوچوں میں گم رہتی۔ کبھی دوسروں کی خود غرضی رُلاتی، کبھی بے حسی اور لاتعلقی پہ دِل کُڑھتا۔ کئی طرح کے بہی کھاتے اُس کے اندر کھُلنے لگے۔

دُکانوں بازاروں کے چکر لگانے میں کوئی ساتھ کی ہمسائی بھی کچھ لانے کو کہتی تو وہ لا دیتی۔ یوں محلے میں کچھ آنا جانا بھی بن گیا۔ امتیاز بھائی کو اپنی بیوی سے ساری رپورٹ مل جاتی تھی۔ بے جی کی وفات کے بعد اُن کا آنا جانا ویسے ہی کافی کم ہو چکا تھا۔

اُس دِن امتیاز بھائی شام کے قریب آئے تو شازیہ ہانڈی چڑھانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھی۔ بچوں کی خیر خیریت پوچھ کر چارپائی پہ بیٹھ گئے۔

''عورتوں کا دُکانوں پہ پھرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ سارا دِن بازاروں کے چکر کیوں لگاتی رہتی ہو''۔ اُنھوں نے شازیہ سے پوچھا۔

''گھر کا سودا سلف لانا ہوتا ہے۔ نواز تو رات گئے آتا ہے اور اگر کھانا نہ پکا ہو تو فساد ڈال دیتا ہے''۔ شازیہ نے بتایا۔

''دوسرے لوگوں کے سودے کیوں ڈھوتی ہو؟ ہم عزت دار لوگ ہیں''۔

شازیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ یہ ہی پوچھا کہ میں بھی تو آپ کے گھر کی عزت ہوں۔ امتیاز جو کچھ کہتا رہا وہ سنتی رہی۔ جب وہ اُس کے سامنے کھڑی ہوئی اُس وقت تک بہت کچھ سہہ چُکی تھی۔ دادی کی زندگی تک تو شازیہ

پرائیویٹ سکولوں کے خرچے اُٹھا لیتی تھی۔ اب جتنے پیسے نواز دیتا تھا، اُس میں پانچ بچوں کی فیسیں دے کر گھر چلانا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ پرائیویٹ سکولوں میں بھی پڑھائی کی حالت خراب تھی۔

''میں سوچ رہی ہوں اِن کو سکول بھیجوں ہی نا''۔ ابا کو بتاتے ہوئے شازیہ روہانسی ہو گئی۔

''گھر بٹھانے سے بہتر ہے، سرکاری سکولوں میں بچوں کو ڈال دے''۔ ابا نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ کمال، بلال اور نوید کا داخلہ محلے کے سرکاری سکول میں کروا بھی دیا۔ پنکی اور ببلی بھی گورنمنٹ سکول میں جانے لگیں۔

نواز صبح کا گیا رات کو گھر آتا۔ بچوں اور گھر کے بکھیڑے شازیہ کو تھکا دیتے۔ کمال کا دِل سکول میں نہ لگتا۔ آئے دن گھر بھاگ آتا۔ اُسے سکول چھوڑنے لانے کے دوران اُس کی ملاقات ماسٹر نثار سے ہو گئی۔ شازیہ کی بات اُس نے بڑی ہمدردی سے سُنی۔ بلال بچپن سے پڑھائی میں اچھا تھا۔ اُس کا وظیفہ لگوا دیا۔ شازیہ اُس کی زیرِ احسان ہو گئی۔ پہلے پہل بات صرف بچوں تک ہی رہی پھر وہ اُس کی خیر خیریت بھی پوچھنے لگا۔ اُس کی باتوں سے ڈھارس ملنے لگی۔ بڑے عرصے بعد اُس کی ذات کو کسی سے سہارا ملا۔ دھنکاری ہوئی، ٹھکرائی ہوئی عورت کو ہمدردی اچھی لگنے لگی۔

پہلے ہر دن اِس آس میں گزرتا تھا کہ شاید نواز لوٹ آئے۔ اُس کا اور بچوں کا خیال رکھے۔ اُس کا گھر بھی دوسروں جیسا ہو۔ مگر جب سے نثار نے دُکھ سُکھ سننے شروع کیے۔ اُسے نواز کی پروا نہ رہی۔ سکول سے واپسی پر کبھی کبھار وہ تینوں لڑکوں کو اپنی موٹر سائیکل پر ساتھ لے آتا۔ کبھی چائے کا کپ یا پانی کا گلاس پینے کے لیے رُک جاتا۔

چھٹی والے دن امتیاز نے نواز کو بُلا لیا۔ واپس آیا تو غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

''یہ ماسٹر یہاں کیا لینے آتا ہے؟'' اُس نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

''اُس کے گھر کا راستہ ہے۔ کبھی کبھار جاتے ہوئے لڑکوں کو چھوڑ دیتا ہے''۔ شازیہ نے اطمینان سے کہا۔

''کیوں؟'' نواز نے اُسے بالوں سے آ پکڑا۔

''اِس بات کا تو تمھیں زیادہ پتا ہو گا''۔ بغیر جھجکے اُس نے نواز کی آنکھوں میں جھانکا۔ شازیہ کو بھی آئے روز کے دھکوں ٹھڈوں نے نڈر کر دیا تھا۔ اس شام مار پیٹ میں بچوں کو بھی چوٹیں لگیں۔ کمال بھاگ کر اپنے تایا کو بُلا لایا۔ وہ نواز کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے گئے۔ شازیہ کے جسم کو چوٹوں نے تکلیف تو دی مگر وہ یہ سوچ کر خوش بھی ہوتی رہی کہ اُس کی وجہ سے نواز کو بھی درد ہوتا تھا۔ کہیں چوٹ لگتی تھی۔

''تم اب گھر سے نہیں نکلو گی''۔ غصے سے تلملاتے نواز نے اعلان کیا۔

''شوگھر کی ضرورتیں دیکھ اور بچوں کے کام سنبھال۔ میں کیوں نکلوں گی''۔ بدلحاظی سے جواب دے کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

گالی گلوچ مار پیٹ بڑھتی گئی مگر برسوں کی عادتیں سنہ چھٹ سکیں۔ شازیہ بھی ہمدردی کا کھُلا روزن بند نہ کر پائی۔ عدم توجہ اور شفقت و پیار سے محروم بچے اپنی اپنی راہ پہ چل نکلے۔

''محلے میں بدنامی ہوتی ہے۔ میں تیری گردن اُتار دوں گا''۔ طیش میں بھرا امتیاز اُس کے سر پہ آ کھڑا ہوا۔ کپڑے دھو دھو کر اُس دن شازیہ کی کمر تختہ ہو رہی تھی۔ وہ لیٹی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔

''بھائی کی آوارگی چھڑوا کر گھر کا راستہ دکھا۔ اُس کی گردن اُتار، میں اپنی گردن خود حاضر کر دوں گی۔ یہ تیرے خاندان کے بچے ہیں۔ اُڑے رنگوں کے کپڑے پہنے۔ کیوں نہیں اُٹھاتا اِن کی ذمہ داری؟ کر فگران کے سکول کی فیسوں کی، لانے لے جانے کی۔ پہلے فرض نبھا پھر گالیاں دینے آ

www.urdugem.com

جانا۔'' وہ اب پہلے والی شازیہ نہ رہی تھی۔ امتیاز نے غصے سے ہاتھ اُٹھایا۔ بھابھی نے جلدی سے ہاتھ پکڑ لیا۔ لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔ چلیں گھر۔ وہ اُسے بازو سے گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔

☆☆☆

غلطی نواز کی تھی یا گاڑی والے کی۔ ٹکر مارنے کے بعد وہ رُکا نہیں، گاڑی بھگا لے گیا۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے نواز کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ آخر کار تین دن بے ہوش رہنے کے بعد وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ پانچ بچوں کے سر پر کمانے والا نہ رہا تھا۔ اِس وقت شازیہ کو واقعی سہارے کی ضرورت تھی۔ شروع کے چند مہینے بچوں کی پھوپھیاں اور تایا کبھی کبھار آجاتے۔ کچھ پیسے بھی پکڑا جاتے مگر رفتہ رفتہ صرف پینشن کا آسرا رہ گیا۔

ابا نے کہہ سُن کر اُس کی زمین اُسے لے دی اور جا کر مزارع کو بٹائی کی خاطر دے آئے مگر کمال نے ساجھے داری کی ذمہ داری نبھانے کے بجائے اگلے سال زمین ٹھیکے پر دے دی۔ ''شازیہ ٹھیکہ جائز نہیں ہوتا۔'' ابا نے دبے لفظوں میں سمجھایا بھی، مگر اُس کی زندگی میں تو اور بھی بہت کچھ تھا جو جائز نہیں تھا۔

نواز کے مرنے کے بعد نثار جیسے اُس گھر کا فرد بن گیا۔ پنکی اور بلی کی عادتیں کچھ سرکاری سکولوں کی فیشن زدہ لڑکیوں کے ساتھ رہ کر بگڑی تھیں، کچھ گھر کے ماحول نے خراب کر دیں۔ نثار کے ساتھ آنے والے اُس کے دوستوں نے بلی کو تحفے تحائف کی لت لگا دی۔ خاندان والے ویسے ہی آنا جانا چھوڑ چکے تھے۔ نہ کسی نے ذمہ داری اُٹھائی نہ کہیں صلہ رحمی کا نام و نشان تھا۔ کمال نے پڑھائی چھوڑ دی اور ورکشاپ جانے لگا۔ پیسے تو کیا کماتا، آوارہ دوستوں کی صحبت میں سارا دِن گزار دیتا۔

بلی کی دیکھا دیکھی پنکی نے بھی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ بلی نے ایک پیسے والا ٹھیکے دار پھنسا کر دو تین مہینے میں شادی کی اور اپنا ضروری سامان لے کر چلی گئی۔

بلال دو تین دِن کتابوں میں مُنہ دیے بیٹھا رہا۔ شازیہ دوپٹے سے سر باندھے بلڈ پریشر کی گولیاں پھانکتی رہی۔ روبی کو پاس سے نہ اُٹھنے دیتی۔ بلال دروازے تک آتا پھر واپس لوٹ جاتا۔ چند دِنوں میں اُس نے ایک مل میں نوکری کر لی۔ ایف اے کا امتحان دے کر وہ فارغ تھا۔ چھٹی والے دِن بیچ کس اور پلاس پکڑے بجلی کے بورڈ اور دروازوں کی کنڈیاں ٹھیک کرتا رہتا۔ شازیہ سودا لینے جانے لگتی تو ہاتھ سے تھیلا پکڑ لیتا۔

''پڑھائی چھوڑ دے گا کیا؟'' شازیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''مل میں کام تو سیکنڈ شفٹ میں کروں گا۔'' کتاب سے نظریں اُٹھائے بغیر اُس نے جواب دیا۔

آٹھویں میں کم نمبر آنے کا سب سے زیادہ افسوس بلال کو ہی ہوا۔ ابا کب کے آنا جانا چھوڑ چکے تھے۔ ایک شام مل سے واپسی پہ بلال کے ساتھ ابا کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ شازیہ سب لوگوں کی خیریت پوچھتی رہی پھر چائے بنانے چلی گئی۔

''نوید کو میں ساتھ لے جاؤں؟'' اُنھوں نے پوچھا۔

شازیہ اُلجھی گئی ''ریٹائرمنٹ کے بعد..... چائے کا گھونٹ بھر کے وہ رُکے، ارادہ تھا مسجد کی امامت سنبھال لوں گا مگر اب خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ اِسے اپنے والے سکول میں داخل کروا دوں گا۔ فارغ ہی ہوتا ہوں۔ میٹرک کی تیاری کروا دوں گا۔ پڑھنے والا بچہ ہے شاید کچھ بن جائے۔''

ابا کی سادہ لہجے میں کہی بات اُسے طمانچے کی طرح لگی۔ نوید اپنی کتابیں اور سامان لے کر ابا کے ساتھ چلا گیا۔ بلال کا دِن کتابیں پڑھتے گزر جاتا۔ پنکی پارلر چلی جاتی۔

''میں خود کا پارلر کھولوں گی دیکھنا''۔ پنکی غصے میں تھی۔

''بس کر پنکی! اُس کا پارلر چھوڑ کر تیرے پاس کون آئے گا۔'' شازیہ سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

''کون نہیں آئے گا؟ سارے لوگ میرے ہی پارلر میں آئیں گے۔ تیرے سے زیادہ لوگوں کو پھنسانا نہیں آتا اُسے۔'' پنکی تنک کر بولی۔

لڑنے کی آوازوں سے دوسرے کمرے میں سوئے بلال کی آنکھ کھل گئی۔ پنکی کی بغیر کسی لحاظ کے کہی بات سے وہ سُن سا ہو گیا۔ پارلر والی سے لڑائی کے بعد پنکی گھر پہ ہی ہوتی۔ سارا دِن وہ شازیہ کی شامت بُلائے رکھتی۔ پارلر کھولنے کے لیے پیسوں کا مطالبہ کرتی رہتی۔ مل سے واپسی پر وہ روز پنکی کے لیے کچھ چھوٹی موٹی چیز لے کر آتا۔ کبھی برگر کبھی سٹہ۔ وہ کبھی کھا لیتی کبھی اِدھر اُدھر پھینک دیتی۔ جانے کس مٹی کا بنا ہے۔ شازیہ سوچتی۔ مسائل کے انبار سے اکثر سر میں درد رہتا۔ رات اُس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ صبح اُٹھی تو ناشتا بنانے کا خیال آیا۔ کچن میں آئی تو وہ چولہے کے پاس کھڑا انڈے پھینٹ رہا تھا۔ آہٹ پر اُس نے مڑ کر دیکھا۔

''سر کا درد کم ہوا امی''۔ شازیہ کے آنسو بہ نکلے۔ وہ پیالہ رکھ کے اُس کے قریب آ گیا۔

''روئیں نہیں ٹھیک ہو جائے گا سب۔'' بلال نے تسلی دی۔

وہ وہیں موڑھے پہ بیٹھ گئی۔ اپنا اور اُس کا ناشتہ بنا کے چھوٹی سی میز پر رکھے وہ اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

''امی ماموں شفیق بہت اچھے ہیں۔ ہمیشہ ہمارے خیر خواہ رہے۔ مولوی صاحب جمعہ کے خطبہ میں بتا رہے تھے۔ جن گھروں میں اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ وہ آسمان سے زمین پر یوں چمکتے نظر آتے ہیں جیسے زمین سے ہمیں ستارے نظر آتے ہیں۔ نانا کا گھر بھی انھی گھروں میں سے ایک ہوگا۔ وہ ناشتا کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''سعد کی پڑھائی مکمل ہو گئی ہے۔ نوکری بھی مل جائے گی۔ تم پنکی کی شادی اُس سے کر دو۔ کہیں بلی کی طرح...'' وہ چُپ ہو گیا۔

''تو نہ سوچا کر اس بدبخت کے لیے۔'' شازیہ اُس کے ذکر سے چڑی ہوئی تھی۔

''جن سے پیار کرنا نہ چھوڑا جا سکے۔ ان کے لیے سوچنا کیسے چھوڑا جائے امی؟'' بلال نے جیسے ماں کو سمجھایا۔

''وہ سُنتی ہے تیری بات؟ طور طریقے دیکھے ہیں اُس کے!''۔ شازیہ رنجیدہ ہوئی۔

''اُس کا قصور نہیں۔ اس کی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی ہے۔'' بلال کہنے کو تو کہہ گیا مگر نہیں جانتا تھا کہ شفاف آئینے میں داغوں بھرے چہرے کو دیکھنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔

''میرا ہی قصور ہے نا سارا، تو پھر جا چھوڑ دے مجھے۔ کیوں بیٹھا ہے میرے پاس؟''۔ شازیہ بلبلا اُٹھی۔ احساس جرم سے چہرہ بگڑ گیا۔ چائے کا کپ میز پر پٹخ کر وہ اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ بلال نے جھانک کر دیکھا وہ دراز میں سے اپنی دوائیاں نکال رہی تھی۔ گلاس میں پانی لیے وہ اُس کے پاس چلا آیا۔ گولیاں پھانک کر وہ پلنگ پہ مُنہ ڈھک کر پڑ گئی۔

''بارشیں نہ ہوں تو زمین سے دھول اُڑنے لگتی ہے۔ ایسی آندھیاں چلتی ہیں کہ دور نزدیک کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈوبتا انسان سہارے کے لیے سانپ کو بھی پکڑ لیتا ہے''۔ نوٹس بناتے وہ نجانے کیا کچھ سوچتا رہا۔ نوید نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے ایک عرصے بعد شازیہ کے ذہن کو سکون ملا۔ بلال کے لیے بھی دل سے دُعائیں نکلیں۔ ابا نے نوید کو واپس بھجوانے کے بجائے اپنے پاس ہی کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ نوید کے نانا کے گھر چلے جانے سے ماموں کا بھی آنا جانا

www.urdugem.com

بڑھ گیا تھا۔ اکثر نوید کے ساتھ وہ بھی چلے آتے۔ شروع میں پنکی نے ان کے آنے کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا پھر بلال، شازیہ ماموں اور نوید کو اکٹھے بیٹھے دیکھتی تو پاس آ بیٹھتی۔ جہاں ہر وقت ایک دوسرے سے بے زاری اور لڑائی کا ماحول بنا رہتا تھا، وہاں ایسی تبدیلی اُس کے دِل کو اچھی لگتی۔ کمال سے شُو پکار بھی کم ہوتی۔ جب سے شازیہ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اُس نے اپنے پارلر کا مطالبہ کم کر دیا تھا۔ ایک دن بلال کے ساتھ اُس کا ایک دوست خاور بھی آیا۔ پنکی نے بتایا امی کی تیمارداری کے لیے آیا ہے۔ پھر وہ اکثر ہی آنے لگا۔ شازیہ اور پنکی کے پاس جا بیٹھتا۔ نہ جانے کدھر کدھر کی باتیں کرتا۔ شازیہ سُننا نہ چاہتی، غصہ بھی آتا مگر وہ بات ہی ایسے کرتا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جواب دے دیتی۔ بلو بتاتا وہ اُس سے دو سال آگے ہے۔ ایم فل نفسیات کر رہا ہے۔

پتا نہیں اُسے کیا کیا خوبیاں کہاں کہاں سے نظر آجاتیں۔ تھوڑی دیر کو تو اُسے لگتا جیسے اُس سے اور پنکی سے بھلا کوئی ہے ہی نہیں۔ پنکی کی بدتمیزی کے جواب میں وہ خاموش بیٹھا رہتا۔ پھر بڑی آہستگی سے پوچھتا۔ ”آپ کو کس چیز کا غصہ ہے؟“

”زندگی میں ٹوٹ پھوٹ تو ہوتی رہتی ہے۔ سب کی ہوتی ہے مگر خود کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ اپنے آپ کو قیمتی سمجھنے والا انسان خود کو بچاتا رہتا ہے۔ اپنی مرہم پٹی کرتا رہتا ہے۔

سب سے بڑی دوا ’سجدہ‘ ہے ’دُعا‘ ہے۔“

شازیہ اُس کے چہرے کو غور سے دیکھتی۔ وہ اُسے کیا سمجھ رہا ہے؟ مگر وہاں تو عزت ہی عزت ہوتی۔ اُس کے جانے کے بعد بھی سوچتی رہتی۔ اِسے کیسے پتا کہ محبت اور توجہ نہ ملے تو احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ خود نمائی کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ بلو کہتا ہے یہ اسی طرح کی پڑھائی پڑھتا ہے۔ پتا نہیں یہ کیسا انسان کو اندر سے پڑھنے والا علم ہے۔ خاور کے جانے کے بعد اُس کی ٹٹولتی ہوئی باتوں سے کبھی کوئی احساس بڑھتا، تو کبھی کوئی تکلیف رفع ہو جاتی۔ پنکی بھی اُس کی باتیں کسی اپنے کی طرح سُن لیتی۔

عرصے بعد ننھیال سے تعلق بحال ہونے کی وجہ سے بچوں کو تو جو خوشی ملی سو الگ، شازیہ کو بھی لگنے لگا کہ دُنیا میں اُسے بھی چاہنے پوچھنے والے کچھ لوگ موجود ہیں۔ شازیہ کی نرمی اور محبت کو محرومی اور تلخی کی آندھی ڈھانپ دیتی تھی۔ نانی کے گھر آ کے پنکی نے پہلی دفعہ محبت کا نرم گرم ماحول دیکھا تھا۔ امارت نہیں تھی مگر سکون تھا۔ رشتوں کی مضبوط ڈور میں بندھے وہ لوگ کسی بات پہ ناخوش نہیں تھے۔ اُسے اب احساس ہوتا کہ یہاں سے جا کے اُس ماحول میں امی نے کتنی تکلیف سہی ہوگی۔ بچپن میں دیکھی گئی لڑائیاں، باپ کی مار پیٹ، گالی گلوچ سب اُسے یاد آنے لگتا۔ شازیہ نے اُس کی سعد سے شادی کی بات کہی تو وہ بہت آرام سے مان گئی۔ پنکی کی شادی، نوید کے پڑھائی میں لگ جانے اور بلال کے شاندار امتحانی نتیجے کی بدولت عرصے بعد شازیہ کو اپنی زندگی میں خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ اگر ماضی میں کوئی سنبھالنے والا، فکر کرنے والا ہوتا تو زندگی اُس ذلت کی راہ پہ نہ مُڑتی۔ ببلی اور کمال اُن راستوں پہ نہ جاتے۔ شازیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتیں۔

ساری عمر بچوں سے کبھی وہ جھجکی نہ پروا کی تھی مگر اب ایک عجیب طرح کی شرمندگی رہنے لگی۔ بلال کی غیر موجودگی میں بھی موبائل بند رکھتی۔ کمال کو دیکھتی تو نواز یاد آ جاتا۔ کیسے سمجھاؤں؟ کس منہ سے شرافت کے راستے پر آنے کی بات کروں؟

دِل ڈوبتا اُبھرتا رہتا۔

جس رات کمال محلے کی لڑکی بھگا کر لایا، اُسے دِل کا پہلا

دورہ پڑا۔ رات کا جانے کونسا پہر تھا۔ اُس کی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔

”یہ کونسی جگہ ہے؟“

کیا دوسرا جہاں؟ کھڑکی کے باہر صبح کا سُرمئی اُجالا تھا۔

”ہاں شاید! کوئی بھی تو نہیں میں اکیلی ہوں“۔

کتنے بڑے بڑے پیڑ ہیں۔ کھڑکی سے باہر لان میں کھڑے پیڑوں پر اُس کی نظر پڑی۔ ملگجی صبح ابھی روشنی سے دور تھی۔ وہ پھر سے غنودگی میں چلی گئی۔ اُسے لگا کچھ سائے سے اُس پر جھکے ہوں۔

جب وہ پھر ہوش میں آئی تو مناظر تو ویسے ہی تھے مگر وقت رات کی اوّلین ساعتوں کا تھا۔ بلال پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔ پنکی پیروں کی طرف کھڑی تھی۔ نوید اور ببلی بلال کے پیچھے کھڑے تھے۔

”کمال؟.....“ استفہامیہ نظروں سے اُس نے بلال کو دیکھا۔

”وہ ٹھیک ہے۔“ آگے جھک کر اُس نے آہستگی سے ماں کو بتایا۔

ڈاکٹروں کے آنے پر پنکی کے علاوہ سب باہر چلے گئے۔ وہ کتنی دیر اُس کا معائنہ کرتے رہے۔

”فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی دورہ تھا۔ مریضہ کو آرام کرنے دیں۔ ببلی کو کچھ ہدایات دے کر وہ باہر نکل گئے۔

”کمال کو پولیس لے گئی کیا؟“ شازیہ فکرمند تھی۔

”نہیں، اُس کے کچھ دوست آ کر اُسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ شاید وہ لڑکی خود ہی اپنے گھر چلی گئی۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ ببلی کو دیکھ کر اُس نے سوال کیا۔

”بلال نے فون کیا تھا۔ تم زیادہ باتیں سنہ کرو۔ ڈاکٹروں نے منع کیا ہے۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ نیند آ جائے گی۔“ ببلی نے دھیرے سے ماں کا ہاتھ سہلایا۔

”وہ سب چلے گئے؟“

”نہیں باہر برآمدے میں ہیں۔ ابھی ماموں آئیں گے تو اُن کے ساتھ چلے جائیں گے۔ یہاں رُکنے کی اجازت نہیں“۔

”اچھا“۔ شازیہ نے آنکھیں موند لیں۔

اسپتال میں آئے تیسرا دن تھا۔ رات کے پچھلے پہر اُس کی آنکھ کھل گئی۔ بلال کُرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ بازو شازیہ کے ہاتھ کے بالکل قریب تھا۔

کیسا فرشتہ سا بچہ ہے۔ اتنا اُجلا مگر کسی دوسرے کو میلا ہونے کا احساس نہیں دِلاتا۔ شازیہ کے دِل میں پیار اُمنڈنے لگا۔ گود میں بھر کے کلیجے سے لگا لینے کو دِل چاہا۔ جیسے وہ ننھا سا بچہ ہو۔ تکیے پہ سر رکھے، آنکھیں کھولے وہ کتنی دیر اُسے دیکھتی رہی، پھر ہاتھ سے اُس کے بازو کو پیار سے چھوا۔

بلال کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں میں نیند کی لالی گھلی تھی۔ وہ سنبھل کر اُٹھ بیٹھا۔

”کچھ چاہیے؟“

”نہیں۔“ شازیہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

”کل شام تک ڈاکٹر تمہیں چھٹی دے دیں گے۔ پھر ہم گھر چلے جائیں گے“۔ شازیہ نے جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ یونہی آنکھیں کھولے پڑی رہی۔

”بلو“۔ آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔

تجھے مجھ سے نفرت تو ہوتی ہوگی۔ معاشرے میں رُسوا کر دینے کی سزا دینے کو دِل تو چاہتا ہوگا۔“

بلال نے ماں کے زرد چہرے کو دیکھا۔ تنہا تھکے وجود پر نظر ڈالی۔

”تم میری ماں ہو۔ میں... میں تم سے کیسے نفرت کر سکتا ہوں؟“ وہ بے بسی سے مسکرایا۔

”پھر بھی“... وہ جیسے کراہی۔

www.urdugem.com

"ہماری یونیورسٹی میں "مولانا عتیق" آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"زعم پارسائی سے بچنا چاہیے۔ اِس سے تو احساس گناہ اچھا۔ یہ توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ اپنے لیے بخششیں مانگنے والا شخص کسی دوسرے کے لیے جزا یا سزا کا حساب نہیں کرتا۔

اور..... حساب لینا صرف اللہ کا کام ہے"۔ بلال کی آواز رُندھ گئی۔

"میں بھی جب نماز پڑھنے لگا تو کچھ سیکھ ہی گیا۔ ان کی باتوں سے ہی اللہ نے میرے دِل میں یہ چیزیں ڈال دیں۔"

شازیہ نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"تو مجھے ابا کے گھر لے جائے گا؟" وہ مجھے آنے دیں گے اپنے گھر؟"

"انسان خود بدل جائے تو ساری دُنیا بدل جاتی ہے امی۔" بلال نے رسان سے کہا تھا۔

"تو بھی یہ باتیں میرے منہ پہ ہی کہہ رہا ہے نا۔ مجھے بیمار دیکھ کر۔ اندر سے تو تجھے مجھ پہ بہت غصہ ہوگا۔ میں ہوں بھی تو بہت بُری۔" خیال کی کسی نئی رَو نے شازیہ کو مایوس سا کر دیا۔ بلال کے ہاتھ پہ اُس کے ہاتھ کی گرفت کمزور ہوگئی۔ بلال کچھ دیر چُپ رہا۔ بیڈ پہ پڑی وہ بیمار اور نڈھال عورت اِس وقت کتنی شرمندہ اور بے بس تھی۔ پھر اُس نے خود کو جیسے سچ کہنے کے لیے تیار کیا۔ آنکھیں کہیں بہت پیچھے ماضی میں کھو گئیں۔

"ماں! بہت دفعہ میرے دِل نے مجھے تجھ سے نفرت کے لیے مجبور کیا، مگر پھر ایک غریب، بے بس عورت میری نظروں کے سامنے آ گئی۔ پانچ بچوں کے ساتھ سڑکوں پر رُلتی۔ کبھی خاوند کے ہاتھوں پٹتی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو اُس کا ہاتھ تھامتا۔ اس کشتی کا کھیون ہار ابن جاتا اور جب کوئی بنا تو وہ ویسی نہیں رہی۔ میرے دل نے درد بہت سہا۔ دُنیا کے سامنے میں شرمندہ بہت رہا امی..... مگر میں نے کبھی تجھ سے نفرت نہیں کی۔ نہ جانے کب کے رُکے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے۔ شازیہ کے ہاتھ کی گرفت دوبارہ مضبوط ہوگئی۔

"کیا ابا مجھے معاف کر دیں گے؟" اُس نے بلال سے یوں سوال کیا جیسے وہ اُس کا کوئی بڑا ہو۔

"وہ کیسے معاف نہیں کریں گے! جب اللہ کو معاف کر دینا پسند ہے۔" آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کر کے بلال نے خود کو سنبھالا اور کُرسی پہ تھوڑا سا آگے جھک کر بولا:

"معاف کیے بغیر کوئی پلٹ نہیں سکتا امی۔ اپنی طرف نہ بندوں کی طرف اور نہ ہی اللہ کی طرف"۔

شازیہ چپ لیٹی جیسے کچھ دیر سوچتی رہی۔ چہرے پہ پھیلے درد، خوف اور پشیمانی کے رنگوں میں ایک رنگ سکون کا بھی شامل ہوگیا۔ ایک زمانے سے وہ جھوٹی ہنسی ہنستی آئی تھی مگر اندر سے تنہا تھی۔ آج عرصے بعد اُسے اپنے ساتھ کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ جیسے سارے رشتے واپس مل گئے ہوں۔ بلو ٹھیک کہتا ہے۔ انسان خود بدل جائے تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔

"بلو"... وہ جھجک کے چپ ہوگئی۔

"تو فجر پڑھنے کے لیے تو اُٹھے گا نا؟ مجھے بھی اُٹھا دینا۔ ابا کے گھر سے آنے کے بعد میں نماز پڑھا کرتی تھی کچھ عرصہ..." وہ پھر چُپ ہوگئی۔

"اب تو ایک زمانہ ہوگیا۔"

وہ جو جانے کب، کس لمحے کسی پارس سے چھو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔

"تو سو جا امی! میں تجھے نماز کے لیے اُٹھا دوں گا۔" آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کے لیے سر کُرسی کی پشت سے لگا کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

cremation کا بڑھتا رجحان

مُردے جلانے والی فیکٹریاں

اُن اقوام کا تذکرہ جہاں تنگ ہوتی زمین کے سبب مُردوں نے بھی قُربانیاں دینی شروع کر دیں

انسان اس دنیا میں چار روزہ، حیاتِ مستعار کے ساتھ آتا اور اپنی زندگی کے ماہ و سال اور شب و روز پلک جھپکتے میں گزار ملکِ عدم سدھار جاتا ہے۔ تب وہ لمحات آ جاتے ہیں جب اہم ترین افراد اور بڑے بڑے کجکلاہوں کے اجسادِ خاکی کو ٹھکانے لگانے کا انتظام ہونے لگتا ہے۔ ہر قوم اور مذہب میں مُردے کی آخری رسومات کا طریقہ و عقیدہ ہمیشہ سے مختلف رہا ہے، مگر اب جہاں دنیا میں اور بہت سی غیر معمولی تبدیلیاں ظہور پزیر ہو رہی ہیں وہیں اپنے مُردوں کو اُن کے آخری سفر پر بھیجنے کے مراحل بھی مختصر اور سہل پسند بنائے جا رہے ہیں۔ دنیا ان کو کتنا قبول تی ہے یہ تو وقت بتائے گا مگر اس کے رجحانات بہر حال بڑھتے دکھائی دے رہے ہیں۔

دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے انداز سے میت کی آخری رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

اسلام اور دیگر الہامی مذاہب میں آنجہانی کو زمین میں دفنانے کا حکم ہے۔ پارسی میت کو "مینارِ خموشاں" پر رکھ دیتے

حیرت انگیز

امجد محمود چشتی

ہیں تاکہ گدھ وغیرہ کھا لیں۔ ملائیشیا کے ایک جزیرے میں مُردوں کو حنوط کر کے دور افتادہ پہاڑوں پر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنی مخصوص تقریبات پر ان مُردوں کی ممیوں کو اٹھا کر گھروں میں لاتے اور رسومات کے خاتمے پہ واپس پہاڑوں پر رکھ آتے ہیں۔

افریقا کے کچھ قبائل میت پر خوب جشن مناتے ہیں۔ ناچ کود کر آخری رسومات ادا کرتے ہیں۔ جبکہ جین، بدھ، سکھ اور ہندو ارتھی کو شمشان گھاٹ لا کر آگ میں جلا دیتے ہیں۔ تاہم جنوبی ہند میں کچھ ہندوؤں کے ہاں دفنانے کا رواج ہے۔ بھارت اور نیپال کے ہندو کھلی فضا میں دریاؤں اور نہروں کے کناروں پہ بنے مرکز پر لکڑیوں کے ڈھیر پر تیل ڈال کر لاش جلاتے ہیں۔ آگ میت کا بڑا بیٹا لگاتا ہے اور میت کی راکھ کو بھی اولاد دریائے گنگا میں بہا دیتی ہے۔

بعض ہندو یہ راکھ کھلے میدان میں بکھیرتے تو کچھ دفن کر کے یادگار بھی بناتے ہیں۔ سکھ اس راکھ کو ستلج میں پھینکتے ہیں اور کچھ اس راکھ کو دفنا دیتے ہیں۔ جاپان، فلپائن اور تائیوان وغیرہ میں تو بے فیصد لاشوں کو جلایا جاتا اور ہڈیاں ورثاء کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ چین میں کنفیوشس لوگ مردوں کو دفناتے ہیں اور صرف بدھ احتراق کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی ستی کی رسم بد میں بیوہ بھی مردہ خاوند کے ساتھ زندہ جلائی جاتی ہے تاہم اب قانونی پابندیوں کے باعث یہ رسم معدوم ہوتی جا رہی اور شاید ۱۹۸۷ء کے بعد ایسا واقعہ سننے یا دیکھنے میں فی الحال نہیں آیا۔

روم اور یونان میں دفنانا اور جلانا دونوں عمل رائج رہے ہیں۔ عیسائیت نے زور پکڑا تو احتراق نعش ممنوع قرار پایا۔ جہاں آبادی میں بے تحاشا اضافہ، زندگی میں رہائش اور خوراک

www.urdugem.com

کے گمبھیر مسائل کا موجب بنا وہیں اسی کثیر آبادی نے مرنے کے بعد دفنانے کے لیے زمین کی عدم دستیابی کو بھی بہت بڑا مسئلہ بنا دیا ہے۔ اب مرنے کے واسطے بھی جگہ نہیں۔ اسی لیے پروٹسٹنٹ فرقے نے لاش کو جلانے (cremate) کی اجازت دے دی لیکن کیتھولک نے مزاحمت کی۔

دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے ہلاک شدگان کے لیے متعدد بھٹیاں (furnaces) بنائیں۔

۲۰۰۴ء کے سونامی میں تیس لاکھ اموات ہوئیں لہٰذا تعفن اور آلودگی کی وجہ سے کئی مقامات پر اجتماعی احتراقِ نعش کیا گیا۔ اب آسٹریلیا اور مغربی ممالک میں بھی جدید بھٹیاں بنائی جارہی ہیں۔ جبکہ یورپین ممالک اور امریکہ میں بے شمار جدید قسم کے (cremation centers) بنائے جارہے ہیں۔ یعنی اب صنعت کاری کے شعبے میں انسان کو تحلیل وفنا کرنے کے لیے جلانے والی فیکٹریوں کے وجود کا اضافہ بھی ہورہا ہے۔

پاکستان میں بھی کئی شمشان گھاٹ ہیں جہاں ہندو، ارتھی جلاتے ہیں، البتہ بیس فیصد ہندو میتوں کو دفناتے بھی ہیں۔ عرب ممالک خاص کر سعودیہ میں عارضی قبروں میں میت دفنائی جاتی ہے۔ کیمیکل کے باعث لاش تحلیل ہونے پر اس کی باقیات سمندر برد کردی جاتی ہیں۔

موجودہ صورتحال کے پیشِ نظر اسلام کے علاوہ تمام مذاہب میں کسی حد تک مُردہ جلانے کے عمل کو قبول کرنے کا رجحان نظر آرہا ہے۔ مختلف ممالک میں سینکڑوں جدید جلانے والے مراکز بن رہے ہیں۔ ان میں روایتی شمشان گھاٹ کی طرح دھواں اور آلودگی نہیں ہوتی۔ یہاں لکڑی کے بجائے گیس، تیل، پروپین اور کول گیس استعمال کی جاتی ہے۔ میت تابوت میں ڈال کر فرنس میں بند کر آٹھ سو سے گیارہ سو سینٹی گریڈ کے درجۂ حرارت پر جلایا جاتا ہے۔ گوشت اور عضلات راکھ ہوجاتے اور بچنے والی ہڈیوں کو گرائنڈر میں مزید پیس کر سفوف بنالیا جاتا ہے۔ ایک وقت میں ایک میت ہی کریمیٹ کی جاتی ہے۔ یہ عمل ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل ہوجاتا ہے اور راکھ ایک بوتل میں ڈال کر ورثاء کے حوالے کردی جاتی ہے۔ اس راکھ میں کیلشیم، فاسفورس، نمکیات، معدنیات اور سلفر کے عناصر ہوتے ہیں لہٰذا کچھ دہر ئیے اسے بطور کھاد بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ ایک مُردہ ختم ہوجانے کے بعد بھی انسان اس کے وجود سے کیسے کیسے فوائد اٹھاتا ہے۔

ہندو ازم میں شمشان کی بابت متعدد دلائل ہیں۔ اُن کا ماننا ہے چونکہ جسم تکبر اور انا کی علامت ہے، یہ روح کو مائل بہ گناہ کرتا ہے، یہ ظالم ہے اس لیے اس کا تعلق جلد از جلد روح سے توڑنا ضروری ہے تاکہ روح اپنے اصل تک جلد پہنچ کر امن پاسکے۔ ان کے مطابق زمین میں دفن کرنے سے روح اور مرنے والے کا روحانی ناتا دیر تک قائم رہتا ہے جس سے روح بے چین رہتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہندو ازم میں عقیدہ آواگون کے مطابق اس دنیا کا جسم اگلے جنم میں دوبارہ نہیں ملے گا بلکہ اعمال کے حساب سے مختلف ہوگا لہٰذا اسے محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جبکہ اسلام اور الہامی مذاہب میں یہ جسم دوبارہ ملنے کا عقیدہ ہے۔

کہنے والے تو یہ تک کہتے ہیں کہ Cremate کا طریق زمین کی آلودگی کے موجب فطرت کے قریب تر ہے اور زندہ انسانوں کے لیے زمین پہ بوجھ نہیں بنتا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ آبادی میں اضافہ اور شدید آلودگی پوری دنیا کو احتراقِ نعش یا شمشان پر مجبور کردے گی۔

الحمدللہ کہ مسلمانوں کو عزت وتکریم کے ساتھ دفنا دیا جاتا ہے بلکہ اس ضمن میں توہم اور بھی حساس واقع ہوئے ہیں، بقول شاعر

نہ آنا میری قبر پہ ہمراہِ رقیباں
مُردوں کو مسلمان جلایا نہیں کرتے

سالانہ خریداری فارم

نام ..... فون نمبر .....

پتا ..... ای میل .....

میں ماہ ..... 20 ..... ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کردیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کروں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم ..... روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کررہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے ..... روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر IBAN#-Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروادیے ہیں۔ یا

4۔ خریداری کے لیے ہمیں ای میل کریں subscription@urdudigest.pk ۔ یا

5۔ سالانہ خریداری کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 0333-4713631 ۔

تاریخ ..... دستخط .....

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ 325, G-III جوہر ٹاؤن لاہور، پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8, +92-42-35290707

ON TIME - EVERY TIME

We produce and provide Pakistan's best packaging solutions in corrugated and flexible packaging. Superior quality and efficient services is hallmark of our business philosophy.

www.roshanpackages.com.pk info@roshanpackages.com.pk
RoshanPackages.LTD roshan_packages Roshan Packages Limited 0308 8882368
HEAD OFFICE: 325 G-III, M.A JOHAR TOWN, LAHORE • PAKISTAN | PH: 92 42 35290734-8

www.urdugem.com